

علماءِ دیوبند کی علمی اور مطالعاتی زندگی

ترتیب

مولانا عبدالقیوم حقانی

مولانا سمیع الحق کا سوالنامہ
اور اکابر کے جوابات
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
شیخ الحدیث مولانا عبدالحق
مولانا سید محمد یوسف بنوری
مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم
مولانا شمس الحق افغانی
شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد فرید
مولانا ظفر احمد عثمانی
مولانا اطہر علی بنگلہ دیشی
قاضی زین العابدین میرٹھی
مولانا محمد ابراہیم جان مجددی
مولانا سمیع الحق مدظلہ
مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی
مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی
پروفیسر محمد اشرف پشاور
مولانا لطافت الرحمن
مولانا محمد اسحاق سندیلوی
مولانا عبدالقدوس ہاشمی
علامہ مولانا گوہر رحمٰن
ڈاکٹر محمد صغیر حسن
ڈاکٹر حمید اللہ پیرس
ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوھریرہ

خالق آباد ● ضلع نوشہرہ ● سرحد۔ پاکستان

علماء دیوبند

کی علمی اور مطالعاتی زندگی

جلد ا

ترتیب

مولانا عبدالقیوم حقانی

سرپرست اعلیٰ جامعہ ابوہریرہ ○ خالق آباد ○ نوشہرہ

جناب "مدیر الحق" مولانا سمیع الحق کے سوالنامہ کے جواب میں
مشائخ، مشاہیر علماء، ممتاز سکالرز، دانشوروں اور قومی رہنماؤں کے
علمی و مطالعاتی تاثرات اور مشاہدات پر مبنی وقیع مضامین کا مجموعہ،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
شیخ الحدیث مولانا عبدالحق
مولانا سید محمد یوسف بنوری
مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم
مولانا شمس الحق افغانی
شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد فرید
مولانا ظفر احمد عثمانی
مولانا اطہر علی بنگلہ دیشی
قاضی زین العابدین میرٹھی
مولانا محمد ابراہیم جان مجددی
مولانا سمیع الحق مدظلہ
مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی
مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی
پروفیسر محمد اشرف پشاور
مولانا لطافت الرحمن
مولانا محمد اسحاق سندیلوی
مولانا عبدالقدوس ہاشمی
علامہ مولانا مارتونگ
ڈاکٹر محمد صغیر حسن
ڈاکٹر حمید اللہ پیرس
ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ
سرحد پاکستان ...... فون :630237(0923) فیکس : 630094

نام کتاب -------- علمی اور مطالعاتی زندگی

مصنف -------- مولانا عبدالقیوم حقانی

کتابت -------- ابوعثمانی محمد لطیف کیلانی (حضرت کیلانوالہ گوجرانوالہ)

ضخامت -------- 356 صفحات

تعداد -------- 1100

قیمت --------

تاریخ طباعت بار اول ----- ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ/فروری ۱۹۹۹ء

تاریخ طباعت بارِ چہارم ----- ربیع الاوّل ۱۴۲۸/ اپریل ۲۰۰۷ء

ناشر -------- القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس' خالق آباد' نوشہرہ، سرحد، پاکستان

ملنے کے پتے

☆ صدیقی ٹرسٹ' صدیقی ہاؤس المنظر اپارٹمنٹس 458 گارڈن ایسٹ، نزد لسبیلہ چوک کراچی

☆ مولانا سید محمد حقانی ' مدرس جامعہ ابو ہریرہ، خالق آباد، ضلع نوشہرہ

☆ مکتبہ رشیدیہ' جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

☆ کتب خانہ رشیدیہ ' مدینہ کلاتھ مارکیٹ ' راجہ بازار ' راولپنڈی

☆ مکتبہ سید احمد شہید ' ۱۰ الکریم مارکیٹ ' اردو بازار ' لاہور

☆ مولانا خلیل الرحمٰن راشدی صاحب' جامعہ ابو ہریرہ' چنوں موم ضلع سیالکوٹ

اس کے علاوہ اکوڑہ خٹک اور پشاور کے ہر کتب خانہ میں یہ کتاب دستیاب ہے

آئینہ کتاب

پیش لفظ

—— از مرتب ——

الحمد لحضرۃ الجلالہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم الرسالہ

بدقسمتی سے یورپ کی طرح ہمارے ہاں بھی قوت و اخلاق، تخلیق و ایجاد، ذوقِ مطالعہ ذوقِ علم اور تحصیلِ علم و دین کا توازن بگڑتا جارہا ہے۔ جدید سائنسی انکشافات اور مغربی افکار کی یلغار کے بعد سے مادی قوت اور ظاہری علم بڑی سرعت سے ترقی کر رہے ہیں۔ جبکہ دین و اخلاق اور علم و مطالعہ میں تنزل و انحطاط واقع ہوتا چلا جارہا ہے۔ جب عام معاشرتی سطح اور غالب اکثریت پر نظر ڈالی جائے تو بغیر کسی تردد اور شک کے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ کہ مسلم سوسائٹی میں بھی اب اِن دونوں میں کوئی تناسب باقی نہیں رہا، اور ایک ایسی نسل پیدا ہوچکی ہے جس کے ترازو کا ایک پلڑا آسمان سے باتیں کرتا ہے۔ اور دوسرا تحت الثریٰ میں ہے۔ جو مادی اعتبار سے عروج و کمال کی جتنی بھی بلندیوں پر فائز ہو مگر اخلاق و اعمال، فکر و ذہنی ساخت، حرص و طمع، سنگ دلی و بے دردی، جہالت و حماقت اور بے دینی و بے علمی میں اسکی سطح چوپایوں اور درندوں کی سطح سے بلند نہیں۔ اسکی جدید فنی علوم اور صنعتی بلند پروازیوں اور مادی ترقیوں اور اخلاقی پستیوں میں کوئی تناسب نہیں ہے۔

آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کے اپنے ملک پر نظر ڈالیے یا معمر بزرگوں سے حالات سنیئے تو ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک علمی و دینی مراکز، مدارس، خانقاہوں کے اثرات، ذوقِ تلاوت، ذوقِ علم و تحقیق، ذوقِ مطالعہ اور علماء سے استفادہ کرنے والے اور علم کی روشنی پھیلانے والے چراغوں کی ایک قطار نظر آئے گی —— مگر اسبابِ عیش کی فراوانی اور تہذیبِ مغرب و آزادی از دین کی طغیانی سے رفتہ رفتہ

چراغِ سحر بجھتے چلے گئے۔ قلوب سے وہ طلب اور شوق ہی نکل گیا ہے جو سمرقند و بخارا سے طالبین کو پیادہ پا دلی لایا کرتا تھا ـــــــ اور بدقسمتی سے زندگیوں میں ذوقِ علم و مطالعہ اور ذوقِ خدا طلبی کا کوئی خانہ اور چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی باقی نہیں رہا، قلب و روح کی جگہ بھی معدہ اور شکم نے پُر کر دی۔ زندگی کی تمام بلند اور لطیف حقیقتیں، علم کی لذتیں اور مطالعہ کی زحمتیں اوجھل ہو گئیں۔ زمانہ کے ذوق اور رجحان کا حقیقی اندازہ روزمرہ کی زندگی، بے تکلف گفتگو، مجالس کے موضوعِ سخن اور لوگوں سے ملنے کے بعد ہوتا ہے۔ بقول اکبر مرحوم ؎

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے مل کے دیکھو

کیا چیز جی رہی ہے کیا چیز مر رہی ہے

داعیٔ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے کیا خوب تجزیہ کیا ہے کہ:

"مغربی تہذیب و اقتدار کے اس دور میں درحقیقت نہ علم کا حقیقی ذوق ہے نہ دین کا، نہ کوئی اور ذوقِ لطیف کام کر رہا ہے۔ بالشت بھر پیٹ نے زندگی کی ساری وسعت گھیر لی ہے۔ عالمِ خیال میں کتابیں تصنیف کرنے والے خوش فکر مصنفین جو چاہیں لکھیں عملی زندگی میں اس وقت صرف ایک قوتِ محرکہ اور ایک زندہ حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ پیٹ ہے یا جیب۔"

حالانکہ ہمارے اسلاف اور عالمِ اسلام کے علماء اور دانشوروں نے قدیم دنیا پر علمی سیادت کا سکہ جما دیا تھا جو دنیا کی عقلیت، طرزِ فکر، طرزِ تحریر، طریقِ استنباط و اخذِ نتائج اور ثقافت (کلچر) کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا۔ صدیوں متمدن دنیا علماءِ اسلام کی عقل سے سوچتی رہی اور ان کے قلم سے لکھتی رہی اور ان کی زبان میں تالیف و تصنیف کرتی رہی۔

چنانچہ ایران، ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کے مصنفین اور اہلِ علم اگر کوئی اہم کتاب لکھنا چاہتے تھے تو عربی ہی میں لکھتے تھے۔ یہ علمی تحریک جو عہدِ عباسی کے

آغاز میں شروع ہوئی تھی، اپنی قوت اور تازگی کی وجہ سے پوری دنیا پہ آندھی اور پانی کیطرح چھاگئی اور تمام قدیم علمی نظام اس کے سامنے ٹھٹھر کر رہ گئے۔

مگر دورِ جدید کے مسلمانوں نے اپنے علمی و دینی اور روشن ماضی سے رشتہ کاٹ کر مغربی تعلیمی نظام کو اسکی ہزار خامیوں، واضح کمزوریوں اور نمایاں فرسودگی کے باوجود قبول کرلیا اور وہی نظام آج عالمِ اسلامی کے گوشہ گوشہ میں رائج اور حاوی ہے۔ جس کا طریقۂ تصنیف اور طرزِ فکر ہی ناقص اور پُر از اغلاط ہے۔ کیونکہ انہوں نے انسانی زندگی کو ایک محدود زاویہ سے دیکھا ہے۔ اور اس غلط اور محدود زاویۂ نگاہ کے وہ غلط نتائج کا شکار ہوتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے جب مقدمات ہی درست نہ ہوں گے تو نتیجہ کس طرح صحیح ہوسکتا ہے۔

اس نظام کا ایک ثمرہ یہ نکلا کہ تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ میں شک اور نفاق، بے صبری، زندگی سے عشق، بوالہوسی، علمی بد ذوقی، جہالت اور نقد کی ادھار پہ ترجیح کی ذہنیت پیدا ہوگئی۔ اور اس طرح کے دوسرے عیوب پیدا ہوگئے۔ جو مروج مغربی نظامِ تعلیم اور مغربی تہذیب کا لازمہ ہیں۔

اگر اہلِ اسلام یہ چاہتے ہیں کہ نئے سرے سے وہ اپنی زندگی شروع کریں۔ جو غیروں کے افکار و نظریات، علمی اور فکری اور سیاسی غلامی سے آزاد ہوں۔ اگر وہ پھر سے عالمگیر علمی اور سیاسی قیادت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں تعلیمی خود مختاری، نصابی آزادی، فکری اور سیاسی آزادی اور تحقیق و تصنیف ہی نہیں علمی لیڈرشپ بھی بہت ضروری ہے —— یہ کوئی آسان کام نہیں یہ مسئلہ بہت گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔ اس کیلئے ضرورت ہے۔ کہ وسیع پیمانے پہ تصنیف و تالیف اور علوم کی تدوینِ جدید کا کام شروع کیا جائے۔ اس عظیم کام کے سربراہ کار عصری علوم سے بھی اتنی واقفیت اور گہری بصیرت رکھتے ہوں۔ جو تحقیق و تنقید کے درجہ تک پہنچتی ہو اور اس کے ساتھ اسلام کے اصلی سرچشموں سے پورے طور پہ سیراب اور اسلامی روح سے ان کے قلب و نظر معمور ہوں۔

اس مہم اور عظیم مشن کی تکمیل کسی جماعت یا انجمن کے بس کا کام نہیں۔ یہ اسلامی حکومتوں کا کام ہے۔ اس مقصد کیلئے اس کو منظم جماعتیں اور مکمل ادارے قائم کرنے ہوں گے۔ اور ایک

ایسا نصاب تعلیم تیار کرنا ہوگا۔ جو ایک طرف کتاب وسنت کے محکمات اور دین کے ناقابل تبدیل حقائق پر مشتمل ہو اور دوسری طرف مفید عصری علوم اور تجزیہ وتحلیل پر حاوی ہو وہ مسلمان نوجوانوں کیلئے علوم عصریہ کی از سرنو تدوین کریں۔ جو اسلام کے اصولوں اور اسلام کی روح کی بنیاد پر ہوں۔ اس میں ہر ایسی چیز ہو جو نوخیز طبقہ کیلئے ضروری ہو جس سے وہ اپنی زندگی کی تنظیم اور اپنی سالمیت کا تحفظ کرسکے وہ مغرب سے مستغنی ہو اور مادی و دماغی جنگ میں اس کے مقابلہ میں آسکے۔

اس علمی و دینی، اخلاقی و روحانی، تہذیبی و صنعتی، سیاسی اور فوجی اور تعلیمی آزادی کے ساتھ عالم اسلامی عروج حاصل کرسکتا ہے۔ پوری دنیا کی علمی اور سیاسی قیادت کرکے دنیا کو اس تباہی اور ہلاکت سے نجات دلاسکتا ہے۔ جو اس کے سر پہ منڈلا رہی ہے ـــــ یہ معاملہ اور اتنا عظیم مشن اور پوری دنیا کی علمی، فکری اور سیاسی قیادت ہنسی کھیل نہیں، نہایت سنجیدہ معاملہ ہے جو منظم جدوجہد، زبردست فکری تبدیلی، مکمل ذہنی تربیت عظیم الشان قربانی اور سخت جانفشانی کی محتاج ہے۔

اس عظیم سعادت اور کامرانی کی منزل تک پہنچنے کیلئے پہلے زینہ کے طور پر یہ ضروری ہے کہ مسلمان نوجوان، علماء سیاسی زعماء، جدید تعلیم یافتہ سکالر، دانشور، کالجز اور دینی مدارس کے طلبہ کو اکابر علماء، محدثین، علمی و دینی زعماء، تجربہ کار عمر رسیدہ مدرسین اور اساتذہ علم سے بھرپور استفادہ کے مواقع فراہم کر دئے جائیں۔ وہ اُن کے عمر بھر کے تجربات، ان کی علمی و مطالعاتی زندگی کا نچوڑ، بدلتے ہوئے حالات میں ان کے مشاہدات، مختلف موضوعات پہ مفید کتابوں کی نشاندہی، استفادہ اور ذوقِ مطالعہ کی ترغیب اور عملی زندگی میں بہتر سے بہتر اور مفید کتابوں کے انتخاب، نصاب تعلیم، طریق تدریس، جدید و قدیم علوم کے باہمی امتزاج اور اس نوع کے ہمہ پہلوؤں سے اپنی اپنی استعداد اور ظرف کے مطابق مستفید ہوں ـــ

چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر آج سے کوئی چودہ سال قبل ماہنامہ الحق کے مدیر شہیر دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کے جانشین حضرت العلامہ

مولانا سمیع الحق مدظلہ نے "میری علمی اور مطالعاتی زندگی" کے عنوان سے ایک سوالنامہ مرتب کیا۔ (جو کتاب ہذا کے صفحہ ۱۱ پر درج کر دیا گیا ہے۔) جسے ملک و بیرون ملک کے اکابر علماء مشائخ، قومی و ملی زعماء، دانشوروں اور اکابر اساتذہ علم کی خدمت میں بھیجا گیا، جنہوں نے اپنی بھرپور علمی اور مطالعاتی زندگی کے تجربات، مشاہدات اور اس سلسلہ کے مفید آراء پر مشتمل مختصر اور مفصل جوابات کی صورت میں وقیع مضامین تحریر فرمائے جو ماہنامہ الحق میں شائع ہوتے رہے جسے علمی و دینی اور مطالعاتی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ دو سال قبل وہی سوالنامہ احقر نے بعض دیگر حضرات کی خدمت میں بھیجا تو اس سلسلۂ زریں کے کچھ مزید مضامین بھی موصول ہو گئے۔

علم و مطالعہ، بحث و تحقیق، تصنیف و تالیف اور عملی زندگی میں علمی و دینی انقلاب کی انگیخت اور موجودہ حالات میں اسکی شدید ضرورت کے پیش نظر ان تمام مضامین کو "میری علمی اور مطالعاتی زندگی" کے عنوان سے مستقل کتابی صورت میں ترتیب دیکر اہل اسلام کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جو اپنے زمانے کی اہم علمی اور دینی شخصیتوں کی عظیم کاوش کا ایک جامع مرقع ہے۔ جو ایک ذمہ دار مسلمان کی علمی اور مطالعاتی زندگی کے صحیح خدوخال نمایاں کرتا ہے۔ اور انسان کو پھر اس سرچشمۂ ہدایت پر لا کھڑا کرتا ہے جس ہدایت کا مدعا ہی یہ تھا کہ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کیطرف اور جاہلیت سے نجات دلا کر علم و معرفت کی طرف لایا جائے ــــ کتاب کے تمام مضامین میں ایسے تمام محرکات اور مختلف قدروں کا لحاظ رکھا گیا ہے جس سے علم و مطالعہ کے صحیح ماخذ اور ذوق علم کی انگیخت ہوتی ہے۔

اور یہی عصر حاضر کی اہم ترین ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔ ان میں ماضی پر اعتماد سلف صالحین سے ارتباط، کتاب و سنت سے تعلق خاطر، اساتذۂ علم سے اخذ و استفادہ، صحیح اور مفید کتابوں کا مطالعہ و انتخاب اور مستقبل کے بارہ میں امید اور حوصلہ پیدا ہو۔ اس دین پر اور دین کے پیغام و تعلیمات پر ان کا ایمان و یقین تازہ اور زندہ ہو جائے جس کا نام تو وہ لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقت سے نا آشنا ہیں۔

یہ ایک حقیر سی کوشش ہے جو خالص فیاضِ ازل ہی کی توفیق ارزانی سے منصۂ شہود پر آرہی ہے۔ تاہم یقین ہے کہ کتاب وسنت، علم ومطالعہ، دینِ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اکابر علماء امت سے نسبت کے پیش نظر قارئین اس کے مطالعہ سے اپنے ضمیر میں نئے شعور اور دلوں میں ذوق علم کی خلش محسوس کریں گے جبکہ آنے والے کسی بھی صالح انقلاب، منظم علمی تحریک، عظیم تعلیمی انقلاب اور نئی علمی تعمیر کیلئے ضمیر کی بیداری، شعور کی پختگی، ذہنی ساخت کی تشکیل اور فکری تیاری کی ضرورت ہے۔

اس کیلئے مطالعہ واستفادۂ کتب کی بامقصد تربیت اور ایسی کتابوں کے انتخاب اور مباحث کی ضرورت ہے۔ جو ایک طرف علمی اطمینان اور قلبی انشراح پیدا کریں، دوسری طرف پڑھنے والوں میں وحی اور منصب نبوت پر اعتماد قرآن وسنت سے مضبوط اور مستحکم رشتہ، ارتباط حوصلہ ویقین اور خود اعتمادی کے ساتھ جوش عمل پیدا کردیں۔

"میری علمی اور مطالعاتی زندگی" اس سلسلہ میں اولین زینہ اور بنیادی بھینہ کا کام دے گی ان شاء اللہ۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

عبدالقیوم حقانی

مدیر ادارۃ العلم والتحقیق، جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد، زڑہ میانہ شاپ
ضلع نوشہرہ، صوبہ سرحد، پاکستان

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۱۱ھ بمطابق ۲ نومبر ۱۹۹۰ء

سوالنامہ

از جناب مولانا سمیع الحق مدظلہ۔ مدیر ماہنامہ "الحق"

(۱) آپ کو علمی زندگی میں کن کتابوں اور مصنفین نے متاثر کیا اور آپ کی محسن کتابوں نے آپ پر کیا نقوش چھوڑے؟

(۲) ایسی کتابوں اور مصنفین کی خصوصیت۔

(۳) کن مجلات اور جرائد سے آپ کو شغف رہا، موجودہ صحافت میں کون سے جرائد آپ کے معیار پر پورے اترتے ہیں؟

(۴) آپ نے تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ اور درسگاہوں سے خاص اثرات لیے؟ ایسے اساتذہ اور درسگاہوں کے امتیازی اوصاف جن سے طلباء کی تعمیر و تربیت میں مدد ملی؟

(۵) اس وقت عالم اسلام کو جن جدید مسائل اور حوادث و نوازل کا سامنا ہے اس کے لیے قدیم یا معاصر اہلِ علم میں سے کن حضرات کی تصانیف کارآمد اور مفید ثابت ہوسکتی ہیں؟

(۶) علمی، فکری اور دینی محاذوں پر کئی فتنے تحریفی، الحادی اور تجدّدی رنگ میں (مثلاً انکارِ حدیث، عقلیت، اباحیت، تجدّد، مغربیت، قادیانیت اور ماڈرنزم) مصروف ہیں۔ ان کی سنجیدہ علمی احتساب میں کون سی کتابیں حق کے متلاشی نوجوان ذہن کی راہنمائی کرسکتی ہیں؟

(۷) موجودہ سائنسی اور معاشی مسائل میں کون سی کتابیں اسلام کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں؟

(۸) مدارسِ عربیہ کے موجودہ نصاب اور نظام میں وہ کون سی تبدیلیاں ہیں جو اسے مؤثر اور مفید تر بنا سکتی ہیں؟

اُمید ہے اپنے مفید خیالات سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

علم اور مُطالعہ

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری، قصّۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیتِ غُنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم
وہ علم کم بصری، جس میں ہمکنار نہیں
تجلّیاتِ کلیم و مُشاہداتِ حکیم

(اقبال رح)

محدث کبیر شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ

بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

ذیل کا مضمون محدث کبیر استاذی واستاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق نوراللہ مرقدہ کے علمی افادات، حقائق السنن، دعوات حق اور زیادہ تر صحبتے با اہل حق سے حضرتؒ ہی کے لہجہ اور اُن ہی کی زبان میں اخذ کرکے مرتب کیا گیا ہے۔ افادیت اور نافعیت تو ہے ہی مسلّم، دلچسپ اتنا کہ خود مرتب، حضرتؒ سے براہ راست سُننے، لکھنے پھر کتابی صورت میں طبع کرنے اور اب کے بار اخذ وانتخاب کے بعد بھی جب نظر ثانی کرنے لگا تو ساری باتیں اتنی ہی پیاری اور میٹھی محسوس ہوئیں گویا ایک نئی اور دلچسپ تحریر ہے جس کی عذوبت وحلاوت اور لطف اندوزی ایک قند مکرر ہے، جتنی بار پڑھی جائے حظِ وافر اور لطفِ جدید حاصل ہو۔

(عبدالقیوم حقانی)

سلسلۂ سند

میں نے جامع ترمذی اور بخاری شریف شیخنا شیخ العرب والعجم، شیخ المشائخ، شیخ الاسلام والمسلمین المجاہد فی سبیل اللہ امیر الہند حافظ الحدیث سیدنا و مولانا و بالفضل اولٰنا حضرت مولانا سید حسین احمد المہاجر المدنی صدر المدرسین بدار العلوم دیوبند سے پڑھی ہیں۔

الشیخ مولانا حسین احمد مدنیؒ

حضرت شیخ مدنیؒ حدیث کے امام تھے، حافظ الحدیث تھے، بہت بڑے مردِ مجاہد اور صاحب الکمالات تھے۔ آپ کا نسبی تعلق سادات سے ہے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ جو سب سے پہلے ہندوستان پہنچے ان کا نام شاہ نورالحق ہے۔ ان سے حضرت شیخ مدنیؒ تک خاندان کی سترہ پشتیں گذری ہیں۔ مغلیہ خاندان کے شاہانِ دہلی نے آپ کے خاندان کے اعلیٰ مورثوں کو چوبیس گاؤں بطور جاگیر دیئے تھے۔ وہ دور اہلِ علم کی قدردانی کا دور تھا، یہ واقعہ تو مشہور ہے اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ کے سوانح نگاروں نے بھی لکھا ہے کہ علامہ سیالکوٹیؒ کو ان کی ایک تصنیف کے بدلے سونے کے ساتھ تولا گیا تھا۔

سنہ ۱۳۱۶ھ میں حضرت مدنیؒ کے والد ماجدؒ نے بمع اہل وعیال حجاز ہجرت کی تو آپ کو بھی ساتھ لے گئے۔ وہاں کے ایام آپ نے اور آپ کے خاندان نے حد درجہ تنگی اور عسرت میں گذارے مگر تحصیلِ علم اور اشاعتِ دین میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ایک طویل عرصہ تک مدینہ منورہ میں قیام فرمایا، مسجدِ نبوی میں درسِ حدیث بھی جاری رکھا جس میں عرب وعجم کے سینکڑوں طالبانِ حدیث فیضیاب ہوتے رہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے ارشد واخص تلامذہ سے تھے، جب حضرت شیخ الہندؒ گرفتار کر لیے گئے تو اس وقت شیخ مدنیؒ نے حکومت سے کہا کہ جس دفعہ کے تحت تم نے میرے استاذ کو گرفتار کیا ہے میں بھی اسی دفعہ کا مجرم ہوں۔ تو اس طرح اپنے

آپ کو اپنے شیخؒ کے ساتھ مالٹا کی جیل میں شریک کرلیا کہ شیخؒ کی خدمت کا موقع ملتا رہے۔

حضرت شیخ مدنیؒ بہت بڑے ولی اللہ اور صاحب الکرامات تھے۔ آپ کی کرامت کی ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ اس وقت ہند و پاک میں جس قدر بھی مدارس آپ کو نظر آتے ہیں تقریباً سب میں حضرت شیخ مدنیؒ کے بلاواسطہ یا بالواسطہ تلامذہ خدمتِ دین میں مشغول ہیں۔

حافظہ ایسا تھا کہ بخاری آپ کو سند اور متن کے ساتھ یاد تھی مگر آپ نے کبھی بھی اس کو ظاہر نہ فرمایا بلکہ اس کی ہمیشہ اخفا کرتے تھے۔ جب بخاری پڑھانے تو اپنے سامنے قسطلانی کا نسخہ رکھتے تھے۔ بہت تھوڑے عرصہ میں اپنے شیخ کی دعا سے قرآن مجید یاد کرلیا تھا اور اسی ماہِ رمضان جس میں قرآن یاد کیا اپنے استاد کو تراویح میں سنا بھی دیا۔ جب کبھی غصہ آجاتا اور بہت کم ایسا ہوتا تو زیادہ سے زیادہ خلق الانسان من عجل کہہ کر اس کا اظہار کرتے تھے۔

شیخ مدنیؒ کا فیضانِ حدیث

یوں تو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگردوں میں بڑے بڑے جبال العلم جامع کمالات تھے اور دین کے ستون قرار پائے اور ان سے دین و علم کے چشمے جاری ہوئے مگر حدیث کا جو فیض اور افادہ ہمارے استاذ اور مرشد حضرت شیخ مدنیؒ کے ذریعہ ہوا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آج برصغیر اور بیرونِ ممالک میں ہزاروں تلامذہ کے ذریعہ ان کا فیض جاری ہے۔ حافظہ اور ذہانت میں ان جیسے اور حضرات بھی تھے مگر اپنے شیخؒ کی محبت اور جاں نثاری جو ان میں تھی اس کی مثال نہ تھی، عمر بھر وفا شعار غلام اور عاشق بنے رہے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور اس راہ میں آپ نے اپنی اولاد، بیوی اور والدین کی جدائی تک برداشت کی، ان کی وفات کی اطلاعیں پہنچیں

مگر مالٹا کی جیل میں اپنے اُستاد کی رفاقت ترک نہ کی۔

ادب ومحبت اور نیاز مندی کا کوئی نمونہ نہ تھا جسے قائم نہ فرمایا اور اسی تعلقِ خاص اور محبت وخدمت کے ثمرہ میں اپنے شیخ کے علوم اور فیض کا مورد بنے، تصوف وارشاد کا جو فیض جاری ہُوا وہ اس کے علاوہ ہے۔

جہاد اور قربانیوں کی شکل میں مختلف حیثیتوں سے جو فوائد اور برکات اہلِ اسلام کو پہنچے وہ اس سے الگ ہیں۔ یہ سب ادب اور محبت اور عاشق بننے کے نتائج ہیں۔ اگر اساتذہ وشیوخ سے محض رسمی تعلق ہو کہ درسگاہوں میں انہیں اجیر سمجھ کر رہے، کتاب ختم کی تو چلے گئے، تو اس علم کی کوئی برکت نہ ہوگی۔ افسوس کہ آج یہ چیزیں ختم ہوتی جا رہی ہیں، اساتذہ اور شیوخ سے رابطہ نہیں رہا، اتصال سند کی فکر نہیں رہتی، حالانکہ انبیاء، اولیاء اور شیوخ طریقت سے اپنے متبعین، شاگرد اور مُریدین کو بھی جو فیض حاصل ہُوا وہ عاشق، جان نثار اور فدائی بن کر حاصل ہُوا۔

تو میں حضرت شیخ مدنیؒ کا ذکر کر رہا تھا۔ علم اور اس کی اشاعت اور تعلیم وتدریس سے عشق تھا، دن کو سفر رات کو سبق۔ جس روز بخاری کا امتحان ہونا ہے اُس روز پرچہ سے قبل بڑے اطمینان سے بخاری کا درس پڑھا رہے ہیں۔ تواضع اور انکساری فطرت اور طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ہم نے بارہا دیکھا کہ غریب اور دیہاتی گنوار وں یہاں تک کہ غیر مذہب کے ہنود وغیرہ کے خود ہاتھ دُھلا رہے ہیں، مہمانوں کی بےخبری میں اُن کے پاؤں دبا رہے ہیں۔ سفر میں راہ چلتے ساتھیوں کے لیے گاڑی میں پاخانے تک صاف کیے۔ اتنی شانِ تواضع وانکساری، دوسری طرف باطل کے خلاف ایک ننگی تلوار بھی، ساری زندگی انگریزی سامراج کے ساتھ ٹکرائے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ

حضرت شیخ مدنیؒ نے جامع ترمذی اور بخاری حضرت شیخ الہندؒ سے

بڑھی۔ آپ دیوبند کے باشندہ اور عثمانی خاندان سے تھے۔ آپ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ جس طرح دینی اعتبار سے ایک عالم فاضل اور ادیب تھے اسی طرح دُنیوی اعتبار سے بھی ذی وجاہت، صاحب اقبال اور صاحب اخلاق تھے آپ کا خاندان ایک خوشحال گھرانہ تھا، مالی حالت اچھی تھی، بچپن سے بڑے ذہین اور ذکی واقع ہوئے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم ہونے کا شرف آپ کو حاصل ہے۔ پہلا طالب علم بھی محمودؒ اور پہلا اُستاد بھی محمودؒ۔ آپ نے صحاح ستہ کی کتب کے علاوہ بھی بعض دیگر اہم کتابیں قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے پڑھیں، سنہ ۱۲۹۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے تو دارالعلوم دیوبند ہی میں مدرس ہو گئے، آٹھ سال بعد صدر مدرس ہوئے۔ سنہ ۱۳۳۳ھ میں حجاز مبارک کا سفر اختیار کیا اور اس سفر کی غرض آزادیٔ ہند کے لیے ایک وسیع منصوبہ بندی کرانی تھی، انگریزی سامراج نے اس منصوبہ کو ناکام کرنے کے لیے آپ کو گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ پانچ سال بعد رہا ہوئے اور ایک عرصہ تک علیل رہ کر سفر آخرت اختیار فرمایا ـــــــ آپ کے ارشد تلامذہ میں حضرت شیخ مدنیؒ کے علاوہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ وغیرہ جیسے اکابر علم وفضل ہیں ـــ ویسے تو حضرت شیخ الہندؒ کی ہر کتاب علوم و معارف کا بیش بہا گنجینہ ہے مگر ان سب میں زیادہ مقبولیت آپ کے ترجمہ وتفسیر کو حاصل ہوئی ہے حکومتِ کابل نے بھی اس کو فارسی میں ترجمہ کر کے شائع کر دیا ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

جیساکہ میں نے پہلے عرض کیا کہ حضرۃ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے اکثر موقوف علیہ کتابیں اور کتبِ صحاح ستہ قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

سے پڑھیں، مولانا محمد قاسم صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں، صرف دیوبند کے بانی ہی نہیں بلکہ آج ہند و پاک میں جہاں کہیں بھی اسلامی مدارس قائم ہیں، علوم دینیہ کا سلسلہ رواں ہے، علماء اور زمرہ اہلِ حق جو نظر آتا ہے یہ تمام فیض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ہے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے امام رازیؒ اور امام غزالیؒ تھے۔ جہاں آپؒ نے تدریس و تعلیم، تصنیف و تالیف میں ایک مقام پیدا کیا اور مجتہدانہ کمالات سے نوازے گئے وہاں تبلیغ و جہاد، عیسائیوں کے خلاف محاذ اور پادریوں سے مناظرہ کے میدان میں بھی مجاہدانہ وار آگے رہے۔ آپ کا تاریخی نام خورشید حسن تھا۔ حد درجہ متواضع، خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ کھدر کے کپڑے پہنتے تھے، کبھی ایسا لباس نہیں پہنا جس سے مولویانہ ٹھاٹھ کا اظہار مقصود ہو۔ اس قدر عظیم مصنّف، محقق اور علامہ ہونے کے باوجود اپنی عام نجی محفل میں گفتگو سادہ، بے تکلف اور عامیانہ ہوتی تھی، بلا وجہ اور بے تکلف کبھی اپنی علمیت کا اظہار نہیں کرتے تھے لیکن جب درسگاہ میں ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وقت کا غزالی یا رازی بول رہا ہے، طبیعت میں ضدّ اور بغض و عداوت کا نشان تک نہ تھا۔

مشہور محدّث مولانا احمد علی سہارنپوریؒ محشّیِ بخاری سے کسی مسئلہ میں اختلاف تھا تو ان کے ہاں جا کر درسِ بخاری میں داخلہ لے لیا اور باقاعدہ تلمذ اختیار کر لیا جب مختلف فیہ مسائل میں مولانا احمد علی بحث کرتے تو حضرت نانوتویؒ اثبات میں دلائل شروع کر دیتے، اوّلاً حضرت سہارنپوریؒ جواب دینے کی کوشش کرتے رہتے لیکن جب سمجھ جاتے کہ بات وہی ہے جو حضرت نانوتویؒ کہتے ہیں تو بغیر کسی تصنّع کے فرماتے کہ مولانا! بات وہی ہے جو آپ کہہ رہے ہیں، میں نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا ہے۔

مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کا بخاری پر بڑا بہترین اور جامع حاشیہ ہے

آخری پارے ابھی باقی تھے کہ حضرت سہارنپوریؒ انتقال فرما گئے۔ ان کی وفات کے بعد اس کام کو مولانا محمد قاسمؒ نے مکمل فرمایا مگر اپنا نام ظاہر نہ ہونے دیا، آج تک استاد کا نام چلا آرہا ہے۔

مولانا شاہ عبدالغنی مجددیؒ

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جامع ترمذی اور بخاری حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددی مہاجر مدنیؒ سے پڑھیں۔ یہ شاہ عبدالغنی شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے نہیں بلکہ یہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نواسے اور مہاجر مدنی ہیں، یہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ شاہ ابوسعیدؒ کے فرزند ہیں، شاہ ابوسعیدؒ شاہ شفیع القدرؒ کے صاحبزادے ہیں اور شاہ شفیع القدرؒ شاہ محمد معصومؒ کے صاحبزادے ہیں اور شاہ محمد معصومؒ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے ہیں۔

آپ سے بکثرت علماء نے استفادہ کیا، ۱۲۷۳ھ میں جب دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو آپ نے ارضِ مقدس حجاز کی طرف ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ میں قیام فرما کر عبادت اور درس وافادہ میں مشغول ہوگئے۔ تو آپ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ذریت سے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام سے قبل جب حضرت مجدد الف ثانیؒ حکومت کے مجرم کے طور پر پا بجولاں دیوبند کی سرزمین سے گذر رہے تھے تو فرمایا مجھے اس سرزمین سے علومِ نبوت کی خوشبو آتی ہے۔ اور سید احمد شہید قدس سرہ سے بھی اپنے سفر جہاد کے دوران دیوبند کے قیام کے دوران ایسے برکات و انوار کے مشاہدہ کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنے جہاد کا آغاز اسی بستی اکوڑہ خٹک کی سرزمین سے کیا، جب انہوں نے سکھوں سے جنگ لڑی تھی تو اکوڑہ کے مغربی جانب پر پڑاؤ ڈالا تھا۔ اگرچہ تحقیقی طور پر ثابت نہیں لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً یہی وہ مقام ہے جہاں آج دارالعلوم حقانیہ قائم ہے اور کیا عجب کہ حضرات سیدین شہیدین اور ان کے رفقاء کے

انفاس مبارکہ اور دُعاؤں کا ظہور اس ادارہ کی شکل میں ہوا ہو۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق رح

شاہ عبدالغنی صاحب مجددیؒ نے علم حدیث حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب رح سے حاصل کیا، آپ شاہ عبدالعزیز رح کے نواسے ہیں۔ ہندوستان میں علوم الحدیث کے تمام سلسلے آپ سے وابستہ ہیں آپکی تربیت شاہ عبدالعزیز رح نے فرمائی کتب فقہ وحدیث شاہ عبدالقادر رح سے پڑھیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب رح سے بھی اجازت حدیث حاصل فرماکر سلسلۂ سند ان سے متصل کیا ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رح

سراج الہند حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رح بہت بڑے محدّث اور فقیہ تھے۔

آپ ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے، علوم کی تحصیل اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ دہلوی رح سے کی، سولہ سال کی عمر میں والد ماجد کا انتقال ہوگیا تو آپ نے شیخ نوراللہ اور شیخ محمد امین سے علوم کی تکمیل کی، اللہ تعالیٰ نے ان کو عجیب علمی تبحّر اور ملکہ عطا فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ فن تیراندازی اور شہسواری میں بھی ماہر تھے۔ آپ نے اہل تشیع کے رد اور عیسائیت کے خلاف زبردست کام کیا، "تحفہ اثناعشریہ" آپ کی ایسی تصنیف ہے جس کا آج تک کوئی جواب نہ لکھ سکا۔ توشاہ عبدالعزیز رح کو سماعت اور قرأت حدیث کی اجازت اپنے والد شاہ ولی اللہ دہلوی رح سے حاصل ہوئی۔

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رح

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح عظیم محدث اور بہت بڑے فقیہ تھے، بچپن سے خدا تعالیٰ نے اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ دس سال کی عمر میں شرح جامی پڑھی اور کافیہ کی شرح لکھنی شروع کی، سترہ ۱۷ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی اور چاروں سلسلوں میں مجاز ہوئے، علوم وفنون کی تکمیل میں لگے رہے، پچیس سال کی عمر میں مکمل

فراغت حاصل کی، اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک درس و تدریس اور افادہ کا سلسلہ جاری رکھا، ۱۱۴۳ھ میں حرمین شریفین تشریف لے گئے اور تقریباً دو سال تک وہاں قیام فرمایا، مکہ معظمہ کے اکابر علماء و مشائخ سے استفادہ کیا اور شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم مدنی سے باقاعدہ حدیث پڑھی۔ ان ہی کا مقولہ ہے، فرماتے ہیں اخذ منی الفاظ الحدیث واخذت منہ المعانی، کہ شاہ ولی اللہ نے مجھ سے الفاظِ حدیث حاصل کیے اور میں نے ان سے حدیث کے معانی سیکھے۔

ابتداء میں شاہ صاحبؒ شافعیت کی طرف مائل تھے لیکن شیخ ابو طاہر المدنیؒ کی صحبت اور اعتدال سے متاثر ہوئے اور اس لیے ان کی صحبت کے بعد کی زندگی میں حنفیت کی طرف میلان رہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے شیخ ابو طاہر مدنیؒ کے سامنے احناف کے مسائل پر اشکالات کیے تو شیخ ابو طاہرؒ نے اس کے تسلی بخش جوابات دیئے اور حنفیت کا دفاع کیا اور شاہ صاحبؒ سے فرمایا کہ آپ کے لیے حنفیت زیادہ موزوں ہے اور ہندوستان میں اکثریت احناف کی ہے۔ شیخ کی اس وصیت کو آپ نے پلّے باندھا اور تمام زندگی اسی پر کاربند رہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ "فیوض الحرمین" میں لکھتے ہیں کہ میں نے روضہ اطہر کے پاس مراقبہ کیا تو معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان چاروں مذاہب کی طرف یکساں ہے البتہ زیادہ توجہ اور نظر اصولِ مذاہب پر ہے اور وہ زیادہ تر حنفی مذہب میں پائے جاتے ہیں بلکہ "فیوض الحرمین" میں ایک تصریح کردی ہے کہ اوفق الطریق بالسنۃ الصحیحۃ، طریقۂ انیقہ مذہب حنفی ہی ہے۔

مذہب حنفیت کی جامعیت و ہمہ گیری

امام شعرانیؒ فرماتے ہیں کہ ان چاروں مذاہب کی حقیقت اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک مثال میں دکھلا دی ہے کہ ایک تالاب ہے جس سے چار نہریں جاری

ہیں، پانی ایک ہے لیکن اس کے راستے اور طرف بدلا بدلا ہے، البتہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی جو نہر ہے وہ زیادہ شفاف اور عریض وطویل اور عمیق ہے، فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا کہ حق تو چاروں مذاہب ہیں مگر ترجیح حنفیت کو حاصل ہے۔ ہر مذہب پر چلنے والے کو اس کی نیت کے مطابق اجر وثواب ملے گا، جیسے اشتباہ قبلہ کی صورت میں چند آدمی تحری کر کے نماز پڑھتے ہیں، ایک کا قبلہ رخ ہونا صحیح تھا اور باقیوں کا فی الواقعہ غلط، لیکن تحری اور اجتہادی غلطی پر وہ ماخوذ نہ ہوں گے بلکہ وہ بھی اسی طرح اجر وثواب کے مستحق ہوں گے جس طرح وہ شخص مستحق ہے جس نے رو بقبلہ ہو کر نماز پڑھی ہے۔

تو شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے قبل ہندوستان میں مشکوٰۃ شریف کا کتاب العلم پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ اس سے آگے بڑھنا گمراہی میں گرتا ہے۔ مگر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی برکت سے آج تمام ہند و پاک میں علوم الحدیث کے چشمے پھوٹ پڑے ہیں، جب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو اجر وثواب ملتا رہے گا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد آپ کے صاحبزادوں اور خاندان نے علوم دینیہ کا تحفظ کیا، تعلیم وتدریس، اشاعت وتبلیغ، مجاہدہ وجہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہر نوع اور ہر محاذ پر زبردست مورچے قائم فرمائے اور الحمدللہ کہ ولی اللٰہی فکر اور ولی اللٰہی جذبہ اور ولی اللٰہی علوم کو علمائے دیوبند نے حاصل کیا اور اس کے امین ومحافظ بن گئے اور تقریباً ایک صدی سے پورے عالم کو دارالعلوم دیوبند سیراب کر رہا ہے۔

سلسلہ سند میں اپنے اسلاف واکابر بالخصوص علماء دیوبند کے مختصر حالات اجمالاً ذکر کر دیئے ہیں، آگے کا سلسلہ سند سارا کتاب میں موجود ہے۔ تطویل کے باعث اپنے سلسلہ سند کے اسلاف واکابر بالخصوص علماء دیوبند کے مختصر حالات اجمالاً میں نے ذکر کر دیئے ہیں، مزید اسماء الرجال کی کتابیں دیکھی جائیں تاکہ سلسلہ سند کے

تمام اکابرین کے حالات سے آگاہی حاصل ہو۔

بہر تقدیر سلسلہ سند کے تین حصے ہیں۔ اہلِ ہند کا سلسلہ سند حضرت شاہ ولی اللہ محدثِ دہلویؒ پر ختم ہو جاتا ہے، یہ سند کا پہلا حصہ ہے۔ دوسرا حصہ حضرت شاہ ولی اللہؒ سے امام ترمذیؒ اور امام بخاریؒ تک ہے اور یہی وہ مشہور و معروف سلسلہ ہے جو کتب حدیث میں جامع ترمذی کی ابتداء میں چھپا ہوا ہے۔ سند کا تیسرا حصہ امام ترمذیؒ اور امام بخاریؒ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، وہ وہی ہے جو رواۃ حدیث کی صورت میں کتابوں میں درج ہے۔

(حقائق السنن ج ۱ ص ۸۲ تا ۸۶)

تحصیلِ علم، تعلیم و تربیت، نصابِ تعلیم اور احترامِ اساتذہ

ارشاد فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وحی کی مثال بارش کی طرح ہے کہ اس سے دل اور بارش سے زمین زندہ ہوتی ہے زمین تین قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ زمین جس نے اپنے اندر پانی جذب کیا، چند دن کے بعد سبزہ اور پھول ترکاری اور قسم قسم کے باغات اُگائے، زمین سرسبز و شاداب بن گئی، جیسے ہمارے علاقے کی سنگلاخ زمین کہ گویا وادئ غیر ذی زرع ہے، پچھلے دنوں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بارش ہوئی، زمین نے پانی جذب کیا، اب ہر طرف سبزہ اور بہار ہے ـــــ دوسری قسم وہ زمین ہے جس نے پانی کو جذب نہ کیا مگر پانی کو محفوظ کر لیا، نیچے کی تہہ سخت ہے پانی جذب نہیں کرتی، اور چونکہ وہ زمین پست ہے اور گڑھا ہے اور پستی تواضع کی علامت ہے۔ اب اگرچہ اس سے سبزہ نہ اُگا مگر مخلوقات کو فیض پہنچ رہا ہے، سب چرند پرند، حیوانات آکر اس سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور پانی لے جاتے ہیں ـــــ تیسری قسم وہ زمین ہے جس نے پانی کو نہ جذب کیا اور نہ پانی کو

محفوظ رکھا جیسے پہاڑ اور ٹیلے وغیرہ، بلکہ ادھر بارش ہوئی اور ادھر سارا پانی بہہ کر ضائع ہو گیا۔

تو وحی میں حیات کا مادہ ہے، اس کے طالب بھی تین قسم کے ہیں۔ ایک طالب وہ ہے کہ وہ علم کی راہ میں گھر سے نکلا، بے نمازی تھا، داڑھی منڈاتا تھا، خلافِ سنّت کام کرتا تھا، یہاں آکر چند دن میں بدل گیا، اب اس پر اعمالِ صالحہ، اتباعِ سنّت، عاجزی اور تواضع کے پھول اور چہرہ پر سنتِ نبوی کا سبزہ اُگ آیا۔ اب لوگ اسے دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ اس کی بداخلاقی، درشت کلامی، سبّ وشتم اور بدعملی یکایک کیسے بدل گئے، یہ وہ طالب علم ہے جس نے بارش کو اپنے اندر جذب کیا۔ بعض طلبہ ایسے بھی ہیں کہ جنہوں نے علوم ومعارف جمع کیے اور اب ان کو اوروں تک پہنچاتے ہیں، گو خود زیادہ فائدہ نہ اٹھایا مگر دنیا کو فائدہ پہنچایا۔ تیسری قسم وہ ہے کہ نہ خود علم حاصل کیا اور نہ اوروں تک پہنچایا، چٹیل میدانوں اور بنجر زمین اور ٹیلوں کی مانند ہے کہ نہ علم کو جذب کیا اور نہ اوروں کے لیے محفوظ کیا۔ صحیح معنوں میں علم حاصل کرنے والے بہت کم ہیں۔ الحمد للہ بعض ایسے بھی ہیں جو علم اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اور اس کی خوشنودی کا راستہ معلوم ہو۔

(صحبتے با اہلِ حق ص۲۷)

● طلبہ نے پوچھا کہ حضرت! یہ وظائف کس کس وقت اور کتنی کتنی مرتبہ پڑھے جائیں؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا آپ کو وظائف کی طرف کم اور کتاب ومطالعہ کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ اصل وظیفہ تحصیلِ علم کا اشتیاق اور محنت ومطالعہ اور تکرارِ سبق ہے۔ اب جو وظائف تمہیں بتائے گئے ہیں اللہ کی ذات پر یقین کر کے روزانہ ایک مرتبہ پڑھ لیا کریں، یہ کافی ہے کہ طالب علمی کا زمانہ ہے اور طالب علمی کے زمانہ میں طالب علم کے ساتھ اللہ کی خاص مدد شاملِ حال رہتی ہے، البتہ جب تحصیلِ علم سے

فارغ ہو جائیں تو اس سے زیادہ اوراد و وظائف پڑھ لیا کریں کہ وظائف کا وقت تحصیلِ علم کا زمانہ نہیں بلکہ تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد کا زمانہ ہے۔

(صحبتے با اہلِ حق ص۳۲۸)

● ارشاد فرمایا کہ ہماری کوئی سنتا ہی نہیں، میری اول و آخر یہی رائے ہے کہ دینی مدارس کے نصابِ تعلیم کی بنیادی اور اصولی چیزوں کو نہ چھیڑا جائے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا قائل نہیں ہوں۔ ایسے ہی نصابِ تعلیم نے امام رازیؒ اور امام غزالیؒ پیدا کیے ہیں، اسی نصابِ تعلیم سے قاسم نانوتویؒ، شیخ الہند محمود الحسنؒ، شیخ العرب والعجم سید حسین احمد مدنیؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ پیدا ہوئے ہیں۔ درسِ نظامی کو مربوط کرنے کی ضرورت تو ہے لیکن موقوف کرنے کی اجازت نہیں۔ دینی مدارس کے فضلاء کو حکومتی سندات کی تحصیل کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کرنی چاہیئے، اپنے اندر کی صلاحیت اور قابلیت پر محنت کرنی چاہیئے، جب اپنے اندر قابلیت اور لیاقت موجود ہو گی تو ہر جگہ ممتاز اور نمایاں رہیں گے۔

ارشاد فرمایا آج سندات لیکر گریڈ اور سکیل کی باتیں ہو رہی ہیں مگر ہمارے اکابر نے سندات لیکر گریڈ اور سکیل کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ ان کا معمول تھا کہ وہ حتی الوسع تنخواہ بھی نہیں لیتے تھے، اور اگر لیتے بھی تو جو بچ جاتی اُسے واپس مدرسہ میں داخل کر دیا کرتے تھے

(صحبتے با اہلِ حق ص۲۰۶)

● بعض طلبہ نے عرض کیا کہ ہم دورۂ حدیث میں داخلے کی غرض سے آئے ہیں، ۲۰ شوال کو حاضر ہوئے تھے، یہاں آکر معلوم ہوا کہ دارالعلوم حقانیہ میں داخلہ بند ہو چکا ہے، تو ایک دوسرے مدرسہ میں چلے گئے اور وہاں داخلہ تو مل گیا مگر وہاں قلبی سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہوا، اب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ دارالعلوم حقانیہ

ہی میں داخلہ لینا ہے۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس خواہش کو پورا فرمائیں گے اور داخلہ عنایت فرمائیں گے۔

ارشاد فرمایا: ایک رائے قائم کرنے کے بعد اس پر پختہ رہنا ضروری ہے، جب ایک مدرسہ میں دورۂ حدیث کے لیے داخلہ لے لیا ہے تو آپ استقامت اور بلند ہمتی سے وہاں سال مکمل کرلیں تو اللہ پاک برکت عطا فرمادیں گے۔ بعض طلبہ کو مدارس بدلنے کی بیماری ہوتی ہے، میرے نزدیک جگہ جگہ پھرنا، اساتذہ کا معیار معلوم کرنا، بعض کی مدح اور بعض کی مذمت کرنا، اس سے علم کی برکتیں ختم ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات ایسی صورتیں حد درجہ بدترین نتائج سامنے لاتی ہیں اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ فی الحال دارالعلوم حقانیہ میں داخلہ نہ لیں جہاں سبق شروع کیا ہے وہاں مکمل کرلیں پھر اگر مزید ضرورت محسوس کریں تو آپ کو دارالعلوم میں ضرور داخلہ مل جائے گا۔

———— (صحبتے با اہل حق ص۶۷)

● ارشاد فرمایا استاد سے پڑھے بغیر علمی مسائل پر بحث کرنا مفاسد کا پیش خیمہ ہے۔ صاحبِ فن استاد سے اکتسابِ فیض ایک معروف اور مسلّم اصول ہے۔ کسی فن کو صحیح معنوں میں سیکھنے کے لیے اُس فن کے ماہر استاد کی شاگردی ازبس ضروری ہے مگر آجکل کئی لوگ ایسے بھی ہیں جو استاد سے پڑھے بغیر صرف اپنے مطالعہ کے زور سے علم حدیث کے دقیق اور نازک ترین مسائل میں گفتگو کرتے رہتے ہیں جو بہت بڑے وبال اور مختلف مفاسد کا پیش خیمہ ہو سکتے ہیں۔

———— (صحبتے با اہل حق ص۶۴)

● ارشاد فرمایا: جب میں دارالعلوم دیوبند میں تھا اور ہمارے استاذ مولانا عبدالسمیع صاحب بیمار ہوئے تو ان کی تدریس کی کتابیں مشکوٰۃ شریف وغیرہ میرے حوالے کی گئیں اور یہ عزت مجھے بخشی کہ میں اُن کی نیابت کروں اور مشکوٰۃ شریف پڑھاؤں۔

ایک روز مولانا عبدالسمیع صاحب نے مجھے بلایا اور اپنے صاحب زادے (مولانا عبدالاحد) کے متعلق ارشاد فرمایا: "عبدالاحد اگرچہ لائق اور ذہین ہے مگر اسے تدریس کا تجربہ نہیں ہے، اس کو بڑی کتابیں ہرگز نہ دی جائیں اور نئے فارغ التحصیل کو ابتداء ہی سے بڑی کتابیں پڑھانا غلط اور خطرناک طریقہ ہے، میری وصیت یاد رکھنا میرے بیٹے کو تدریجاً ترقی دی جائے اور اسے اوّلاً پڑھانے کے لیے ابتدائی درجات کی کتابیں دی جائیں، بعد میں جب وہ ہر کتاب کی تین بار تدریس کرلے تب تدریجی ترقی دی جائے، تین دفعہ پڑھانے سے مدرس کو کتاب اور فن سے اچھی خاصی مناسبت ہوجاتی ہے اور فن کے مبادی یاد رہتے ہیں۔"

(صحبتے با اہلِ حق ص۵۶)

● ارشاد فرمایا:۔ آجکل بڑے بڑے مدارس قائم ہوگئے، طلباء کو ہر قسم کی سہولت میسر ہے اور سب کچھ تیار ملتا ہے، تاہم یہ یاد رکھو کہ عیاشی سے علم حاصل نہیں ہوتا۔ ہم نے پہاڑوں اور جبال وقلل میں رہ رہ کر علوم کی تحصیل کی ہے، اس زمانے میں روٹیاں مانگ کر کھاتے تھے۔ مجھے خود یاد پڑتا ہے کہ دہلی میں مجھے ۸ میل دُور جاکر روٹی کھانا پڑتی تھی، جب واپس آتا تو وہ ہضم ہوچکی ہوتی۔ تحصیلِ علم میں جس قدر مشقت اور تعب زیادہ ہوگا اتنی ہی قدر علم کی قدر وعظمت زیادہ ہوگی اور اس پر نتائج وثمرات بھی اچھے مرتب ہوں گے۔

(صحبتے با اہلِ حق ص۶۵)

شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ایک جامع الصفات والکمالات شخصیت، ایک شفیق استاذ، عظیم محدّث اور ایک محبوب راہنما

● ارشاد فرمایا: شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی شان سب سے نرالی

تھی۔ علماء بہت دیکھے، مدرسین کے درس میں شریک ہوئے، ہندوستان کی قیادت کو پرکھا، مگر جو جوہر اور امتیازی صفات شیخ مدنیؒ میں دیکھے وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آئے۔ شیخ مدنیؒ کا تقوٰی، شجاعت، شرافت، تواضع، انکساری اور کسرِ نفسی ان کے لیے طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ جب حضرت مدنیؒ کا نام سُنا تھا اور دیکھا نہیں تھا، تو نام کی شہرت سے ان کی شخصی عظمت کا ایک نقشہ ذہن میں بن چکا تھا، خیال تھا کہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ اور امیرانہ رکھ رکھاؤ کے آدمی ہوں گے۔ جب ان کی مجلس دیکھی، اُن کی معاشرت دیکھی تو انہیں کچھ اور پایا، ان کا علم بھی بے مثال تھا اور حلم بھی بے مثال۔

دوسری درسگاہوں میں منطق اور فلسفہ کی بڑی کتابیں پڑھ کر جب شیخ مدنیؒ کی درسگاہ میں حاضری دی تو ان کی درسگاہ میں سب سے بڑی خصوصیت یہ پائی کہ خود کو پہچان لیا، خود شناسی کا احساس ہوا اور علم اور علماء کی شان سامنے آئی۔ جب مجھے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا موقعہ ملا تو اس زمانہ میں بھی شیخ مدنیؒ کا درسِ حدیث ہوا کرتا تھا، میں نے اپنے زمانۂ تدریس میں بھی شیخ مدنیؒ کے درس میں شرکت کی کوشش کی۔ تدریس کے اوقات کے علاوہ ۱۲ بجے کے بعد، بعد العصر، بعد العشاء کے درسوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ شیخ مدنیؒ کا درس علمی اور مدلل ہونے کے ساتھ ساتھ آسان اور سہل ہوا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ پندرہ روز تک مسلسل حضرت مدنیؒ سفر پر رہے، جب واپسی ہوئی تو سب کو یقین تھا کہ حضرتؒ تھکے ہوئے ہیں اور مطالعہ بھی نہیں کیا، سبق نہیں ہوگا۔ مگر آپ گاڑی سے اُترے اور سیدھے دارالحدیث میں پہنچے اور سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ نواقضاتِ وضو کا بیان تھا، ارشاد فرما رہے تھے کہ مسئلہ زیرِ بحث میں آٹھ مذاہب مشہور ہیں، پھر مذاہب، ان کے دلائل اور تفصیل سے بحث کی۔ طلبہ متحیّر کہ تھکے ماندے ہونے کے باوجود اس قدر علمی تبحر، وسعتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ یہ تو بس ان ہی کی کرامت تھی۔

ایک مرتبہ درس کے دوران ایک طالب علم نے کسی مسئلہ میں "شمس بازغہ" کی بحث چھیڑنا چاہی تو شیخ مدنیؒ نے متعلقہ مسئلہ میں عبارات پڑھ پڑھ کر بحث کا مکمل احاطہ کیا اور فرمایا بھائی میں نے جب "شمس بازغہ" پڑھی تھی اُس زمانے میں کل نمبر پچاس ہوا کرتے تھے اور مجھے امتحان میں تریسٹھ نمبر حاصل ہوئے تھے۔

بہرحال اپنے اساتذہ میں شیخ مدنیؒ اور اکابر ہند میں شیخ مدنیؒ سے جو قلبی عقیدت وارفتگی اور غیر اختیاری تعلق رہا وہ کسی دوسرے سے پیدا نہ ہوسکا۔

——————(صحبتے با اھل حق ص۱۵۶)

● ارشاد فرمایا: دارالعلوم میں آپ کو جو کچھ نظر آتا ہے یا آپ کا جو ہمارے ساتھ حسن ظن کا معاملہ ہے یہ سب حضرت شیخ مدنیؒ اور حضرت لاہوریؒ کی دعاؤں کے ثمرات ہیں۔

سالانہ جلسہ کی بات ہوئی تو حضرت شیخ الحدیثؒ نے فرمایا جی چاہتا ہے کہ دارالعلوم کا سالانہ جلسہ منعقد ہو، مگر سوال یہ ہے کہ کس کو بلایا جائے؟ کون رہ گیا ہے، کس کو دعوت دی جائے؟ نہ تو شیخ مدنیؒ ہیں اور نہ ہی حضرت لاہوریؒ ہیں۔ شیخ التفسیر حضرت لاہوریؒ بڑی شفقت فرماتے تھے، مجھے علیحدہ اپنے خلوت خانہ میں بلاتے، بڑی شفقت فرماتے، سینے سے لگاتے۔ ہمارا کوئی سالانہ جلسہ حضرت لاہوریؒ کے بغیر منعقد نہیں ہوا۔ اور اب جو یہ رونقیں آپ کو نظر آتی ہیں یہ سب حضرت مدنیؒ اور حضرت لاہوریؒ کے فیوض اور برکات کے اثرات ہیں۔

——————(صحبتے با اھل حق ص۲۶۳)

● ارشاد فرمایا: حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ بہت تھے، مدارج بھی بہت تھے، ہر شاگرد دل و جان سے نثار ہونا چاہتا ہے۔ مگر ان میں جو مقام شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو ملا وہ تو سب سے انوکھا اور نرالا ہے اور جتنا فیض حضرت مدنیؒ کا پھیلا اُس تک کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا۔ آج برصغیر میں علم حدیث کی

جو خدمت ہو رہی ہے سب بالواسطہ یا بغیر بالواسطہ شیخ مدنیؒ کے فیوض و برکات ہیں! اس کی وجہ یہ ہے کہ شیخ العرب والعجم حضرت مدنیؒ نے اپنے استاد کے ساتھ قُرب و محبّت، اخلاص و خدمت اور تعلّق و اختصاص کا جو مقام حاصل کر لیا تھا وہ دوسروں کو حاصل نہ ہو سکا۔

———— (صُحبتے با اہلِ حق ص ۲۵۹)

● شیخ مدنیؒ پر طلبہ جان تک قربان کرتے تھے۔ آپ کی شخصیت میں غضب کی محبوبیت تھی۔ طلبہ میں اور عامۃ الناس میں آپ کی جلالت و عظمت تھی اور شفقت اور محبت بھی عجیب تھی۔

حضرت مدنیؒ کی رات سفر میں، جلسوں اور ریل میں گذرتی، دن دار الحدیث میں حدیثِ رسولؐ پڑھاتے گذرتا تھا۔ جب جلسہ ہوتا تو طلبہ نعرے لگاتے۔ ایک نعرہ یہ بھی لگایا جاتا کہ اسیرالہند زندہ باد، مہاجر مدنی زندہ باد، رئیس المہاجرین زندہ باد، طلبہ اور عام مسلمانوں کے ان نعروں سے وقت کے حکمرانوں اور گورنمنٹ انگریز کو تکلیف پہنچتی تھی اور طلبہ اسے خوب جوش سے بلند کرتے لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّار تاکہ کافروں کو ان سے جلائے۔

ایک مرتبہ آپ دار العلوم کی مسجد میں خطاب فرما رہے تھے، ارشاد فرمایا کہ تم مجھے مہاجر مدنی کے لقب سے یاد کرتے ہو اور نعرے بھی لگاتے ہو، مگر یاد رہے کہ مہاجر کو اپنے اصل وطن آ کر زیادہ سے زیادہ تین روز کے قیام کی اجازت ہے، بلا ضرورت تین روز سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا ورنہ مہاجرت باقی نہیں رہتی، جبکہ عرصہ ہُوا میں مدینہ منورہ سے ہندوستان آ گیا ہوں، مہاجرت باقی نہیں رہی ——— فرمایا ہمارے والد صاحبؒ نے ہندوستان سے ہجرت کی تھی، مَیں اُس وقت بچہ تھا، اہلِ نیّت سے نہ تھا، والد کی اتباع میں گیا تھا، اصل مہاجر ہمارے والد صاحبؒ ہیں ——— ہمارے والد صاحبؒ نے مرض الوفات میں ہم بیٹوں کو بلا کر وصیت فرمائی کہ دیکھو میرا تمہارے اوپر

حق ہے اور میں تمہیں یہ وصیت کرتا ہوں کہ اُس وقت تک آرام سے نہ بیٹھنا جب تک ہندوستان میں انگریز موجود ہے۔ والد صاحبؒ نے جہاد کی تعلیم دی، وہی لے کر ہندوستان آئے۔ اب وہی نصب العین ہے اور اب اس کیلئے ہندوستان [illegible] میرا ہند" تو دیکھو! امیر وہ ہوتا ہے جو سونا چاندی، دولت و سرمایہ کا مالک ہو، میرے پاس کونسی دولت ہے کہ آپ مجھے امیر الہند کہتے ہیں۔

شیخ مدنیؒ کا عام معمول یہ تھا کہ آپ کے پاس جو تحائف اور ہدایہ آتے تھے آپ کا ایک خادم تھا قادری صاحب، اُس نے اپنی ساری زندگی حضرت مدنیؒ کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی، آپ وہ ہدایہ اور تحائف اس کے حوالے کر دیتے وہ سب کاروبار چلاتا تھا ــــ شیخ مدنیؒ نے عہد کر رکھا تھا کہ جب تک ہندوستان میں انگریز کی حکومت رہے گی زمین نہیں خریدوں گا ــــ فرمایا کرتے تھے جب میں ہندوستان میں ایک انچ زمین کا بھی مالک نہیں تو آپ مجھے کیسے امیر الہند کہتے ہیں؟

ــــــــــ (صحبتے با اہل حق ص۹۹)

● ارشاد فرمایا: حضرت الاستاذ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا اندازِ تدریس اگرچہ عالمانہ اور فاضلانہ ہوتا تھا مگر آسان اور خوب تفصیل سے ہوا کرتا تھا، ہر بات سادہ اور آسان پیرائے میں ہوتی، غبی سے غبی طالب علم بھی آپ کے درس کو آسانی سے سمجھ لیتا تھا، مگر علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا بلیاویؒ کے تدریسی تقاریر پر خالص عالمانہ رنگ غالب تھا جس کو ذہین طلباء تو سمجھ سکتے تھے مگر سب کا سمجھنا آسان نہ تھا۔ مجھے شیخ مدنیؒ کا اندازِ تدریس بے حد پسند تھا، اس لیے میں نے اُن ہی کی نقل کی کوشش کی ہے اور ان ہی کے علوم و معارف کے ساتھ ساتھ اُن ہی کے اندازِ تدریس کو بھی جوں کا توں باقی رکھنے کی کوشش کی ہے۔

ــــــــــ (صحبتے با اہل حق ص۵۵)

● ایک مجلس میں ارشاد فرمایا: اگر اس تقریر ترمذی (حقائق السنن) کو میری نسبت سے دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں لیکن خدا تعالیٰ کے فضل و کرم کی نسبت سے بہت کچھ ہے۔ اس تقریر کی ترتیب و اشاعت سے میرے اندر جو نقائص، عیوب اور کمزوریاں تھیں وہ بھی ظاہر ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ سے ستاری کی درخواست ہے۔ میں تو ہر وقت اللہ ربّ العزّت کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ المدنیؒ کے علوم و معارف کی صحیح نقل کی توفیق عطا فرمائے۔ درسِ ترمذی میں میرا کچھ بھی نہیں جو حضرت مدنیؒ سے سُنا تھا کوشش کی کہ وہی محفوظ رہے۔ اور درس میں ان ہی کے ملفوظات اور ان ہی کے لطائف نقل کرتا رہا ہوں، میں تو صرف اپنے اساتذہ کے علوم کا ناقل ہوں۔

ارشاد فرمایا:۔ جب جوان تھا، تندرستی تھی، صحت تھی اور کام بھی کر سکتا تھا، اُس وقت برخوردار سمیع الحق اور آپ لوگوں نے ادھر توجہ نہ دی۔ اور اب جبکہ ضعف و امراض کی وجہ سے نہ تو مطالعہ کے قابل رہا اور نہ بحث و تکرار کے اور آپ نے یہ کام شروع کر دیا، اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

——————(صحبتے با اہلِ حق ص۵۷)

بعض مشائخ اور اکابر علماء کا تذکرہ

جن سے شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ نے براہ راست یا بالواسطہ کسب فیض کیا

ارشاد فرمایا:۔ ہمارے اکابر علوم و معارف کے آبشار تھے، ان کے ایک ایک ارشاد میں دسیوں مضامین کے عنوان ملتے ہیں۔ قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتابیں آج بڑے بڑے زیرک علماء بھی سمجھنے سے قاصر ہیں، انہوں نے کہیں لکھا ہے کہ:۔ ”خدا تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد

نبی بھیجنے کی قدرت ذاتی اور امکانِ ذاتی تو حاصل ہے، البتہ اس کا وقوع نہیں ہو گا۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا ٥ (الآیۃ)۔"

یار لوگ قاسم نانوتویؒ کی اس قدر آسان اردو عبارت کو نہ سمجھ سکے، اسے اُلٹا سمجھ کر یا جان بوجھ کر غلط مفہوم پہنا کر ڈھنڈورا پیٹنے لگے کہ قاسم نانوتویؒ ختمِ نبوت کے منکر ہیں۔ (العیاذ باللہ)

——— (صحبتے با اہلِ حق ص۱۳۴)

● ۱۹۳۵ء کے "شریعت بل" کا ذکر ہو رہا تھا، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا ذکر بھی ہوا تو احقر نے اسی مجلس میں عرض کر دیا حضرت! آپ کی حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ سے کبھی ملاقات ہوئی؟

ارشاد فرمایا: خوب یاد ہے کئی بار ان کی زیارت و ملاقات کے قدرت نے بہترین مواقع مرحمت فرمائے۔ مرحوم جمعیۃ علماءِ ہند کے روحِ رواں تھے۔ ایک طرف آزادی کی جنگ انگریز سے لڑ رہے تھے، سیاست کے خارزار کے شناور تھے تو دوسری طرف علوم و معارف کے بہت ماہر عالم تھے، فقہ و قانون ان کا خاص موضوع تھا۔ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

——— (صحبتے با اہلِ حق ص۲۱۰)

● حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ بہت کم بولتے تھے اور جب بولتے تو ان کی ایک ایک بات وزنی اور کافی ہوا کرتی تھی۔ شیخ العرب والعجم حضرت مدنیؒ کے سامنے کسی کو بھی بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، مگر مجھے حیرت ہوتی کہ جب اہم اور مشکل مسائل کے وقت حضرت مدنیؒ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کو بلاتے اُن سے مشورہ لیتے اور ان کی رائے کو صائب قرار دیتے۔ یہ خصوصیت صرف حضرۃ مفتی صاحبؒ

کو حاصل تھی۔ مراد آباد کے ایک اجلاس میں جب گڑبڑ ہوئی تو حضرت مدنیؒ نے مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کو بلایا، وہ تشریف لائے۔ صورتحال کی واقفیت کے بعد انہوں نے جو تجاویز پیش کیں وہ سب نے قبول کر لیں۔ درحقیقت حضرت مفتی صاحبؒ جمعیۃ علماء ہند کے روحِ رواں تھے۔

——— (صحبتے با اہلِ حق ص۱۵۶)

● امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تو ہندوستان کے سب سے بڑے خطیب تھے، وہ تو جامع الکمالات تھے، ان کی تقریر میں سب سے زیادہ محبوب چیز قرآن کی تلاوت ہوتی تھی، یوں محسوس ہوتا گویا اب قرآن نازل ہو رہا ہے، سننے والے محظوظ ہوتے اور وجد محسوس کرتے۔ دارالعلوم حقانیہ کے سالانہ جلسوں میں بھی تشریف لاتے رہے، مگر بدقسمتی سے اس زمانے میں ٹیپ ریکارڈر کا شیوع نہیں ہوا تھا اس لیے ان کی تقاریر محفوظ نہیں کی جاسکیں۔ دارالعلوم حقانیہ کے سالانہ جلسہ میں ایک مرتبہ تقریر فرما رہے تھے کہ بجلی فیل ہوگئی یا بند کر دی گئی، کارکن اس کے بنانے میں لگ گئے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے مسکرا کر کہا: "بھائی بجلی بنانا چھوڑ دو اور ٹھک ٹھک بند کر دو، عطاء اللہ شاہ نے جس بات کے بیان کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے وہ بیان کر کے رہے گا"۔ کارکن آرام سے بیٹھ گئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر جاری تھی کہ صبح کی اذان ہوگئی۔ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے شاہ جیؒ کی یہ تقریر رات بھر چھ گھنٹے جاری رہی، کیا مجال کہ کسی نے کروٹ بدلی ہو۔

——— (صحبتے با اہلِ حق ص۱۵۵)

● اللہ! وہ کیسے اور کتنے عجیب لوگ تھے۔ کردار اور عمل کے پکے، بات کے سچے، منافقت اور مداہنت سے کوسوں دور، اس لیے جو بات کرتے تھے دل میں اتر جاتی تھی۔ مولانا آزادؒ کی تقریر عقل و شعور اور جذبات کی آمیزش سے تیار ہوتی تھی۔ شُستہ گفتگو،

ادبی طرزِ ادا، اور پھر مولانا آزاد کی خطابت سے اس میں جادو بھر جاتا تھا، ایسا معلوم ہوتا کہ دشمن کے سروں پر فولادی ہتھیار سے حملہ کر رہے ہیں۔ ایک ایک حرف شجاعت و صداقت کا آئینہ دار ہوتا تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰنؒ مولانا آزادؒ کے نقشِ قدم پر تھے، ان کا انداز نرالا تھا، سامعین اور حاضرین کے دل مٹھی میں لے لیتے تھے۔ ان جیسی سحر بیانی کسی دوسرے میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

مولانا احمد سعیدؒ بلبلِ ہند تھے، مولانا حفظ الرحمٰنؒ کا اپنا مقام بہت بڑا تھا مگر مولانا احمد سعیدؒ لسانِ جمعیت تھے، وہ دہلی کی جامع مسجد میں جب خطاب کرتے تو ہزاروں کے مجمع پر سنّاٹا چھا جاتا، پوری کائنات ہمہ تن گوش ہوتی۔

——— (صحبتے با اہلِ حق ص۱۵۲)

● ایک مرتبہ مولانا ابو الکلام آزادؒ لاہور تشریف لائے تھے، ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ یہ زمانہ بھی وہی تھا کہ بیگانے تو کیا اپنے بھی مولانا ابو الکلام آزادؒ کو اپنی تنقید و تردید کا نشانہ بنائے ہوئے تھے مجھے بھی اس موقع پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ مولانا آزادؒ کی تقریر تھی، تقریر کیا تھی عقل و شعور اور جذبات کا آمیزہ تھا، دلائل اور براہین آزادؒ کی خطابت میں ڈھل کر سامعین کے دل و دماغ کو مسحور کر رہے تھے کہ لوگوں نے ابو الکلام آزادؒ زندہ باد کے فلک شگاف نعرے شروع کر دیئے تو مولانا آزادؒ نے فرمایا: "مسلمانو! یہ وقت نعروں کا نہیں کام کرنے کا ہے، اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ اور کام کر لو، بجائے جوش کے ہوش سے کام لو۔ اب میرا پیغام صرف یہی رہ گیا ہے کہ مسلمان بیدار ہوں اور نعرہ بازی کے بجائے کام کریں، مگر حیرت ہے کہ جب میں یہی بات کہتا ہوں تو مسلمان بجائے اس کے کہ کچھ کام کر لیں اُلٹا میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔" ——— (صحبتے با اہلِ حق ص۱۵۲)

● ہمارے دیوبند کے اکابر بڑے کفایت شعار اور قناعت پسند تھے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ دارالعلوم دیوبند کے ایام تدریس میں پچاس روپے ماہوار مشاہرہ پر گذر اوقات کرتے تھے۔ آپ کو کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کی طرف سے بارہ سو روپے ماہوار مشاہرہ کی پیش کش ہوئی مگر آپ نے اُدھر نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور فرمایا کہ میں پچاس روپے کی ذمہ داری اور اس کے اپنے صحیح مصرف میں استعمال سے فارغ نہیں تو بارہ سو روپے کا غم اور ذمّہ کیسے اٹھا سکتا ہوں۔

یہ ہے ہمارے اکابر حضرات کی کفایت شعاری اور قناعت! اب ہمارے دور میں ایسی قربانی کرنے والے ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ بلکہ اب تو معاملہ بالعکس ہے اور پچاس روپے تو درکنار پچاس لاکھ روپے کو بھی کچھ نہیں سمجھا جاتا۔

——— (صحبتے با اہل حق ص۵)

● مولانا نصیر الدین غور غشتوی سرحد کے شاہ ولی اللہ تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے قبل ہندوستان میں منطق اور فلسفہ کا درس تو بڑے اہتمام سے ہوتا تھا اور اس کو سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا تھا مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے ہندوستان میں علم حدیث اور اس کی تعلیم و تدریس کو فروغ دیا۔ اسی طرح سرحد میں بھی یہی حال تھا۔ کہا جاتا تھا قاضی مبارک فلاں مولوی سے اور فلسفہ کی فلاں کتاب فلاں علامہ سے پڑھنی چاہیئے، جب حدیث کی بات آتی تو کہا جاتا کہ مشکوٰۃ، کتاب العلم اور کتاب الایمان مولانا غور غشتویؒ سے پڑھ لینا چاہیئے، زیادہ نہیں ورنہ حدیث زیادہ پڑھ لینے سے انسان وہابی بن جاتا ہے۔ جہالت تھی، اللہ تعالیٰ حضرت غور غشتویؒ کی قبر کو نور سے بھر دے جنہوں نے سرحد میں حدیث کو رواج دیا۔

——— (صحبتے با اہل حق ص۷)

● ارشاد فرمایا: حضرت مولانا رسول خان صاحبؒ منقولات اور معقولات اور قدیم وجدید

کے بحرِ ذخار تھے، بہت بڑے عالم اور متقی انسان تھے، ایک جامع عالم تھے، معقولات و منقولات میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، اب ان کی نظیر ملنا مشکل ہے، تمام عمر درس وتدریس اور خدمتِ دین میں صرف کر دی، بڑے بڑے علماء ان کے شاگرد ہیں مرحوم کو دارالعلوم حقانیہ اور اس میں پڑھائے جانے والے معقولات کے نصاب سے بیحد مسرت ہوتی تھی کہ دارالعلوم حقانیہ نے اکابر علماء دیوبند کے علوم و معارف اور درسِ نظامی کے علومِ عالیہ کو بھی جوں کا توں محفوظ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازیں اور درجات عالیہ عطا فرمائیں۔

(صحبتے با اہلِ حق ص۵۲)

● ارشاد فرمایا: اسی طرح ہمارے دور کی عظیم شخصیت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب ہیں، جن کی زندگی میں ان کی تصانیف کو عوام وخواص میں مقبولیت نصیب ہوئی، اور ایسی ہمہ گیر مقبولیت کہ شرقاً غرباً، شمالاً جنوباً دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں تبلیغی نصاب سے استفادہ نہ کیا جاتا ہو، اور صرف اس ایک کتاب کو نہیں بلکہ آپ کی دوسری علمی کتابیں مثلاً کوکب الدری، لامع الداری، اوجز المسالک وغیرہ بھی علماء وطلباء اور علمی حلقوں کی مقبول اور منظور کتابیں ہیں۔ پس یہ ایک درجہ و فضیلت ہے جو کم ہی مصنفین کو حاصل ہوتا ہے۔

(صحبتے با اہلِ حق ص۴۹، ۵۰)

● ارشاد فرمایا: حضرت شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے حضرت لاہوریؒ کو خط لکھا تھا کہ "دیکھو! پاکستان میں دارالعلوم حقانیہ قائم ہو چکا ہے اس کا خصوصی خیال رکھنا، دارالعلوم حقانیہ ہمارا اپنا ادارہ ہے۔

اوائل میں دارالعلوم کے سالانہ جلسے ہوا کرتے تھے تو حضرت شیخ التفسیرؒ اپنی شفقتوں اور حضرت شیخ مدنیؒ کی تاکید کے پیشِ نظر ہمیشہ شرکت فرمایا کرتے تھے۔

فالج کی تکلیف شدت پر تھی پھر بھی تشریف لائے اور دارالعلوم کو نوازا۔

(صحبتے با اہلِ حق ص۲۶۳)

● ارشاد فرمایا، عموماً یوں ہوا کرتا کہ حضرت لاہوری دارالعلوم حقانیہ کے سالانہ جلسوں میں تشریف آوری کے موقع پر تقریر فرما کر اچانک غائب ہو جاتے، منتظمین کو بڑی پریشانی ہوتی، تمام رات تلاش کرتے رہتے، پھر کہیں پتہ چلتا کہ اکوڑہ کی کسی گمنام مسجد میں انہوں نے فرش پر رات گذار دی ہے۔ بعد میں آپ کے اس معمول سے منتظمین بھی آگاہ ہو گئے تھے ـــــ فرماتے مجھے خلوت اور خدا کے گھر میں فرش پر جو آرام و سکون حاصل ہوتا ہے وہ آرام دہ گدوں اور لوگوں کے ہجوم میں کب حاصل ہو سکتا ہے؟

(صحبتے با اہلِ حق ص۲۶۴)

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی پسندیدہ کتب

● ارشاد فرمایا: حضرت تھانویؒ کی تصانیف کو دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کس قدر علمیت و عملیت اور ہمت و صلاحیت دی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اوقات میں کس قدر برکتیں رکھ دی تھیں کہ ایک ہزار سے زائد کتابیں تصنیف کیں جن میں امت کی اصلاح و فلاح کا کافی سامان موجود ہے اور علم و عمل کی تشنگی بجھانے کے لیے ایک چشمۂ فیض ہے کہ لوگ سیراب ہوتے ہیں۔ آپ کے وعظ و تبلیغ اور رشد و ہدایت کے دیگر امور اور تدریسی خدمات اس پر مستزاد ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی تصانیف کا وزن و افادیت اور عظمت و اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بہت کم ہی ایسے مصنفین گذرے ہیں جن کی زندگی میں انکی کتابوں کو مقبولیتِ عامہ و خاصہ حاصل ہوئی ہو، مگر حضرت تھانویؒ کی تصانیف کو ان کی زندگی میں اشاعت اور بیحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ جیسا کہ متقدمین محدثین میں

ایک مثال امام بخاریؒ کی "صحیح" کی ہے کہ امام بخاریؒ کی حیات میں اس کتاب کو عام وخاص نے پسند کیا، بلکہ آپ سے براہ راست نوے ہزار سے ایک لاکھ تک تلامذہ نے پڑھنے کی سعادت حاصل کی اور اپنے ہاتھوں سے لکھی، اور یہ ایک بےنظیر تواتر ہے جو صرف صحیح بخاری کو حاصل ہے۔

(صحبتے با اہلِ حق ص۴۹)

● ارشاد فرمایا: حضرت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن بےنظیر تفسیر ہے جو انسان کو بڑی بڑی تفاسیر سے بے نیاز کر دیتی ہے، بڑے جامع اور تحقیقی انداز میں ہے، بالخصوص عربی میں آپ کے حاشیہ "التکشف عن مہمات التصوف" نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے، یقیناً علم وتصوف کے بیش قیمت جواہرات ہیں جو آپ نے ایک سلک میں حسن ترتیب سے پرو دیئے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کی ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ مشکل سے مشکل مواضع ومسائل کو واضح، آسان اور ایسے حسن انداز سے حل فرماتے ہیں کہ کوئی اُلجھن اور اشکال باقی نہیں رہتا۔ جب ہم جلالین اور بیضاوی پڑھتے تھے تو ان تفاسیر کو حل کرنے کے لیے ہم نے بیان القرآن کو کافی وشافی پایا، دوسری تفاسیر سے ہمیں اس قدر اطمینان وتشفی حاصل نہیں ہوتی تھی جتنی کہ بیان القرآن سے۔

(صحبتے با اہلِ حق ص۴۸)

● ارشاد فرمایا کہ:- ۴۳ شروحاتِ بخاری دیکھ لینے سے وہ تشفی نہیں ہوتی جو حضرت شیخ الہندؒ کے "الابواب والتراجم" کی تین سطروں سے حاصل ہو جاتی ہے۔

(صحبتے با اہلِ حق ص۱۲۲)

● ارشاد فرمایا:- تقسیم سے قبل دارالعلوم دیوبند میں زمانۂ تدریس کے قیام کے دوران میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے ملاقاتیں اور مجالس ہوا کرتی تھیں، مختلف علمی اور سیاسی موضوعات پر موصوف سے گفتگو رہتی۔ ایک روز دورانِ گفتگو میں نے دریافت کیا حضرت!

آپ کی تصانیف میں سب ایک سے بڑھ کر ہیں "فتح الملہم شرح صحیح مسلم" جیسی علمی اور بلند پایہ کتابیں آپ نے تصنیف فرمائی ہیں، اور حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ و تفسیر قرآن کی تکمیل "فوائد عثمانیہ" کے نام سے کی ہیں، ان میں زیادہ محنت، تعب اور مشکل اور دِقت کس تصنیف میں آپ کو پیش آئی؟

تو انہوں نے بڑی شفقت سے فرمایا تصنیف اور تالیف کے میدان میں خدا کا فضل شامل حال رہا۔ جس موضوع پر لکھنا چاہا اللہ تعالیٰ کی مدد نے یاوری کی البتہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ و فوائد کی تکمیل میں بڑے حزم و احتیاط اور سوچ بچار سے کام لینا پڑا، اور یہ خدا کے فضل اور اس کے احسان سے پائیہ تکمیل کو پہنچا۔

(صحبتے با اہلِ حق ص۱۵۳)

● ارشاد فرمایا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مرحوم کے توجیہات الہامی ہوتے ہیں۔ دقیق علمی مسائل میں آپ کے لطیف توجیہات سے بڑے بڑے اہم علمی عقدے حل ہو جاتے ہیں۔ آپ کا لکھا ہوا "الکوکب الدری" کا حاشیہ مثالی ہے، اپنے اکابر اور علماء دیوبند کی تمام تصنیفات، شروحِ حدیث، تفاسیر اور علمی تحقیقات سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُمت کے لیے اتمامِ حجت ہیں' ان کی تصنیفات سے شرحِ صدر حاصل ہوتا ہے۔ فرمایا حضرات اکابر علماء دیوبند کی کتابیں اور تصنیفات ہمارے اکابر کے مسلک "اعتدال" کی شاہد ہیں۔

(صحبتے با اہلِ حق ص۵۲)

● ارشاد فرمایا: ہمارے اکابر نے درسِ نظامی جو علم منطق اور علم فلسفہ کی کتابوں کو بطور نصاب باقی رکھا ہے اور پڑھاتے چلے آرہے ہیں' وجہ یہ ہے کہ ان کے پڑھنے سے اجتہادی ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ سوال و جواب، اشکال و اعتراض، مقابلہ و مناظرہ اور اساتذہ کی طویل بحثیں، سوال در سوال اور جواب در جواب کا سلسلہ

چلتا ہے تو طلباء کو تشحیذِ اذہان حاصل ہوتی ہے اور جو طلباء اس میں رغبت نہیں کرتے اور شوق سے نہیں پڑھتے اُن کے علوم سطحی رہتے ہیں، ذکاوت کی تیزی اور علوم میں عمق حاصل نہیں ہوتا۔

مولانا رسول خان صاحب مرحوم ہمارے پاک و ہند کے اکابر علماءِ دیوبند کے استاذ ہیں۔ ایک مرتبہ وفاق المدارس کا اجلاس تھا، میں بھی اجلاس کے سلسلے میں لاہور گیا ہُوا تھا تو حضرت مرحوم کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی، تو انہوں نے وفاق کے طرزِ عمل (نصاب میں منطق کی کتابوں کو اہمیت نہیں دی جارہی تھی) پر حد درجہ رنج و قلق کا اظہار کیا اور فرمایا "اس طرح علوم و معارف کی جڑیں کاٹ دی جائیں گی" تو میں نے عرض کیا کہ الحمدللہ دارالعلوم حقانیہ میں فلسفہ اور منطق کی ساری کتابیں بدستور پڑھائی جارہی ہیں، تو بے حد خوش ہوئے اور مسرت کا اظہار کیا۔

غالباً حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ اگر منطق اور فلسفہ کی کتب نصاب سے خارج کر دی گئیں تو پھر امام رازیؒ کی تصنیف سمجھنے اور سمجھانے والا کوئی بھی نہ ملے گا۔

——— (صحبتے با اہلِ حق ص۵۵)

● المجموع شرح المہذب للامام ابی بکر النوویؒ جس کے ساتھ فتح العزیز کے علاوہ حافظ ابن حجرؒ کی تلخیص الحبیر بھی طبع ہوئی ہے، اس کی چند ایک جلدیں بکر (احقر عبدالقیوم حقانی) بعد العصر حسبِ معمول حضرت شیخ الحدیثؒ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور کتاب پیش کر دی ——— جب کتاب کا نام سُنا تو لپک کر کتاب کو ہاتھ میں لیا، بڑی مسرت اور خوشی کا اظہار کرتے رہے، بار بار ورق اُلٹتے رہے، نظر اور بینائی کے ضعف کی وجہ سے کتاب کے مطالعہ سے محرومی کا احساس اُبھر اُبھر کر سامنے آتا تو فرماتے: "بس اللہ کو یہی منظور ہو گا، ایک وہ وقت تھا جب پانچ منٹ بھی فرصت کے

ملتے تو کتاب کے مطالعہ میں صرف ہوتے اور اب بھی وقت آگیا ہے کہ شرح المہذب، فتح العزیز اور تلخیص الحبیر میرے سامنے ہے لیکن مطالعہ و استفادہ کی سعادت سے محروم ہوں"۔
پھر جگہ جگہ سے احقر سے عبارت پڑھوائی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے ارشاد فرمایا: "بیٹے! محنت سے کام کرو، ہر مسئلہ کی تحقیق کرو، کوئی چیز بے حوالہ نہ چھوڑو، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک آپ کو ان کتب سے صحیح استفادہ اور اخذِ مسائل کی توفیق ارزانی فرمائے"۔ آمین

——— (صحبتے با اہلِ حق ص ۱۲۷)

● ماہنامہ الحق میں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے علماء کے سلسلہ میں احقر (عبدالقیوم حقانی) کا سلسلہ مضامین "علامہ سمعانیؒ سے ایک ملاقات" کا کسی نے ذکر چھیڑا، تو حضرت شیخ الحدیثؒ نے ارشاد فرمایا ہاں! مولانا عبدالکریم سمعانیؒ کی "کتاب الانساب" ایک بہت بڑا کارنامہ ہے، اور اب یہ اچھا ہوا کہ بیروت والوں نے اس کی فوٹو کاپی لے کر شائع کر دیا ہے، کتاب نایاب ہے مگر خدا کا فضل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم حقانیہ کے کتب خانے کو فراہم کر دی ہے۔ دوسرے روز جب دفترِ اہتمام تشریف لائے تو ناظمِ کتب خانہ مولانا اعجاز حسین صاحب کو بلایا اور "کتاب الانساب" کے بارے میں دریافت فرمایا، کتاب لائی گئی مگر مہمانوں کے ہجوم کی وجہ سے کتاب نہ دیکھ سکے، مجھے تاکید فرمائی کہ جب عصر کو آنا تو علامہ سمعانیؒ کی "کتاب الانساب" ضرور ساتھ لانا۔ چنانچہ حسب الحکم کتاب پیش کر دی، جگہ جگہ سے دیکھی ——— اس سلسلہ میں احقر کے شائع شدہ بعض مضامین بھی سنے تھے اور اب اصل کتاب کے بعض مقامات بھی سنتے اور بار بار کتاب کو مسرت و شوق کی نگاہ سے دیکھتے رہے، اور فرمایا ایک وقت تھا کہ پانچ منٹ بھی بغیر کتاب کے گذارنا مشکل تھا اور اب نظر کی کمزوری کی وجہ سے مطالعہ سے محرومی ہے ——— ارشاد

فرمایا: بہت اچھا ہُوا کہ اللہ تعالیٰ نے "الانساب" میں صنعت وحرفت سے تعلق والے پیشہ ور علماء کے انتخاب اوران کو متعارف کرانے کا کام لے لیا، اس سے علم اوراہلِ علم کی عزت بڑھے گی، نسلی امتیاز اور قومی عصبیتیں ختم ہوں گی، آپ محنت کریں، اسماء الرجال کی کتب میں بھی تحقیق کریں اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا۔ امام غزالیؒ، امام ابوحنیفہؒ وغیرہ یہ سب کاروبار اور پیشے سے وابستہ تھے اور اپنے ہاتھوں سے رزقِ حلال کماتے تھے۔ آپ کا سلسلۂ مضامین پسندیدہ ہے، خدا تعالیٰ مزید ہمت اور برکت دے۔ آمین

خدا کا فضل شاملِ حال رہا حضرتؒ کی دعاؤں اور توجہ کی برکات سے یہ سلسلہ مضامین "اربابِ علم وکمال اور پیشۂ رزقِ حلال" کے نام سے کتابی صورت میں چھپ چکا ہے اور دو سال میں اس کے دو ایڈیشن بھی نکل چکے ہیں۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِكَ ۔ ——— (صُحبتے با اھلِ حق ص۲۱۲ ب)

الحمد للہ! کہ افرادِ اُمت کے عمومی مزاج اور وقت کی ایک اہم ضرورت کے تقاضے کو ملحوظ رکھ کر فاضلِ عزیز مولانا عبدالقیوم حقانی نے اُردو زبان میں "علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات" کی تالیف اور ترتیب وتحریر کی طرح ڈال کر ہماری دیرینہ تمنا کو پورا کر دیا جو انقلاب آفریں ثابت ہوگی۔ ——— (امام اعظم ابوحنیفہؒ کے حیرت انگیز واقعات ص۱۳)

"دفاعِ امام ابوحنیفہؒ" (از مولانا عبدالقیوم حقانی) گویا حنفی فقہ وقانون، ائمہ احناف کی خدمات، ان کے علوم ومعارف اور شاندار تاریخ کی ایک دائرۃ المعارف ہے مصنف نے گویا حنفی تاریخ اور فقہ وقانون کی روح اور علوم ومعارف کا عطر کشید کر کے اُمت کے سامنے رکھدیا ہے ——— (دفاع امام ابوحنیفہؒ ص۱۵)



داعئ کبیر مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

"میری علمی اور مطالعاتی زندگی" کے زیرعنوان پیشِ نظر مضمون میں عالم اسلام کے فرزندِ جلیل داعیِ کبیر مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (صدر ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے سوالنامہ کی اس شق کے بارے میں روشنی ڈالی ہے جس میں شخصیت پر اثرانداز ہونے والی محسن کتابوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تھا۔ گویا مولانا کے اس پُرمغز اور معلومات آفریں مضمون میں آپکی عمر بھر کے "علمی اور مطالعاتی زندگی" کا عطر کشید ہوچکا ہے، لیجئے مشام جان معطر کیجئے۔ مولانا جیسی کثیرالاشغال شخصیت پھر ضعف وعلالت کے باوجود اتنی توجہ اور کرم فرمائی! یہ سب اسی علمی جذب وشوق اور اس دینی درد وسوز کے کرشمے ہیں جس کی شعاؤں اور اور حرارت سے منحرف عالم اسلام بلکہ یورپ کے بیشمار مسلمان بھی اپنے دلوں میں ایمان و یقین کا نور اور دعوت وعزیمت کی گرمی محسوس کررہے ہیں ——— (سمیع الحق)

سنہ ۱۳۶۴ھ (سنہ ۱۹۴۵ء) میں رسالہ "الندوہ" کی طرف سے جس کا مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے حکم و تحریک سے تیسری بار اجراء کیا گیا تھا۔ اور وہ راقم سطور اور رفیق محترم مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی سابق استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء (حال ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) کی ادارت میں نکل رہا تھا۔ مشاہیر اہلِ علم و اہلِ فکر کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ طلبہ اور اہلِ ذوق کے فائدے و رہنمائی کیلئے اُن کتابوں کا تذکرہ فرمائیں جنہوں نے ان کی ذہنی، علمی، دینی اور اصلاحی تشکیل و تعمیر میں خاصہ حصہ لیا۔ ہندوستان کے قدیم و جدید مشاہیر و فضلاء نے اس دلچسپ و مفید بحث و مذاکرہ میں حصہ لیا، اُن کے مقالات "الندوہ" میں شائع ہوتے رہے۔ بعد میں "مشاہیر اہلِ علم کی محسن کتابیں" کے نام سے یہ مجموعہ شائع ہو گیا۔

بعض احباب کے اصرار سے راقم سطور نے بھی (جس کی عمر اس وقت ۳۲ سال کی تھی اور اس کی علمی و تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا تھا) طلبائے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فائدے اور دلچسپی کے خیال سے اپنے تاثرات و تجربات قلمبند کیے۔ وہ مضمون اس وقت دارالعلوم کی مجلسِ علمی میں سنایا گیا اور ان مضامین کے مجموعہ میں بھی شامل کیا گیا۔ اب محب گرامی مولانا سمیع الحق صاحب کی خواہش و فرمائش پر اس پر نظر ثانی کی گئی ہے اور جا بجا اضافے کر دیئے گئے ہیں لیکن جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ تقریباً وہی ہیں جنہوں نے ۳۵، ۳۴ سال کی عمر تک متاثر کیا کہ یہی زمانہ ذہنی نشو و نما اور ارتقاء کا تھا۔ اس کے بعد جو کتابیں تحقیق و تصنیف اور تدریس کے دوران مطالعہ میں آئیں ان کی تعداد بہت زیادہ اور ان کے متعلق اظہارِ خیال بہت مشکل ہے۔

مضمون کے مطالعہ کے وقت یہ ملحوظ رہے کہ اس کا طرز واقعاتی اور سوانحی ہے تنقیدی اور تحقیقی نہیں، اس لیے ذہن پر مطالعہ کے وقت جو اثرات پڑے ان کو بے تکلفی اور بیساختگی کے ساتھ بیان کر دیا ہے مصنفین کے خیالات، مسلک

اور طرزِ فکر کی پوری ذمہ داری نہیں لی گئی اور نہ کسی ایسی کتاب اور مصنف کا ذکر محض اس کے مفید یا بلند پایہ ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ جس کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی یا ذہن و شعور نے اس سے کوئی گہرا اور دیرپا تاثر قبول نہیں کیا۔ اس لیے اس فہرست میں سے کسی کتاب یا مصنف کے نظر انداز ہو جانے کے معنی اس کی عدم افادیت یا تنقیص نہیں ہے۔ (ابوالحسن علی)

خاکسار کا خاندان ایک خزاں رسیدہ دینی خانوادہ[1] ہے جس کے بزرگوں نے کبھی فصلِ خزاں میں بھی دنیا کو پیامِ بہار سنایا تھا۔ ہندوستان میں جب دین کی بہار آخر ہوئی تو اس خاندان پر بھی تنزل آیا، ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دینداری جوانوں سے زیادہ بوڑھوں میں اور مردوں سے زیادہ عورتوں میں تھی۔

میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحیؒ نے ۱۹۲۳ء کے شروع میں انتقال کیا میری عمر اس وقت دس سال تھی، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحبؒ لکھنؤ میں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ رہتا تھا اور بھائی صاحب کی ہدایت کے مطابق خاندان کے بعض بزرگوں سے فارسی کی کتابیں پڑھتا تھا اور لکھنؤ بھائی صاحب کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔

خاندان میں دستور تھا کہ تقریباً روزانہ اور ان دنوں میں خاص طور پر جب کسی حادثہ کی وجہ سے تسکین و مشغلہ کی ضرورت ہوتی، ایک گھر کی تمام بیبیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں اور ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ (سید عبدالرزاق صاحب کلامی م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) کی منظوم "فتوح الشام"[2] پڑھی جاتی۔

---

[1] خاندان حضرت سید احمد شہیدؒ۔ متوطن رائے بریلی (اودھ) [2] یہ کتاب بڑی تقطیع پر
(باقی حاشیہ ص ۴۷ پر)

سید عبدالرزاق صاحب کلامی مرحوم حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہمشیر زادہ منشی سید حمیدالدین صاحبؒ کے پوتے اور ان کے حقیقی بھائی سید عبدالرحمٰن صاحبؒ کے نواسے تھے۔۔۔ واقدیؒ کی عربی "فتوح الشام" کو کلامی صاحبؒ نے بڑی قادرالکلامی اور جوش و دلی جذبہ کے ساتھ پچیس ۲۵ ہزار شعروں میں اردو میں نظم کیا ہے۔ چونکہ ان کو اس کا طبعی ذوق تھا اور جہاد و حرارتِ ایمانی کی چنگاری اسی تنور سے منتقل ہوئی تھی جس نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو گرما دیا تھا، اس لیے نظم میں جوش و اثر اور کلام میں آمد ہے۔ حضرت خالدؓ سے شاعر کو عشق تھا اور خواب میں بار بار ان کی زیارتیں ہوئی تھیں، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اُن کا ذکر کرتے ہوئے وہ بے قابو ہو جاتے ہیں اور اشعار میں خاص روح اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔

میری بڑی خالہ سیدہ صالحہ مرحومہ جو قرآن مجید کی بھی حافظہ تھیں یہ منظوم "فتوح الشام"، بڑے پُراثر و دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں اور پڑھتے پڑھتے کتاب اُن کو بہت رواں ہو گئی تھی۔ عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لیے آجاتے اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی بارادہ بیٹھ جاتے اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقع دیتیں، پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔

میری خالہ مرحومہ جب سادہ و بے تکلف لیکن پُراثر لہجہ میں یہ اشعار پڑھتیں تو جہاد کا ایک سماں بندھ جاتا، دل اُمڈ آتے حضرت خالدؓ، حضرت ضرارؓ اور اُن کی بہن حضرت خولہؓ بنت الازور اور دوسرے صحابۂ کرامؓ و مجاہدینِ شام کی جانبازی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶ سے) "صمصام الاسلام" کے نام سے مطبع نولکشور لکھنؤ کی طرف سے شائع ہوئی تھی، بہت سے دیندار خاندانوں میں وہ بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھی۔

اور شجاعت کا ذکر آتا تو مجلس پر ایک کیف و سرور اور نشہ سا طاری ہو جاتا کسی سخت معرکہ میں مسلمانوں کے گھر جانے اور کسی بہادر کے شہید ہونے کا تذکرہ ہوتا تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، آنسوؤں کے یہ طوفان اٹھتے اور برستے تو ان کا چھینٹا ہمارے معصوم دلوں پر بھی پڑ جاتا اور اس نرم مٹی کو تر کر جاتا۔ "فتوح الشام" کی ان ننده مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین کی محبت و عظمت اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی قیمت کو کوئی نئی علمی تحقیق اور جہاد کو مدافعانہ ثابت کرنے کی کوئی کوشش کم نہیں کر سکی۔ خون کے نقش کو سیاہی کے وہ نقوش کبھی نہیں مٹا سکتے جو لیٹے لیٹے یا آرام سے بیٹھے بیٹھے کاغذ پر ثبت کیے جائیں، پھر وہ نقش جس کو بچپن کے پاک آنسوؤں نے بیداری بخشی ہو سے

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھوٰی
نصارف قلباً خالیاً فتمکنا

دوسرا اثر یہ ہوا کہ اس قوم و مذہب کے خلاف (عیسائیوں) جن کے مقدر میں قیامت تک کے لیے اسلام کا عالمگیر حریف و مدِ مقابل بننا لکھ دیا گیا ہے اور جس کی قائم مقامی اور وراثت موجودہ یورپ کے حصہ میں آئی ہے، ایک حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا ہو گیا جس پر کسی ملک کے مقامی مسائل و حالات کبھی غالب نہیں آسکے۔

اُس وقت شرفاء کے خاندانوں میں "مسدسِ حالی" کا عام رواج تھا، اس کے اشعار لوگوں کے نوکِ زبان تھے، تقریروں اور مواعظ میں جا بجا اس کے اشعار سے کام لیا جاتا، مضامین میں نقل کیے جاتے۔ میں نے بھی "مسدس" کو بڑے جوش و لطف سے بار بار پڑھا، اس کے اشعار اپنی تقریروں میں جو بچوں کے جلسوں میں کی جاتیں اور اُن انعامی مضامین میں جو مقابلہ کے لیے لکھے جاتے، بار بار نقل کیے۔ اس کا

بہت ساحصہ زبانی یاد تھا۔ دل و دماغ پر "مسدس" کا اچھا خاصا اثر رہ چکا ہے۔ عام استعداد و معلومات میں اضافہ کے علاوہ اس کا ایک احسان یہ تھا کہ بیرون بعد مغربی مؤرخین و مصنّفین کی یہ کوشش بالکل بے اثر رہی کہ جاہلیتِ عرب کی اتنی مدح سرائی کی جائے اور اس میں اگر خوبی کے کچھ ذرات تھے تو ان کو خورد بین سے دیکھ کر پہاڑ بنا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ معلوم ہو کہ عربوں میں اخلاقی انقلاب کی پوری تیاری تھی اور کوہِ آتش فشاں پھٹنے کو تھا کہ موقع شناسی سے بر وقت اس کو چنگاری دکھائی گئی، اسلامی انقلاب کی پیغمبرانہ عظمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کی اہمیت کو گھٹانے کی یہ علمی سازش مولانا حالی کے اُن پُراثر اور سادے چند بندوں پر غالب نہ آسکی، جن میں انہوں نے جاہلیت کا نقشہ اور اس کی اخلاقی پستی کی تصویر کھینچی ہے نہ بعض قوم پرست عربوں کے مضامین اور تالیفات متاثر کر سکیں جو اپنی قومیت کے جوش میں کبھی کبھی جاہلیت کی طرف سے مدافعت کرنے لگتے ہیں اور اس کے روشن پہلو کو دکھانے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔

میرے گھر کا ماحول دادا صاحب (مولوی سید فخر الدین صاحب خیالی) اور والد صاحب کی وجہ سے جو ہیں عالم اور عربی کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ادیب و نقاد بھی تھے، دینی کے ساتھ ادبی بھی تھا۔ بہت بچپن ہی سے اردو نثر و نظم کی درسی اور غیر درسی کتابیں ہم بھائی بہنوں کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری کی بہت سی کتابیں اس زمانہ میں پڑھ لیں۔ اس زمانہ میں عام طور پر مولوی اسماعیل صاحب میرٹھی کا اردو نصاب "کمک اردو، سواد اردو اور سفینۂ اردو" رائج تھا۔

ہندوستان کا سررشتۂ تعلیم ان کتابوں سے بہتر کتابیں مرتب نہیں کروا سکا۔ ان میں سفینۂ اردو کا اثر آج تک دل و دماغ پر باقی ہے تقریباً نصف صدی گذر

جانے کے بعد اور ذہنی بلوغ وارتقاء کی بہت سی منازل طے کر لینے کے باوجود اب بھی اگر وہ کتاب ہاتھ آجائے (جو افسوس ہے کہ اب بالکل نایاب ہے) تو شاید سب کام چھوڑ کر اسی کو پڑھنے لگوں اور بچپن کی یاد تازہ کرلوں۔ اور کم سے کم اپنی چند پسندیدہ نظمیں اور مضامین مولوی ظفر علی خان بی اے علیگ کی نظم "راجہ دسرتھ کی کہانی" اور حیدر آباد کے طوفان پر ان کی نظم "او نامرادندی"۔ سید سجاد حیدر یلدرم کا مضمون "مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ" کو ایک بار پڑھے بغیر ہاتھ سے رکھنا مشکل ہو جائے اس غیر شعوری مطالعہ کا یہ فائدہ ہوا کہ زبان کا لطف اور ذوق زندگی کے ہر دور میں ساتھ رہا اور تحریر و انشاء میں کبھی مولویانہ خشکی پیدا نہ ہونے پائی۔ میرے خیال میں ابتدائے عمر میں سلیس و شگفتہ زبان اور اچھے مصنفین کی کتابوں کا پڑھنا جو سلیس و شیریں زبان میں اپنے خیالات ادا کرنے کے عادی ہیں، بہت مفید اور ایک حد تک ضروری ہے، نئی نسل اور نئے عہد سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور دعوت و تلقین کا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اردو کے ابتدائی مطالعہ اور طالب علمی کے اس ابتدائی دور میں جس کتاب کو اپنے شوق سے پڑھا اور جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ قاضی سلیمان صاحب منصور پوری مرحوم کی "سیرت رحمۃ للعالمین" کا پہلا حصہ ہے۔ مجھے یہ کبھی نہیں بھولے گا کہ جب اس کی دونوں جلدوں کا بعض دوسری کتابوں کے ساتھ وی۔ پی رائے بریلی آیا اور اس کے چھڑانے کے لیے اس وقت روپیہ نہ تھا، تو میں نے بے اختیار رونا شروع کیا، یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کیا گیا اور کتاب میرے ہاتھ میں آئی۔ بار بار پڑھی، کئی جگہ اور کئی بار اپنے دل اور آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ بعض خاص مقامات کا ہمیشہ خاص اثر پڑتا تھا۔ اسلام کے ابتدائی مبلغین کے واقعات، حضرت مصعب ابن عمیرؓ کی مکی و مدنی زندگی کا مقابلہ، ان کی والہانہ کیفیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ طیبہ میں تشریف آوری اور حضرات انصار کی مسرت، استقبال اور جاں نثاری، انصار کا ایثار اور مہاجرین کے ساتھ ان کی دینی محبت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعات وحالات کا دل پر خاص اثر پڑتا تھا، ٹہل ٹہل کر ان کو پڑھتا تھا، کو سناتا تھا اور اسی زندگی کی تمنائیں دل میں ہوتی تھیں۔ قاضی سلیمان صاحب کے درجات اللہ بلند فرمائے اس عالم میں ہوتے تو کہتا کہ آپ کی کتاب کا مجھ پر بڑا احسان ہے، اس نے سب سے پہلے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اس مزہ سے آشنا کیا جس کے بغیر یہ زندگی اور عالم خس وخاشاک ہے ؎

درخرمن کائنات کردیم نگاہ
یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

انہیں دنوں کے کچھ بعد میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی "الفاروق" آگئی، مطبع نامی کانپور کی چھپی ہوئی، سراپا تصویر پڑھی اور کئی بار پڑھی عراق کی جنگوں جسر، قادسیہ وغیرہ کے میدانِ جنگ کی تصویر مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ اور برجستہ جملوں میں کھینچی ہے۔ شاید اس سے زیادہ فردوسی "شاہنامہ" میں مسلسل اشعار اور پرشکوہ الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کرسکا۔ "الفاروق" کے جاندار اور گرم جملے اور لفظ شمشیر وسناں کا کام کرتے ہیں۔ مولاناؒ نے نظام خلافت پر جو کاوش کی ہے اس کے سمجھنے کی اُس وقت صلاحیت نہ تھی اور اب اس سے کوئی دلچسپی اور علمی تاثر نہیں ہے لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اُس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے۔

مولانا کی دوسری کتاب جو اُس دور میں پڑھی "سفرنامہ روم ومصر وشام" تھی۔ اتفاق سے یہی دو کتابیں ہمارے گاؤں کے محدود ذخیرۂ کتب میں تھیں۔ آخرالذکر کتاب

سے معلومات میں بڑا اضافہ ہوا، ذہن میں وسعت پیدا ہوئی، اور کیا عجب ہے کہ اوّل اوّل اسی کتاب سے دنیائے اسلام کی سیاحت کا شوق پیدا ہوا ہو جس کی نوبت برسوں بعد آئی۔ کچھ عرصہ بعد مولانا کی سوانحی تصنیفات "الغزالی، سوانح مولانا روم اور المامون" پڑھی۔ غالباً اسی وقت سے ذہن نے یہ اثر قبول کیا کہ سوانح حیات اور تذکرہ نگاری کے لیے اس سے بہتر اسلوب اور زبان جدید اردو میں نہیں پائی جاتی۔ اور غیر ارادی طریقہ پر اُن تذکروں اور "تاریخ دعوت و عزیمت" کے سلسلہ میں جو راقم کے قلم سے نکلا اس کو اختیار کیا گیا۔ افسوس ہے کہ "شعر العجم" کے پڑھنے کی نوبت بہت بعد میں آئی، جس کو میں اپنے موضوع پر منفرد اور مولانا کا شاہکار سمجھتا ہوں اس تاخیر میں غالباً میری فارسی کی کم لیاقتی کو دخل تھا۔

عمِ محترم مولانا سید طلحہ صاحب حسنی مرحوم ایم اے استاد اورنٹیل کالج لاہور کی صحبت اور مجلسوں میں "آبِ حیات" سے تعارف ہوا سنی اور بار بار پڑھی یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے۔ اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گیا جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔ "گلِ رعنا" گھر کی کتاب تھی، اس کو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنی معلومات ہو گئیں کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب برقؔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان لکھتے اور بولتے تھے۔ لکھنؤ کے محاورات اور صحت و صفائی زبان میں وہ سند کا درجہ رکھتے تھے، سخن شناس بھی تھے اور سخن سنج بھی۔ ابتداء میں شمسؔ لکھنوی کو کلام دکھاتے تھے، پھر آغا ثاقبؔ قزلباش لکھنوی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے اور انہیں کے رنگ کی پیروی کی۔ اُن کی صحبت میں زبان کا ذوق اور اچھے بُرے کی تمیز پیدا ہوئی۔ اُنکے

چھوٹے بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعہ ملّیہ میں پڑھتے تھے، اُن کو اردو شعر و شاعری کا بڑا شوق تھا۔ اُن کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر و تحریر کے مقابلے کرواتے، اس سلسلہ میں خاص طور پر مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور لکھنؤ کے شعراء میں سے آتشؔ اور امیر مینائی کے کلام سے اُن کو خاص ذوق تھا چنانچہ ان کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی۔ اُس زمانہ میں اودھ میں مشاعروں کا بڑا زور تھا۔ ہمارے چھوٹے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے بہت سختی سے روک دیا اور یہ شغلِ بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرۂ کتب تھا جس میں مولوی محمد حسین آزادؔ کی "نیرنگِ خیال" بھی تھی۔ عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزادؔ کی نثر کا (جو نثر اُردو کا ایک مرصع نمونہ ہے) بہت اثر پڑا۔ بہت دنوں تک "نیرنگِ خیال" اور "آبِ حیات" کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کیے جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدہ سے خالی نہیں رہے۔ یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا۔ ہر قسم کی چیزیں پڑھیں شررؔ مرحوم اور رتن ناتھ سرشارؔ کی بھی چند کتابیں پڑھیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلا دی جائے، بیکار و بے اثر نہیں رہتی اپنا اچھا بُرا اثر ضرور کرتی ہے، اس لیے اس کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اُردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب "یادِ ایام" کا تھا، جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ زبان کا بانکپن بھی موجود ہے جو میرے علم میں مصنف "گلِ رعنا"، اور نواب صدر یار جنگ، مولانا

حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی تحریر کا مشترک جوہر ہے۔ اس طرز پر میرا پہلا مضمون جو اب یاد آتا ہے "اندلس" پر تھا۔

عربی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد میرے استاد شیخ خلیل بن محمد بن شیخ حسین یمنی (محدثِ بھوپال) نے ہمیشہ کے لیے دل پر توحید کا نقش قائم کر دینے کے لیے سورۂ زمر بڑی توجہ اور ذوق و شوق سے پڑھائی۔ عربی ادب اور بالخصوص عربی شعر کا عرب صاحب مرحوم کو اللہ نے ایسا فطری ذوق بخشا تھا جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ وہ اُس قوم کے فرد تھے جس کے متعلق زبانِ نبوت نے شہادت دی ہے کہ "ایمان اس کے گھر کی دولت ہے"۔ (الایمان یمانٍ) عجم کا "حسنِ طبیعت" ننہیال سے اور عرب کا "سوزِ دروں" انہوں نے دادی ہال سے پایا تھا۔ قرآن مجید پڑھتے تھے تو خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رُلاتے تھے۔ قصائد پڑھتے تھے تو شوق عکاظ کا نقشہ کھینچ دیتے تھے۔ توحید اُن کا ذوقی مضمون تھا، دل کھول کر پڑھایا اور دل کو توحید کے لیے کھول دیا، وہ دن ہے اور آج کا دن، اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے الا للہ الدین الخالص (سورۂ زمر) کا نقش قائم ہے، اور اس کے سامنے مانعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفا۔ (سورۂ زمر)۔ (مشرکین کہتے ہیں کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت محض اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں) کا حیلہ اور دعویٰ جو ہمیشہ کے لیے نظامِ شرک کا سب سے بڑا فلسفہ ہے، تارِ عنکبوت معلوم ہوتا ہے —— ادب میں شیخ خلیل عرب کا ایک مجتہدانہ نصاب تھا جو ہندوستان میں بالکل نیا تھا، اُن کو اپنا ذوق تلامذہ کی طرف منتقل کرنے میں خاص کمال تھا۔ انہوں نے مبادی صرف اور تحریر و انشاء کی مشق کے ساتھ مصر و بیروت کے سلسلۂ قرأت (ایڈرس) المطالعۃ العربیہ، الطریقۃ المتبکرہ ۵، ۱ اجزاء، مدارج القرأۃ —— ۱۔ جزء کے بعد ابن المقفع کی "کلیلہ و دمنہ۔ مجموعۃ من النظم والنثر"،

حصّۂ نثر کا ایک حصّہ حفظاً اور حصّہ نظم - نہج البلاغۃ حصّہ کتب اور نظم میں حماسہ اور معری کی سقط الزند اور دلائل الاعجاز للجرجانی بڑے ذوق و جوش سے نیز مختصر تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ پڑھائی۔ عربی کے قواعد زبان کی مشق میں سب سے بڑا احسان اِس گمنام کے نامور ہمنام ابوالحسن علی الضریر کے رسالۃ الضریری کا ہے جو چند اوراق کی کتاب ہے۔ عرب صاحب نے اس کی عملی مشق کرائی اور یہی مشق اِس وقت تک کام آرہی ہے۔ اس تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک وقت میں مختلف علوم وفنون اور زبانوں کی تعلیم نہ تھی، صرف عربی زبان و ادب کی تعلیم تھی اور وہی اوڑھنا بچھونا، وہی مقصدِ حیات اور وہی ذوقِ طبع۔

عرب صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے محبوب و منتخب مصنفین اور اُن کی محبوب و منتخب تصنیفات کو اس طرح طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے، گویا وہی زبان و ادب اور طرزِ ادا کا واحد نمونہ اور ادب و ذوق کا منتہیٰ ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مصنفین طلبہ کے دماغ اور تخیّل پر حاوی ہوجاتے تھے اور طالبعلم اُن کا رنگ اُتارنے لگتے تھے۔ ابن المقفع اور جاحظ نثر میں، عبدالقاہر جرجانی ذوق، نقدِ ادب اور سخن فہمی میں، متنبی و بحتری شعر میں ان کے منتخب لوگ تھے، اس لیے ان کے طلبہ اپنی بڑی سعادت اور کمال سمجھتے تھے کہ ان میں ان کا رنگ اور انداز پیدا ہوجائے۔

راقم الحروف نے ابن المقفع اور صاحبِ نہج البلاغۃ، نیز کبھی کبھی جرجانی کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کی اور اس کا بڑا فائدہ ہوا — عرب صاحب کا ایک تعلیمی نکتہ یہ بھی تھا کہ وہ طلبہ کے دماغ پر یہ نقش قائم کر دیتے تھے کہ ادب و نثر کا ترکہ صاحبِ ذوق طلبہ کی میراث ہے، جس کے استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں انہیں باک نہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ان کی ہمت افزائی سے کبھی کبھی

ان صاحب طرز انشاء پردازوں کے بعض بعض جملے اور تعبیریں اپنی تحریر میں نگینہ کی طرح جڑ کر انعام حاصل کیا۔

اس تعلیم کے ابتدائی مرحلہ پر مصر کے مشہور صاحب طرز سید مصطفےٰ لطفی المنفلوطی کی کتاب "النظرات" عرب صاحب نے دیکھنے کو دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کا یہ ساحر ادیب دماغ اور تخیل پر چھا گیا اور دل میں سما گیا۔ اس کے عنوانوں پر اپنے مضامین لکھے اور تیز رفتار رہوار کے پیچھے دوڑ کر دور تک خاک اڑائی

میری مکرر خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خان صاحبؒ جیسا متبحر استاد نصیب ہوا جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوریؒ، مولانا لطف اللہ صاحب کوئلیؒ، مولانا احمد حسن صاحب کانپوریؒ اور شیخ الاسلام شیخ حسین یمنیؒ کے شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مجاز تھے۔ یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوتی تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا، صرف حدیث کے اسباق تھے، مولانا کی صحبت تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ تھے اور ندوۃ العلماء کا نادر علمی ذخیرہ اور مولانا کے علمی ماخذ تھے۔

مولانا کے یہاں تعلیم کی دو سری خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے فن کا ذوق اور اس کا کچھ (بہ قدرِ استعداد و توفیق) علمی ملکہ حاصل ہو جایا کرتا تھا۔ ایک یہ کہ تعلیم بالکل ناقدانہ اور محدثانہ اصول پر تھی۔ مولانا کو مذہب حنفی پر کلیۃً اطمینان تھا اور وہ اس کے زبردست وکیل و ترجمان تھے لیکن ان کا درسِ حدیث محدثانہ طرز اور نقدِ حدیث، اصولِ حدیث و رجال کی بحثوں پر مبنی تھا اور اس میں ہندوستانی طرز تدریسِ حدیث سے زیادہ یمنی طرزِ حدیث اور شوکانیؒ کے طرزِ تالیف کا اثر تھا۔ شوکانیؒ کی تالیف "نیل الاوطار" اس کا ایک نمونہ ہے۔ محدثین میں خصوصاً ابراہیم الوزیر، محمد بن اسمٰعیل الامیر اور علامہ مقبلی کی تالیف اور اصولِ حدیث کے بعض نوادر اور ان کے خاص ماخذ تھے،

جن میں "تنقیح الانظار" اور "توضیح الافکار" کے قلمی متن و شرح کے مسودات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دوسری چیزوں کے مقابلہ میں علامہ ابن الترکمانیؒ کی "الجوھر النقی" امام زیلعیؒ کی "نصب الرایہ" سے بہت مدد لیتے تھے، اور حدیث صحیح کا جواب حدیث صحیح سے اور نقدِ حدیث کے مسلّمہ اصول و مجتہدانہ مباحث سے دیتے تھے۔

دوسری چیز یہ کہ ان کا درس عملی تھا جس میں طالب علم استاد کے ساتھ شریکِ عمل ہوتے تھے۔ مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول، مذاہب کے دلائل، رجال پر نقد و جرح کی بحثیں نکلواتے تھے۔ اس طرح تدریس و تالیف کا سلیقہ سکھاتے تھے۔

درسِ حدیث میں عملی طور پر سب سے زیادہ فائدہ امام نوویؒ کی شرح مسلم سے ہوا جو ایک مبتدی طالب علم کے لیے بڑا اچھا استاد ہے، شروح حدیث کے فائدے اٹھانے اور ذہن پر زور ڈالنے کا ملکہ اسی سے پیدا ہوا۔ فتح الباری سے استفادہ کی اصل نوبت تدریس کے زمانہ میں ہوئی، اس وقت حافظ ابن حجرؒ کی وسعتِ نظر، فنِ حدیث پر ان کی قدرت اور اس کے وسیع ذخیرہ پر ان کا احتواء دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ یہ کتاب مسلمانوں کا ایک علمی کارنامہ ہے جس کی نظیر سے دوسری ملّتوں کا مذہبی ذخیرہ خالی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے کہیں وجد و سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ قلبی طور پر سب سے زیادہ اثر ابو داؤد کی کتاب الادعیہ اور ترمذی کی کی کتاب "الزہد والرقاق" نے ڈالا۔

اسی زمانہ میں "احیاء العلوم" دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا، مگر یہ مطالعہ جاری نہیں رہ سکا، اس میں بڑے بھائی صاحب کی بصیرت کو دخل تھا جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں شیخ خلیل عرب کی تجویز اور بھائی صاحب کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء

میں تدریس ادب کے لیے ایک فاضل و محقق صاحب زبان مراکشی عالم تشریف لائے یہ علامہ شیخ تقی الدین ہلالی تھے، جن کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو عربی زبان و ادب کے بہت سے مبادی و بدیہیات زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق و اصول نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتے اور عجمیت و ہندیت کے اثر سے کلیتہً آزادی نصیب نہ ہوتی، ان کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو قرنِ ثانی و ثالث کی زبان کو مُردہ اور صرف کاغذ کے نقش و نگار سمجھتے ایک شخص میں سلف کی احتیاط اور علمی تورع (عدم تحقیق کی حالت میں بے تکلف لا ادری کہہ دینا) مغرب اقصیٰ خصوصاً اہلِ شنقیط کا حفظ و استحضار، اہلِ لغت کا اتقان، علمائے نحو کی پختگی اور اہلِ زبان کی شیریں نوائی اور خوش گفتاری جمع تھی۔ بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ہر جملہ ادب کی جان ہوتا تھا جس کو آدمی جس ادب کی کتاب کے حاشیہ پر چاہے لکھ لے۔ میں نے "اغانی" اور "جاحظ" کی کتابوں کی زبان بولتے ہوئے ان کے سوا کسی کو نہیں سُنا، جو لکھتے تھے وہی بولتے تھے، اور جو بولتے تھے وہی عربی زبان کا روزمرہ اور محاورہ ہے۔

ہلالی صاحب سے عربی ادب و شعر کی کتابیں پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی لیکن اس سے زیادہ مفید اُن کی صحبت اور مجالس و سفر کی رفاقت تھی۔ انکی صحبت و افادات سے دو حقیقتیں پہلی بار منکشف ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ زبان اور ادب میں فرق ہے، زبان وہ ہے جو ادب کی بنیاد ہے، ادب زبان کی بنیاد کے کاخ وایوان اور زبان کی دیوار کے نقش و نگار ہیں۔ ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے جو تمدن و تخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے۔ زبان کی تعلیم و تربیت ادب کی تعلیم پر مقدم ہے۔ اگر زبان نہیں آتی تو ادب نہیں آسکتا اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاعِ وقت ہے۔ ہندوستان میں زبان کے دھوکہ میں اور عربی زبان کے نام سے اعلیٰ عربی ادب کی تعلیم دی جا رہی ہے جو اکثر اوقات بے بنیاد اور

بنے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔

ہلالی صاحبؒ کہتے تھے کہ "حریری" اور "متنبی" و "حماسہ" ادب عربی کی اعلیٰ کتابیں ہیں جو بلادِ عربیہ میں زبان کی طویل اور مسلسل تعلیم اور زبان کی مشق کے بعد پڑھائی جاتی ہیں اور عربی ادب کی تکمیل کرنے والے فضلاء ان کو پڑھتے ہیں لیکن ہندوستان میں یہی کتابیں ادب کا کُل سرمایہ اور جمع خرچ ہیں، ضرورت ہے کہ ان سے پہلے زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھا جائے۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ زبان کو انسانی زبان کی طرح بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھنا چاہیئے، اس پر شیخ نے دار العلوم میں مسلسل تقریریں کیں اور اپنے مُدعا کو دلائل سے ثابت کیا۔

دوسری حقیقت یہ منکشف کہ صرف و نحو کے فوائد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں جن کا درجہ زبان کے بعد ہے، زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہ ہو تو صرف و نحو کے قواعد بیکار ہیں۔ مفردات، الفاظ و جُمل مکان کی اینٹیں ہیں اور نحو کا علم اصولِ تعمیر کے قواعد اور انجنیری کا فن، اگر سرے سے اینٹیں نہ ہوں تو انجنیئرنگ اور اصولِ تعمیر کا بڑے سے بڑا علم ناکارہ اور فضول ہے۔

ہلالی صاحبؒ سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ زبان کا بہترین نمونہ تاریخ کی مُستند کتابیں اور عہدِ عباسی کے ادباء کی غیر مصنوعی تصنیفات ہیں، اس کے لیے انہوں نے ابنِ قتیبہ کی "الامامۃ والسیاسۃ" ابن المقفع کی "کلیلہ و دمنہ" ابوالفرج الاصبہانی کی کتاب "الاغانی" اور جاحظ کے رسائل کی سفارش کی۔

یہ زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کی بہار کا تھا ادھر ہلالی صاحبؒ کا فیض عام تھا۔ ادھر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی عربی کا رسالہ "الضیاء" نکال رہے تھے۔ عربی زبان و تحریر، نقد و تبصرہ گویا اوڑھنا بچھونا ہو رہا تھا مصری، شامی، عراقی اور مغربی (الجزائری و مراکشی) رسائل و جرائد تبادلہ میں آتے تھے، پڑھے جاتے تھے اور ان پر

گفتگو رہتی تھی۔ یہیں سے عربی اخبار بینی کی عمر کا بچپن تھا۔ عربی ادب کی کتابیں پڑھ لینے اور عرب اساتذہ کی صحبت میں رہنے کے باوجود اخبارات کا بڑا حصّہ سمجھ میں نہ آتا، اس لیے نہیں کہ ہندوستانی علماء کے بقول (جو سراسر غلط فہمی ہے) یہ کسی جدید عربی میں ہوتے تھے بلکہ طرزِ ادا اور اشتقاق کی ناواقفیت کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ بھائی صاحب کی مدد سے میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس سے جتنا فائدہ اور تعبیر اور اظہارِ خیال میں جتنی قدرت حاصل ہوئی ادب و زبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوئی۔

مصری و شامی ادباء و فضلاء کے مضامین پڑھ کر ان کی فصاحت، زبان کی قدرت کا سکہ دل پر بیٹھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان کے خزائنہ عامرہ کے نوادر جو صدیوں سے سربمہر تھے، وہ اپنے اخبارات و رسائل کے کھلے صفحات میں روزانہ لٹاتے ہیں۔ اور امیر شکیب ارسلان کے بقول عہدِ عباسی کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا وہ اس عصر (زمانہ) کا عرب ادیب و صحافی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے۔ لیکن معنوی و ذہنی حیثیت سے ذوق و دماغ پر ان مضامین کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑا۔ اور ہمارے ہندی ذوق نے جس نے ہندوستان کے زیادہ سنجیدہ، زیادہ گہرے اور زیادہ طاقتور اسلامی ادبیات اور ماحول میں نشوونما پائی تھی، عربوں کے قوم پرست اور وطنی افکار، مغرب سے ذہنی مرعوبیت اور خیالات کی سطحیت کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا، اور ذہن نے اس کی پستی اور کمزوری صاف محسوس کی، ان مضامین کو میں نے ہمیشہ روحانی اذیت اور ذہنی کوفت کے ساتھ پڑھا۔ اس حیثیت سے امیر شکیب ارسلان کی تحریروں اور خیالات میں نسبتاً کچھ گہرائی اور پختگی اور اسلامیت معلوم ہوئی، لیکن ملتِ اسلامیہ کے امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز میں اس وقت جس شخص کے خیالات و افکار میں نسبتاً زیادہ بلند نظری اور باریک بینی معلوم ہوئی اور

جس کی فراست نے متاثر کیا وہ سید عبد الرحمٰن الکواکبی کی تخیلی کتاب "ام القریٰ" ہے، جو اب پرانی ہو چکی ہے اور اس کے لائق مصنف کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔ لیکن بعد میں یہ دیکھ کر کہ وہ قومیت عربیہ کے اولین نقیبوں میں ہیں اور انہوں نے سب سے پہلے دولتِ عثمانیہ کے خلاف عربوں میں بیزاری پیدا کرنے کی کوشش کی، دل پھیکا ہو گیا اور عقیدت میں کمی آ گئی۔

۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں رسالہ توحید امرتسر میں جو مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا "تیرھویں صدی کا مجددِ اعظم" کے عنوان سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے متعلق مولوی محی الدین قصوری مرحوم کا ایک سلسلۂ مضمون شائع ہوا۔ بھائی صاحب کے حکم سے ۱۹۲۹ء - ۱۹۳۰ء میں میں نے اس کا عربی میں آزاد ترجمہ کیا جو ہلالی صاحبؒ کی اصلاح کے بعد علامہ سید رشید رضا مرحوم نے "المنار" میں بھی شائع کیا۔ اور "ترجمۃ السید الامام احمد بن عرفان" کے نام سے علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی چھاپ دیا۔ اس موضوع سے یہ میرا پہلا تعلق تھا۔

میری مدرسی تعلیم کا اختتام ہو چکا تھا اور آزاد مطالعہ کا آغاز حافظ ابنِ قیمؒ کی "زاد المعاد" میرا کتب خانہ، میری رفیقِ سفر اور میری گویا اتالیق و معلم تھی۔ دینیات کے کتب خانہ کی اتنی بہتر نمائندگی ایک کتاب میں ملنا مشکل ہے۔ اگر مجھے کبھی پورے ذخیرۂ علمی سے محروم کر دیا جائے اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے تو میں کتاب اللہ اور زاد المعاد اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اس نے مجھے نماز سکھائی، دعائیں اور اذکار یاد کرائے سفر کے آداب بتائے، اور روزمرہ زندگی کے مسنون قواعد و احکام سکھائے اور سنت کا ضروری علم بخشا۔

ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتۂ رحمت بن کر سامنے آئیں ان میں سب سے زیادہ مؤثر اور محسن کتاب محمد بن نصر المروزی کی کتاب "قیام اللیل" ہے۔ اس کتاب کا خاص کام

یہ ہے کہ عقلی اور استدلالی طریق سے نہیں بلکہ قلبی اور ذوقی طور پر دلچسپی اور شوق کا رُخ بدل دیتی ہے اور سارا کھیل دلچسپی اور اُنس ہی کا ہے۔ اس کتاب میں شب بیدار نوجوانوں کے ایسے مؤثر واقعات لکھے ہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات کی ایسی پُر اثر تفسیر اور قیام لیل کے فضائل جمع کیے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نوجوان کو آغازِ شباب میں مل جائیں اور اپنا اثر کر جائیں تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کی تفسیر سورۃ النور نے بھی اس پُر آشوب زمانہ میں دستگیری کی۔ یہ اور حافظ ابن قیمؒ کی "الجواب الکافی" نوجوانی میں بہترین نگران اور اتالیق اور اخلاقی محتسب و ناصح ہیں ـــــ زمانۂ تعلیم کے بے شعور دور میں جس کتاب نے تعلیم سے اور معلّمین سے نفع اٹھانے اور ان کے احترام اور طالب علمی کے آداب کا لحاظ کرنے کا خیال پیدا کیا وہ صاحب ہدایہ کے ایک شاگرد کی چھوٹی سی کتاب "تعلیم المتعلم" ہے۔ اسی طرح تحصیل علم میں علوئے ہمت، عزیمت اور ذوقِ علم پیدا کرنے میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی کتاب "علمائے سلف" نے مہمیز کا کام دیا اور دل و دماغ پر علمائے سلف کی عظمت و عزیمت کا نقش ثبت ہو گیا۔ میرے نزدیک ہر سچے طالب علم کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس کو حرزِ جان بنا کر رکھنا چاہیئے۔

والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کی تصنیفات کو اُلٹتے پلٹتے ان کا ایک مسودہ "ارمغانِ احباب[1]" کے نام سے ہاتھ آگیا جو انہوں نے

---

[1] یہ سفرنامہ پہلے "معارف" اعظم گڑھ میں بالاقساط شائع ہوا، پھر انجمن ترقی اُردو دہلی اور مکتبہ ندوۃ العلماء کی طرف سے "دہلی اور اس کے اطراف" کے نام سے شائع ہوا

اپنی ۲۶ سال کی عمر میں لکھا ہے اور ۱۳۱۲ھ کے طالب علمانہ سفروں کا روزنامچہ ہے، نہایت سادہ اور بے تکلف، لیکن اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا۔ مردانِ خدا کی محبت اور دین کی چاشنی محسوس ہوئی، حضرت سید احمد شہیدؒ سے اصل قلبی تعلق اسی سے پیدا ہوا، جہاں والد مرحوم "حضرت سیدنا" لکھتے ہیں وہاں دل جھوم جاتا تھا اور دل ایک خاص کیف محسوس کرتا تھا۔

دوسری چیز جس نے حضرات اہل اللہ کی محبت و عقیدت پیدا کی اور دین کا ایک خاص مزہ معلوم ہوا جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے، حضرت مولانا محمد علیؒ بانی ندوۃ العلماء کا چھوٹا سا رسالہ "ارشادِ رحمانی" ہے جس میں شیخ وقت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کے کچھ حالات، حکایات و ملفوظات اور سلوک و طریقت کے کچھ نکات ہیں۔ حضرت مولانا گنج مراد آبادیؒ میرے والد مرحوم کے شیخ تھے اور بچپن سے گھر میں آپ کا ذکرِ خیر سُنا تھا۔ اس روحانی تعلق اور ذہنی ربط سے کتاب ذوق و شوق سے پڑھی، محبت کے اشعار اور عاشقانہ کلمات دل میں چُبھ گئے اور تیر و نشتر کی طرح دل میں اُتر گئے۔ اس سے کچھ پیشتر یا بعد والد مرحوم کا ایک مختصر سا رسالہ یا مقالہ جو "استفادہ" کے نام سے شائع ہوا تھا، بار بار پڑھا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنے گنج مراد آباد کی حاضری کے حالات اور وہاں کے مشاہدات اور مولانا کے الطاف و عنایات کے واقعات قلمبند کیے تھے، اس نے مولانا کی محبت و عقیدت اور اہل اللہ سے ملاقات اور استفادہ کے شوق میں اور اضافہ کیا۔

مشائخ و بزرگانِ دین کے ملفوظات کے مجموعے بھی نظر سے گذرے، ان مجموعوں میں حضرات چشتیہ کے ملفوظات میں سب سے زیادہ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات "فوائد الفواد" اور حضرات نقشبندیہ کے ملفوظات میں حضرت شاہ غلام علیؒ کے ملفوظات "دُر المعارف" کا قلب پر اثر پڑا، اگرچہ ذہن

نے حدیث کے اثر اور ایک خاص ذہنی تربیت و مطالعہ کی وجہ سے بعض باتوں کے قبول کرنے سے ادب کے ساتھ معافی چاہی لیکن قلب نے واقعات اور بے ساختہ گفتگو اور خلوص کی گرمی و نرمی محسوس کی۔

فلسفۂ تصوف اور فلسفۂ اخلاق کے نکات و مباحث نے، جو متاخرین صوفیہ کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں، کبھی متاثر نہیں کیا، البتہ درد و محبت اور سوز و گداز کی باتیں بے اثر نہیں رہتی تھیں اور یہ تیر کم ہی خطا جاتے تھے۔ درد و محبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے ؎

ہم نے اپنے آشیانہ کے لیے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لیے

بزرگوں کی مجالس و ملفوظات کے سلسلہ میں تاریخی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر یہ کہے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا کہ عرصہ کے بعد جب مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالیؒ کی مجالس میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور ان کی التفات و عنایات سے سرفراز ہوا تو اُن کی زبان سے دینی حقائق و نکات اور سلوک و تصوّف کی نادر تحقیقات سنکر عالم حیرت میں پڑ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ملفوظات و مجالس کے قلمبند کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائی[1] اپنے علم و فہم کے مطابق یہ کہنے میں ذرا مبالغہ معلوم نہیں ہوتا کہ عرصۂ دراز سے تزکیہ و احسان اور دینی حقائق کے سلسلہ میں ایسے بیش قیمت ملفوظات اور ایسے گہرے علوم و مضامین سُننے میں نہیں آئے ؎

والغیب عند اللہ   وفوق کل ذی علم علیم

---

[1] یہ مجالس مکتبۂ الفرقان لکھنؤ کی طرف سے "صحبتے با اہلِ دل" کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور اس وقت تک اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

طالب علمی کے باقاعدہ اختتام کے قریب ضلع رائے بریلی کے ایک مردم خیز قصبہ سلون جانے کا اتفاق ہوا اور دو کتب خانے دیکھے۔ ایک زندہ و متکلم ایک جامد و خاموش۔ زندہ کتب خانہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحب[1] اور جامد کتب خانہ ان کا قیمتی علمی ذخیرہ۔۔۔ شاہ صاحبؒ کے واسطہ سے حافظ ابن جوزیؒ، حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ، حافظ ابن رجبؒ اور ابن عبدالہادیؒ وغیرہ کی بعض کتابیں دیکھیں۔ پھر وطن واپس جا کر احیاء العلوم مع تخریج عراقی، فضل علم السلف علی الخلف، دفائن الکنوز، تلبیس ابلیس، مختصر منہاج القاصدین وغیرہ منگوائیں۔ تلبیس ابلیس کے مطالعہ سے ناقدانہ ذہنیت پیدا ہوئی۔

اب اس سے پہلے کہ میں اپنی آخری محسن و مؤثر کتابوں کا ذکر کروں، تاریخی ادوار کے لحاظ کے بغیر اُن کتابوں اور تحریروں کا ذکر کرتا ہوں جنہوں نے بعض خاص حیثیتوں سے دل و دماغ پر کوئی اثر کیا اور کوئی قابلِ ذکر علمی فائدہ یا ذہنی تغیر پیدا کیا۔

نظام و نصابِ تعلیم کے متعلق اصلاحی و تجدیدی خیالات کا تخم شیخ خلیل عرب و شیخ تقی الدین الہلالی کی مجالسِ درس میں دماغ پر پڑا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماحول اور لٹریچر نے اس کا نشوونما کیا۔ ندوۃ العلماء کا تخیل اور دین و دنیا کی باہم آمیزی اور علماء و اہلِ دین کی قیادت و اقتدار کی ضرورت و اہمیت کا احساس نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کے اُس خطبۂ صدارت سے وضاحت و قوت کے ساتھ ہوا جو موصوف نے ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

---

[1] آپ حضرت شاہ پیر محمد صاحب سلونی چشتی نظامی کی اولاد میں سے تھے۔ زندگی گمنامی میں بسر کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسِ حدیث کی خدمت قبول فرمائی اور کئی سال وہاں شیخ الحدیث رہنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں انتقال کیا۔

میں پڑھا تھا اور میں نے اس کو غور سے بعد میں چھپا ہوا پڑھا، پھر مزید مطالعہ سے اس پر یقین اور اطمینان بڑھتا رہا اور یہ دونوں چیزیں میرے علمی عقائد و نظریات کا جزو بن گئیں۔

مغربی تہذیب و نظام سے نفرت اصل میں بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب مرحوم بی۔ ایس۔ سی، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی صحبتوں اور مجلسوں میں پیدا ہوئی، جو اس سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے اور اعلیٰ مغربی تعلیم کے باوجود اس کی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے۔ یوں بھی ان کی زندگی، ان کا سراپا قدیم اسلامی تہذیب و ثقافت کی فتحمندی اور مغربی ماحول کے اثرات کی شکست و ہزیمت کا اعلان کرتا تھا۔ اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے "سچ" اور "صدق" کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر کی پرانی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" (مترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم) اور لیکی کی "تاریخ اخلاق یورپ" (مترجمہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی) نے بڑی مدد دی اور اس سے بڑا مواد ملا جس سے اپنے مضامین و استدلال میں بہت کام لیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے مضامین ترجمان القرآن اور ان کی کتاب "تنقیحات" نے اور زیادہ وضاحت و تقویت پہنچائی۔ مولانا ابوالاعلیٰ کے "ترجمان القرآن" کے مضامین نے طرزِ استدلال اور طرزِ تحریر پر بھی اثر ڈالا اور ان کی تحریروں نے ذوق و فکر کو متاثر کیا۔

مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی نقائص، اسلامی تہذیب سے اسکے بنیادی و اصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پُرمغز چیز محمد اسد صاحب (نومسلم) کی کتاب (ISLAM AT THE CROSS ROADS) معلوم ہوئی جس کا لفظ بلفظ

دلنشیں ہوا۔ عرصۂ دراز کے بعد اُن کی دوسری فکرانگیز لیکن دلچسپ کتاب (ROAD TO MECCA) شائع ہوئی، جس کا عربی ترجمہ "الطریق الی مکہ" انہوں نے از راہِ عنایت مجھے خود بھیجا۔ یہ ایس اجمال کی تفصیل اور اس نظریہ کی عملی تطبیق تھی جو انہوں نے اپنی پہلی کتاب میں پیش کیا تھا۔ میں نے اُن کی اجازت سے اس کا ترجمہ اور تلخیص "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے شائع کیا، یہ کتاب ہر جویائے حق اور صاحبِ ذوق کے پڑھنے کی ہے۔

۳۹-۱۹۳۸ء میں مصر کے فاضل مؤلف ڈاکٹر احمد امین کی "فجر الاسلام جلد[۱]" اور "ضحی الاسلام جلد[۲]" کے مطالعہ کا موقع ملا۔ یہ عہدِ نبوی اور عہدِ اموی وعباسی کی فکری، ادبی، اخلاقی، سیاسی وعلمی تاریخ ہے جس میں واقعات سے نتائج اخذ کیے ہیں، جزئیات سے کلیات قائم کیے ہیں اور ہر دور اور حیاتِ انسانی کے اُن مختلف شعبوں پر مجموعی نگاہ ڈالی ہے۔ کتاب مصنف کی قوتِ ملاحظہ اور حُسنِ استنتاج کا اچھا نمونہ ہے۔ اور اگرچہ موجودہ عصری ومغربی تاثرات سے کلیۃً پاک نہیں اور اس کے مطالعہ سے ذخیرۂ حدیث پر اعتماد کی حد تک متزلزل ہو جاتا ہے، اور اس کی بعض بنیادی شخصیتوں کے بارے میں وہ عظمت اور عقیدت قائم نہیں رہتی جو ایک مسلمان کے دل میں قائم رہنی چاہیئے مگر میری سادہ لوحی کہیے یا ناقدانہ نظر کی کمی کہ مجھے مصنف کی اس کمی کا پورا احساس اس وقت نہیں ہونے پایا، اس کا صحیح احساس وعلم اور اس سے اذیت اُس وقت ہوئی جب میں نے ڈاکٹر الشیخ مصطفیٰ السباعی کی فاضلانہ کتاب "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" پڑھی، جس کے مطالعہ کی سفارش فنِ حدیث کے ہر طالب علم سے ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر احمد امین سے خیالات میں بڑا توارد معلوم ہوا، کئی جگہ حواشی پر اختلاف یا اظہارِ خیال کیا یا مصنف کو بے اختیار داد دی، لیکن سب سے زیادہ فائدہ جو ان کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوا وہ شگفتہ، شیریں اور علمی طرزِ تحریر کا ہے جس میں احمد امین اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرہ سے امام احمد بن حنبلؒ اور محدثین کی عمومی عظمت دل و دماغ پر قائم ہوئی۔ تذکرہ اور الہلال کے ادبی سحر حلال نے مسحور کیا۔ "ترجمان القرآن" کی دوسری جلد سے تفسیر اور فہم قرآن کے بعض نئے گوشے سامنے آئے اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی، سورۂ یوسف پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ نہ صرف قرآنی نکتہ شناسی کی ایک مثال بلکہ ادب عالی کا ایک زندہ جاوید نمونہ ہے۔

جب ترجمۂ قرآن اور تفسیر کی تدریس کی خدمت دارالعلوم میں سپرد ہوئی تو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے حواشی کی قدر آئی جن میں انہوں نے مفسرین کے اقوال کا عطر اور ان کی تحقیق کا وہ حصہ نقل کر دیا ہے جس کو اس زمانہ کا سلیم ذہن آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ اس میں مولانا کی سلاست فکر، حسن انتخاب اور تحریر کی شگفتگی بخوبی عیاں ہے۔ میں نے دیوبند کی ایک ملاقات میں مولانا سے اپنا یہ تاثر ظاہر کیا، مولانا کو بڑی مسرت ہوئی اور بعض صاحبوں سے اس کو نقل کیا۔

جدید معلومات و تحقیقات نے تفسیر کے سلسلہ میں جو نئے سوالات پیدا کر دیئے ہیں ان کا حل تلاش کرنے میں اور قرآنی اعجاز کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں "تفسیر ماجدی" اور اس کے مصنف مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کے تفسیری مضامین و تحقیقات سے بڑی مدد ملی اور اپنے مطالعہ و معلومات میں حقیقی اضافہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ کی تمام تصنیفات نقد کامل عیار اور علم و انشاء کے لحاظ سے معیاری ہیں، لیکن اس بے بضاعت کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ "خطبات مدراس" ہے۔ اگر کسی مصنف کے حصہ میں صرف یہی تصنیف آئے تو اس کو زندہ و جاوید بنا دے، اور اگر مقبول ہو (جیسا کہ آثار سے بھی ظاہر ہے) تو مغفرت کے لیے تنہا کافی ہے۔ بار بار مزے لے لے کر پڑھی، حدیث و سیرت کے نئے نئے پہلو سامنے آئے، اور اس عہد انقلاب میں اہل علم اور تعلیمیافتہ غیر مسلموں کے سامنے

حدیث وسیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی کتابوں میں بڑی معلومات اور مواد ہے، بہت سے لوگوں کا ان کے مخصوص طرز تحریر اور بات سے بات نکالنے کی وجہ سے جی نہیں لگتا، لیکن میرا ہمیشہ ان کی کتابوں میں جی لگا اور اپنے علم میں اضافہ ہوا۔ خاص طور پر ان کی کتاب "النبی الخاتم" سیرت پر بڑی البیلی کتاب ہے، اسی طرح ان کی دوسری کتاب "ہمارا قدیم نظامِ تعلیم وتربیت" بڑی پُراز معلومات اور مؤثر کتاب ہے، تیسری کتاب "تدوینِ حدیث" بڑی مبصرانہ اور نکتہ ورانہ تصنیف ہے۔ ان کا مضمون "مجدد الف ثانیؒ کا تجدیدی کارنامہ" بھی بڑی بصیرت ومعلومات کا ذریعہ بنا اور اس سے ان کے دوسرے مقالے سے جو "الفرقان" شاہ ولی اللہ نمبر میں شائع ہوا تھا، تاریخِ ہند کے نئے گوشے سامنے آئے۔

حیاتِ جاوید، وقارِ حیات اور تہذیب الاخلاق کے پرانے فائل سے ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مزاج اور ان کے موجودہ تعلیمی وسیاسی رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی، جس کی تکمیل "حیاتِ شبلی" سے ہوئی۔ مولوی سید طفیل احمد صاحب کی "حکومتِ خود اختیاری" اور "مسلمانوں کا روشن مستقبل" سے ہندوستان کی برطانوی سیاست اور مسلمانوں کے سیاسی تنزل اور ذہنی تغیر کی توجیہہ ہوئی۔ ہندوستان کی اسلامی، دینی وعلمی تاریخ کا سب سے بڑا خزانہ گھر میں موجود تھا کبھی خیال نہیں آیا تھا۔ حیدرآباد سے اشاعت کی تحریک ہوئی تو والد مرحوم کی تصنیف اور سرمایۂ حیات "نزہۃ الخواطر" کی آٹھ جلدیں ایک سے زائد کئی بار پڑھیں۔ ان کتابوں سے ہندوستان کی آٹھ سو برس کی جیتی جاگتی تاریخ آنکھوں کے سامنے آگئی۔ علماء ومشائخ، اہلِ درس واہلِ تصنیف، اہلِ ذوق واہلِ کمال، سلاطین ووزراء، امراء ورؤساء کے ایسے حالات اور ہندوستان کی علمی تاریخ لکھے ایسے قیمتی نوادر ونکات مفت میں

مل گئے جن کے لیے سینکڑوں کتابیں الٹنے اور ہزاروں صفحات کھنگالنے سے بھی کام نہ چلتا، یہ ایک بہت بڑی ثقافت اور معلومات کا خزانہ تھا جس کو ہندوستان کا کوئی طالب علم جو علم سے اپنا انتساب کرتا ہو نظر انداز نہیں کرسکتا اور جس کے بغیر آدمی اپنے ملک ہی میں اندھیرے میں رہے گا۔ علمی طور پر کسی کتاب کے مواد اور علمی ذخیرہ سے اتنا استفادہ نہیں کیا اور مضامین و تحریروں میں کسی سے اتنا کام نہیں لیا جتنا "نزہۃ الخواطر" کی ان ضخیم آٹھ جلدوں کے تاریخی معلومات سے، جن کی تلاش کے لیے تاریخ و تصوف کی کتابوں کے ہزاروں صفحات دیکھنے کی نہ توفیق تھی نہ فرصت، اور نہ یہ اندازہ کہ ان کو کہاں تلاش کرنا چاہیئے اور کس جگہ سے وہ دستیاب ہوسکتے ہیں۔ میری محرومی کہ میں اپنی کم سنی کی وجہ سے اپنے والد مرحوم سے کوئی استفادہ نہ کرسکا، لیکن اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، وہ ایسا علمی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ ساری عمر اس سے استفادہ کا موقع ہے۔

زندگی کے طویل تر دور میں دماغ پر علامہ اقبال مرحوم کا بڑا غلبہ رہا ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی معاصر شخصیت کے افکار کا اتنا گہرا اثر دماغ پر نہیں پڑا جتنا علامہ اقبالؒ کے کلام کا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اُن خیالات و تمناؤں کی ترجمانی کرتے ہیں جو روح و جسم میں پیوست ہوچکی ہیں۔ اقبال اور ان کے کلام پر اُردو میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو شاید کسی معاصر شخصیت اور اس کے فکر پر شائع نہیں ہوئیں لیکن سب سے زیادہ پُر مغز اور روح پرور کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی "روحِ اقبال" معلوم ہوئی۔

علامہ مرحوم سے ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء میں دوسری ملاقات کی اور کئی گھنٹے ان کے التفات و ارشادات سے محظوظ رہا، جس کا خلاصہ پنجاب کے ایک رسالہ میں "عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے" کے عنوان سے شائع ہوا۔

بلادِ عربیہ کے مسلمانوں کی بے التفاتی اور ناشناسی پر دل کھول کھول کر رہتا اور ٹیگور کی قدر افزائی پر غصہ آتا۔ علامہ مرحوم کی وفات کے بعد مصر میں پڑھے جانے کیلئے ایک مفصل و طویل مضمون علامہ مرحوم کی زندگی و خصوصیات پر لکھا اور بعد میں عالم عربی میں ان کے تعارف کی سب سے زیادہ کامیاب کوشش کی توفیق "روائع اقبال"[1] کے ذریعہ ہوئی جس نے بلادِ عربیہ کے نوجوانوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ابتدائی استغراق و انہماک کے دور میں تنبیہ ہوئی کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں، اصل شغف اور انہماک کی چیز اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام اور کلام ہے جو قرآن مجید کی شکل میں محفوظ ہے اور جس کو جو کچھ ملا ہے اُسی سے ملا ہے۔

لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں اور عالم اسلام کے تعلیمیافتہ نوجوانوں کے لیے اب بھی اس کو طاقت و خود اعتمادی کا بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔

مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب "مذہب و عقلیات" پر نظر پڑی جو بہ قامتِ کہتر او بقیمتِ بہتر" کی صحیح مصداق ہے ذوق و ذہن نے اس کو پورے طور پر اپنا لیا۔ اس رسالہ سے عقل و نقل کے حدود اور تجربہ و علم انسانی کی نارسی اور کوتاہی و ناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا جو مطالعہ میں بہت کام آیا۔ اسکے بعد قدیم و جدید فلسفہ اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا پڑھا، مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا بلکہ جس قدر پڑھا: ان ھم الا یخرصون اور بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ و لما یاتہم تاویلہ

---

[1] حال ہی میں اس کا ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں کے قلم سے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ" نے "نقوشِ اقبال" کے نام سے شائع کیا ہے۔

کی تفسیر و توضیح ہوتی رہی۔ حافظ ابن تیمیہؒ کی "سورۂ اخلاص" اور "کتاب النبوات" کے اشارات سے مزید مدد ملی، لیکن اس نقش کو پختہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات نے کیا۔

میرے معلّم و مربّی میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم جن کی اصابت رائے، خداداد سلامتِ فکر، استقامت اور گہرا علم زندگی کی ہر منزل اور ہر موڑ پر میرا رہنما رہا، برابر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی "ازالۃ الخفاء" کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہے، لیکن نوعمری کی سطحیت اور کم سنی کی عجلت کی وجہ سے کبھی دو چار صفحے سے زیادہ نہ پڑھ سکا۔ دفتر اول کا پہلا مکتوب جو حضرتؒ نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کو لکھا ہے اور جس میں اپنے بہت سے واردات اور راہِ سلوک کے تجربات لکھے ہیں، ہمیشہ ہمت شکن ثابت ہوا، اور جس طرح بدشوق بچے ہمیشہ قرآن کی تلاوت میں پہلا پارہ پڑھ کر چھوڑ دیا کرتے ہیں، میں بھی اس مکتوب کے چند صفحات پڑھ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دیا کرتا تھا۔ لیکن ایک بار اس کا عزم کر لیا کہ مکتوبات کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کروں گا، چاہے بڑا حصہ سمجھ میں نہ آئے۔ چنانچہ اس کے چاروں دفتر پڑھے، لفظ بہ لفظ دل لگا کر اور لطف لے لے کر پڑھے۔ بے استعدادی، فرصتِ مطالعہ کی کمی اور علومِ عقلیہ و آلیہ کی بے بضاعتی قدم قدم پر عناں گیر رہی، لیکن ایک عامی کے حصہ میں جو کچھ آیا اس پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ؎

آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

اس عرصہ کے بعد حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے مکتوبات کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت مجددؒ اور حضرت مخدوم بہاریؒ کے مکتوبات کے مطالعہ سے علم کا ایک نیا عالم آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وحی و نبوت کی قطعیت، مقامِ نبوت و منصبِ رسالت کی بلندی و برتری اور خصائصِ نبوت و انبیاء اور نبوت و ولایت کے

لوازم و ما بہ الامتیاز چیزوں کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں ان پر دقتِ نظر کے لحاظ سے یونان و عجم کا پورا فلسفہ سو بار قربان، اور وجد آفرینی اور کیف آوری کے لحاظ سے شعراء کے دواوین اور ادب کی بیاضیں ہزار بار نثار مکتوباتِ مجددی کے تذکرہ کے آخر میں سنت و بدعت کے بارے میں مجددانہ کلمات و تحقیقات قلم سے نکلی ہیں ان سے بڑا شرح صدر اور یقین کا اضافہ ہوا، نیز دورِ اکبری و جہانگیری میں دین کی نصرت و حمایت کے سلسلہ کے مکتوبات نے دینی حمیت و غیرت کو بیدار کیا اور افسردہ قلب و جسم میں دین کی حرارت پیدا کی۔ انسانی تصانیف اور تحریروں میں جن پر زمانہ گذر چکا ہے، کم چیزوں میں ایسی زندگی اور قلب کی حرارت دیکھی جتنی ان دونوں حضرات کے مکتوبات میں پائی جن پر صدیاں گذر چکیں، مگر وہی زندگی اور تاثیر موجود ہے جو عموماً لکھنے کے وقت ہوتی ہے۔

میرے محترم دوست اور دینی کاموں میں میرے رفیقِ کار مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے الفرقان کا "شاہ ولی اللہ نمبر" نکالنے کا ارادہ کیا تو اس بے بضاعت سے بھی فرمائش کی کہ اس میں حصہ لے میں نے شاہ ولی اللہ بحیثیتِ مصنف" کا عنوان اپنے لیے منتخب کیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ شاہ صاحبؒ کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالی جائے، کچھ پہلے دیکھی تھیں کچھ نہیں دیکھی تھیں۔ اس سلسلہ میں "ازالۃ الخفاء" کے بالاستیعاب پڑھنے کی نوبت آئی، یہ دینی نکتہ آفرینی کا دوسرا نمونہ تھا۔ انسانی تصنیفات میں کم کتابوں سے اتنا متاثر ہوا ہوں گا جتنا "مکتوبات" اور "ازالۃ الخفاء" سے علم کا چشمہ اُبلتا نظر آتا ہے، آدمی ایک نکتہ کا لطف نہیں لینے پاتا کہ دوسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے اور دوسرے سے فارغ نہیں ہونے پاتا کہ تیسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے۔ آیات کی تفسیر و تطبیق میں اور خلافت کے خصائص، نیز دینی انحطاط و تغیر کی تدریجی تاریخ کی تدوین میں جو کچھ لکھا ہے وہ علمی پختگی کے ساتھ کیا لطف و لطافت ہیں

ادب و شاعری سے کم ہے؟

"حجۃ اللہ البالغہ" میں نے مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ کے تلمیذِ رشید اور پنجاب کے مشہور عالم و مصلح حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے پڑھی تھی، اور دماغ پر اس کی عقلیت، محکم استدلال اور شاہ صاحبؒ کی باریک بینی کا اثر اسی سے قائم ہوا۔ "حجۃ اللہ البالغہ" سے علمی و اصولی مباحث اور متکلمانہ و فلسفہ آمیز دینی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی اور اِس حیثیت سے اس نے بڑا احسان کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچھلی صدیوں کی کسی شخصیت سے ذہن اتنا متاثر اور اس کی تحقیقات سے اتنا متفق نہیں جتنا شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کی کتابوں سے، اگر اپنے فکر و مسلک کیلئے کسی مکتبِ خیال کا تعین ضروری ہے تو میں انہیں کا نام لے سکتا ہوں۔ اور درحقیقت ہمارا تعلیمی و فکری نسب و شجرہ انہیں پر ختم ہوتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے نامور پوتا شاہ محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کی عقیدت خاندانی ورثہ ہے، لیکن اُن کی شہرۂ آفاق اور مسلّم ذکاوت اور وفورِ علم کا اندازہ صرف "منصبِ امامت" سے ہوا جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں اپنے طرز کی منفرد تصنیف ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مختصر تصنیف "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" (جس کو میں شاہ صاحبؒ کی قلمی بیاض کہتا ہوں) کے بعض علمی اشاروں اور مختصر نکتوں نے قرآن مجید کے مطالعہ و تفسیر میں بڑی رہنمائی کی اور شاہ صاحبؒ کے بعض مختصر جملوں اور تھوڑے لفظوں سے پورے پورے مضامین کے راستے اور مطالعۂ قرآن میں ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئیں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے ملفوظات کے مجموعہ "صراطِ مستقیم" (مرتبہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ، مولانا عبد الحیؒ) کو بہت دیر میں دیکھا، مگر تصوف کے اچھے ذخیرے اور ائمہ تصوف کے ملفوظات خصوصاً حضرات چشت کے پورے سلسلۂ ملفوظات کے مطالعہ کے بعد

دیکھا اور معلوم ہوا کہ تصوف کے لٹریچر میں یہ بالکل ایک انقلابی کتاب ہے۔
سلوک راہِ نبوت اور تقرب بالفرائض کے موضوع کے علاوہ جس کے سید صاحبؒ
امام تھے، اور جو اس عصر (زمانہ) کے لیے تزکیۂ نفس اور قرب الی اللہ کی سب سے
آسان، بے خطر اور وسیع شاہراہ ہے جو طریقت و حقیقت اور سلوک و تربیت کے متعلق
جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں وہ خداداد ذکاوت، علومِ نبوت سے فطری مناسبت،
اعلیٰ روحانیت اور دقتِ نظر کی دلیل ہے، اہلِ ظاہر و باطن اور اہلِ معرفت کے
مختلف فیہ مسائل میں جو محاکمہ کیا ہے اور جو فیصلہ کن باتیں کہی ہیں، وہ ان کی اعلیٰ سلامتِ طبع
دماغی توازن و اعتدال اور میانہ روی کی شاہد ہیں۔ کاش! اس کتاب کی شایانِ شان
خدمت ہوتی اور نئے طرز پر مرتب کر کے پیش کی جاتی۔

ان کتابوں کا ایک فیض یہ تھا کہ علومِ نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی
صناعی علوم اور تصنیفات سے پیدا ہو جاتی ہے، دور ہوئی، اس کی بری بھلی تمیز پیدا
ہوئی کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم و حقائق ادا کیے جا سکتے ہیں۔
اور کتابوں کے راستہ کے علاوہ کچھ اور بھی راستے ہیں جن سے وہ علوم آتے ہیں جو
کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کیے جا سکتے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز ہو اور چھلکے
نہ ہوں، معانی ہوں اور زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن ہو اور حواشی نہ ہوں۔

اس عصر (زمانہ) کے عارف مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ (م ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء)
سے ملا تو ان کی باتیں اور ان کے معارف سمجھنے میں نسبتاً سہولت ہوئی، حسنِ الفاظ
اور حسنِ ادا کا خیال، زمانہ کی زبان اور علمی اصطلاحات کی تلاش مقصود کے سمجھنے میں
حجاب نہ بن سکی۔ میں نے ایک موقع پر عرض کیا کہ اگر میں نے حضرت سید احمد شہیدؒ
کے حالات نہ لکھے ہوتے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات نہ پڑھے ہوتے
تو مجھے آپ کی باتوں سے بڑی وحشت ہوتی، مولانا نے اس کو پسند فرمایا اور

دوسروں سے نقل کیا۔

میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحبؒ کے مجلسِ درس کا فیض اور برکت شامل ہے۔ درسی و متداول اور بعض غیر متداول ضخیم تفسیریں، بعض لفظ بہ لفظ دیکھیں، لیکن اصل فائدہ متنِ قرآن کے سادہ اور بار بار کے پڑھنے سے ہوا۔ اس سلسلہ میں اس کا اظہار ضروری ہے کہ قرآنِ مجید سے اپنا حصہ لینے میں ضروری علمی و لسانی واقفیت کے بعد دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں، ایک علومِ نبوت و مزاجِ نبوت سے مناسبت رکھنے والے اشخاص کی صحبت جن کی معاشرت و زندگی کان خلقه القرآن کا پرتو ہو اور جنہوں نے انا القرآن الناطق (حضرت علیؓ کا مقولہ) کہنے والے کی قلبی و ذوقی وراثت میں حصہ پایا ہو۔ ان حضرات کے علوم کی تازگی و شگفتگی، بے آمیزی اور نکھار اور علم کی وسعت و گہرائی سے قرآنِ مجید کے الفاظ کی وسعت و عمق کا ایک قیاسی اندازہ ہوتا ہے۔ کئی الفاظ جو لسان العرب" اور "مفردات غریب القرآن" سے اور کئی آیات جو زمخشریؒ کی ادبی تفسیر "کشاف" امام رازیؒ کی عقلی تفسیر "فتوح الغیب" اور ابن کثیرؒ کی نقلی تفسیر سے حل نہیں ہوتیں، وہاں باتوں باتوں میں حل ہو جاتی ہیں۔ الفاظ و معانی میں نئی وسعت اور قوت نظر آتی ہے جو پہلے نظر سے اوجھل تھی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے ہیں ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے، انبیاء علیہم السلام کی جو کیفیات بیان کی گئی ہیں ان کا احساس ہوتا ہے۔ قوموں نے اپنے پیغمبروں کو جو جواب دیئے ہیں کان وہی آوازیں سنتے ہیں اور آنکھیں وہی منظر دیکھتی ہیں جو اشکالات اور شبہات علم کلام کی کتابوں نے اور کتابی مطالعہ نے فرضی طریقہ پر پیدا کر دیئے ہیں، وہ وہاں بے حقیقت ہو جاتے ہیں، قرآن مجید کے سمجھنے کے یہ دو طبعی طریقے ہیں۔

سنا ہے کہ جب قرآنِ مجید میں آدمی کا جی لگنے لگتا ہے تو انسانی تصنیفات سے جی گھبرانے لگتا ہے۔ انسانی کتابیں، انسانی تحریریں، انسانی تقریریں پست اور بے مغز معلوم ہونے لگتی ہیں۔ ادباء اور حکماء اور مفکرین کی باتیں طفلانہ اور عامیانہ نظر آتی ہیں جن میں کوئی گہرائی اور پختگی نہیں معلوم ہوتی، سفید کاغذ پر چھپے ہوئے سیاہ نقش و نگار کاغذی پھول معلوم ہوتے ہیں جن میں رنگ ہے خوشبو نہیں۔ انسان علم کھوکھلا اور خالی معلوم ہونے لگتا ہے، اور اس کا دیر تک پڑھنا ذوق اور روح پر بار ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جو علوم نبوت کے سرچشمہ سے نہ آئی ہو مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتا ہے، تسکین صرف وحی و نبوت کے راستہ سے آئے ہوئے علم سے ہوتی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا تک پہنچایا اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید میں اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے ؎

دادیم ترا از منزلِ مقصود نشاں
گر ما نہ رسیدیم شاید تو رسی

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مفتیٔ اعظم پاکستان

کرم فرمائے محترم ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' !

آپ نے مجھ ناکارہ کی علمی زندگی کے بارہ میں کچھ سوالات کیے ہیں۔ میں علم وعمل سے تہی دامن اس کا جواب کیا دوں ، یہ خود ایک مسئلہ بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی ۔ آپ نے مولوی محمد تقی سلمہ' کو مسلط فرما دیا جو جواب کے لیے یاددہانی کے ساتھ تاکید بھی کرتے رہے۔ آج مجبور ہو کر یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی علمی اور عملی زندگی کے جس باب اور جس پہلو پر نظر ڈالتا ہوں سب کوتاہیوں ، لغزشوں اور غفلتوں سے لبریز نظر آتے ہیں ، ان حالات میں میں دوسروں کو کیا بتاؤں ، البتہ اللہ تعالیٰ کے انعامات اس ناکارہ پر بیحد وبیشمار ہوئے۔ ان میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ایک ایسے گھرانہ میں

پیدا کر دیا جو اسلام و ایمان اور اس کے ساتھ دینداری میں معروف تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا دین کی باتیں، بزرگوں کی حکایتیں کان میں پڑتی رہیں۔ اس کے بعد سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُس نے ایک ایسی جگہ پیدا فرما دیا جو علم اور دین کے اعتبار سے پورے ملک میں بلکہ شاید پوری دنیا میں ایک امتیازی مقام رکھتا تھا یعنی دیوبند۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ ایسے راسخ العلم محقق علماء کو جمع فرما دیا تھا جو علم کے ساتھ عمل اور تحقیق کے ساتھ اعتدال اور بلند نظری کے ساتھ اپنے زمانے کے حالات پر گہری نظر رکھنے والے تھے۔ وہ علماء ربانی صرف علماء ہی نہیں اولیاء اللہ بھی تھے۔ والد ماجد اسی دارالعلوم میں علمی عملی تربیت پاکر اس کے مدرس کی حیثیت میں تھے۔

قدرت نے اس سوال کی زحمت ہی سے بچا دیا کہ بچے کو تعلیم کے لیے کہاں بھیجیں۔ جب تک پڑھنے کے قابل نہ تھا اس وقت بھی دارالعلوم کا صحن میرے کھیلنے کی جگہ تھی، ہر طرف علماء صلحاء ہی پر نظر پڑتی تھی، کوئی بات بھی کان میں پڑتی تو انہی بزرگوں کی۔

سنہ ۱۳۲۰ھ میں جبکہ عمر کا ساتواں سال تھا باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی، اور سنہ ۱۳۶۲ھ تک اسی گہوارۂ علم و عمل میں رہنے کی توفیق ملی۔ میری علمی عملی زندگی کے کسی گوشہ میں کوئی خیر کا پہلو ہے تو وہ سب ان بزرگوں کا فیضِ نظر ہے میرا اپنا کچھ نہیں۔ عام مسلمانوں اور طلباء و علماء کے لیے کچھ مفید باتیں اور کلمات حکمت انہی بزرگوں سے سُنے سنائے ہیں جن کو اپنے لیے بھی سرمایۂ سعادت سمجھتا ہوں اور دوسرے اہلِ علم دوستوں کو بھی ان کا پہنچانا مفید سمجھ رکھتا ہوں ــــ اس کی معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے سوالات کی ترتیب پر اس کے جوابات نہیں، مگر اُمید ہے کہ مقصد سوالات پر نظر کی جائے تو اس میں ان کے کافی جواب ملیں گے۔

(۱) مطالعہ کتب | اصل یہ ہے کہ انسان کا معلّم درحقیقت انسان ہی ہو سکتا ہے کوئی کتاب خود معلّم نہیں ہوتی البتہ تعلیم تعلّم میں معین ضرور ہوتی ہے۔ اس لیے اصول کی بات یہ ہے کہ جس علم وفن کو حاصل کرنا مقصود ہو اُس کا ماہر محقق استاد تلاش کیا جائے اور جب وہ مل جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت سمجھ کر اس سے اکتسابِ علم میں مشغول ہو، کسی کتاب کا مطالعہ بھی کیا جائے تو اسی معلّم کی تجویز سے، تاکہ وہ اس کی استعداد اور ضرورت پر نظر کر کے اس کے لیے مطالعہ کی کتابیں تجویز کرے۔ خود رائی سے مختلف کتابوں کا مطالعہ وقت اور محنت بہت لے گا، فائدہ اتنا نہیں ہوگا۔۔۔ آجکل مدارسِ عربیہ میں استاد کا انتخاب طالبعلم خود نہیں کر سکتا تو طالب علم کم از کم یہی کر سکے کہ ایسے مدرسہ کا انتخاب کرے جہاں وہ کتابیں جو اس کو پڑھنا ہیں اُن کے ماہر اساتذہ کے سپرد ہوں، پھر جس استاد کو اپنے مطلوب فن میں زیادہ ماہر سمجھے اُس سے استفادہ کا سلسلہ قائم کرے خواہ سبق اس کے پاس ہو یا نہ ہو۔

(۲) اس زمانہ میں تصنیف، تالیف، کتابوں کی اشاعت اتنی عام ہے کہ احاطہ دشوار ہے۔ ہر اہل و نااہل تصنیف میں لگا ہوا ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآن و سنّت میں تحریف کرتے ہیں، اور بے دین و ملحد بھی ہیں۔ اس لیے اس زمانے میں کتابوں کے مطالعہ کے لیے مناسب صورت یہ ہے کہ عوام کسی عالم سے اپنے مناسبِ حال کتابیں مطالعہ کی تجویز کرائیں اور طلباء اپنے اساتذہ سے، اور جہاں مطالعہ میں کوئی اشکال پیش آئے اُس کو اپنی رائے سے طے نہ کریں بلکہ عوام علماء سے اور طلباء اساتذہ سے تحقیق کر کے رفع کریں۔۔۔ اگر یہ طریق اختیار نہ کیا گیا تو بیشمار کتابیں دیکھنے اور بڑی محنت کرنے کے بعد جو کچھ علم آئے گا وہ بھی قابلِ اطمینان و اعتماد نہیں ہوگا۔

(۳) جس کتاب کا مطالعہ کرنا ہو پہلے اس کے مصنف کا حال معلوم کیجئے کہ جس موضوع پر یہ کتاب ہے اُس فن میں مصنف کی مہارت کس حد تک ہے۔ اگر مصنف ہی کی مہارتِ فن کی تحقیق نہ ہو تو اپنے وقت اور محنت کو اس کے پیچھے ضائع نہ کریں، اور اگر کتاب دینیات سے متعلق ہے تو مصنف کے علمی مقام کے ساتھ اس کی عملی اور اخلاقی زندگی کی بھی تحقیق مناسب ہے، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ علومِ دین میں بے عمل آدمی کی تصنیف اور کلام میں وہ اثر نہیں ہوتا جو متقی علماء کی تصانیف میں ہے۔

(۴) عام مسلمان جو دین کا کافی علم نہ رکھتے ہوں وہ فرقِ باطلہ کی کتابیں اور ملحدین اور بے دین لوگوں کے مضامین ہرگز نہ دیکھیں کہ جس طرح بے دینوں کی مجالست اور صحبت بُرا اثر ڈالتی ہے اسی طرح ان کا کلام اور تصنیف بھی، بلکہ بعض اوقات اس کا اثر صحبت و مجالست سے بھی زیادہ مضر ہوتا ہے۔

(۵) اہلِ علم میں بھی صرف وہ حضرات ملحدین اور فرقِ باطلہ کی کتابوں کا مطالعہ کریں جن کو ماہر اساتذہ کی صحبت سے علم میں رسوخ حاصل ہو چکا ہے، اور وہ اپنے وسائل کے اعتبار سے دفاع عن الاسلام کی خدمت انجام دینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ مثلاً تحریر و تقریر اس درجہ میں ہو کہ حق بات کو دلنشیں انداز میں فریقِ مخالف کی نفسیات پر مؤثر کر کے بیان کر سکیں۔ جو لوگ اتنی استعداد نہیں رکھتے یا اُن کو ایسے لوگوں سے واسطہ نہیں پڑتا، وہ فضول اپنا وقت اور محنت ان کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرنے کی بجائے اُن کتابوں کا مطالعہ کریں جو اپنے لیے بھی اصلاحِ نفس کا ذریعہ بنیں اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ان کی تعلیم و تبلیغ مفید ہو۔

ہمارے اکابرؒ فرمایا کرتے تھے کہ درسِ نظامی سے فراغت کا حاصل اتنا ہے کہ

اس کے فاضل میں مطالعہ کی ایسی استعداد پیدا ہوگئی ہے کہ استاد کی مدد کے بغیر بھی مطالعہ کر کے استفادہ حاصل کرسکتا ہے۔ یہ نہیں کہ ضرورت کے سب علوم اور سب معلومات درسِ نظامی میں پورے حاصل ہو چکے، یہ ایک ایسی بات ہے جو اکثر درسِ نظامی کے فارغ التحصیل لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس لیے ایک عالم کے شایانِ شان خدمت میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ایسے علوم میں خصوصیت سے تاریخ، جغرافیہ اور تصوّف ہے جو درسِ نظامی میں درساً نہیں پڑھائے جاتے لیکن درسِ نظامی کی صحیح استعداد پیدا کر لینے والا ان کو مطالعہ کر کے اسی طرح سمجھ سکتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ مدارس سے فارغ التحصیل حضرات ان فنون کا مطالعہ اہتمام سے کریں خصوصاً تصوّف یعنی اصلاحِ نفس سے متعلق کتابوں کے مطالعہ کو وظیفۂ زندگی بنائیں جس کے بغیر علمِ دین کا مقصد حاصل ہوتا ہے نہ تعلیم و تبلیغ میں برکت پیدا ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں امام غزالیؒ کی کتابیں عموماً اور بالخصوص ہدایۃ البتدی، تعلیمِ دین، فاتح العلوم اور احیاء العلوم کی جلد رابع، علامہ ابن قیمؒ کی کتاب الجواب الکافی عن الدواء الشافی۔ اور کتب متقدمین میں سے رسالہ قشیریہ اور عوارف المعارف وغیرہ۔ اور آخری دور میں حکیم الامت سیدی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصانیف تعلیم الدین، التشرف، قصد السبیل، امثل الاقوال وغیرہ اور آپ کے مطبوعہ مواعظ و ملفوظات اس معاملہ میں اکسیر ثابت ہوئے ہیں۔

(۷) رہا معاملہ موجودہ نصابِ مدارس میں اصلاح و ترمیم کا تو اس کے لیے انفرادی آراء کی اشاعت شاید مفید نہ ہو، یہ کام مدارسِ عربیہ کے ذمہ داروں کے اشتراک اور باہمی بحث و تمحیص کے بعد ہی کوئی مفید صورت اختیار کر سکتا ہے جس سے مدارسِ عربیہ کے نصاب میں ہم آہنگی اور اشتراک باقی رہے۔

(۸) آپ کے سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ "آپ نے تعلیمی زندگی میں

کن اساتذہ اور درسگاہوں سے خاص اثرات لیے؟ ایسے اساتذہ اور درسگاہوں کے امتیازی اوصاف؟"

اس میں جہاں تک درسگاہوں کا تعلق ہے وہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ صرف ایک درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں بچپن سے پچپن ۵۵ تک عمر گذاری ہے، اس کی خصوصیات محتاج بیان نہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں اور بیرونی ممالک میں بھی اس کی علمی ساکھ ہمیشہ مسلم رہی ہے اور جس چیز نے اس کو دنیا کی دوسری درسگاہوں سے ممتاز کیا وہ علم کے ساتھ عمل کی جامعیت ہے۔

میرے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے دارالعلوم کا وہ زمانہ دیکھا جبکہ اس کے مہتمم اور صدر مدرس سے لے کر ایک چپراسی اور دربان تک سب اولیاء اللہ تھے۔ دارالعلوم دن بھر قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں سے گونجتا تھا تو رات کو جگہ جگہ سے تہجد میں تلاوتِ قرآن اور ذکر اللہ کی دلنواز صدائیں سنائی دیتی تھیں۔

اور اساتذہ جن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کی دولت حق تعالیٰ نے اس ناکارہ کو نصیب فرمائی اُن کے امتیازی اوصاف بیان کرتا تو اس ناکارہ کے بس کی بات نہیں، قلم جب یہاں پہنچتا ہے تو ایک طرف محبت کا داعیہ قلم کے انتاد کو خود بخود تیز کرنا چاہتا ہے ؎

ایں زماں جان دامنم را تافت ست

بوئے پیراہاں یوسف یافت ست

دوسری طرف ان بزرگوں کی عظمت اور ان کے کمالات علمی و عملی کی وُسعت سے اپنے دامنِ فکر و نظر کو تنگ پاتا ہوں، خصوصاً اس وقت جبکہ میرے سب قویٰ جواب دے چکے ہیں، عمر کے آخری ایام لیٹ بیٹھ کر گذار رہا ہوں۔

ذرا غور کیجئے کہ ان حالات میں اپنے اساتذہ شیخ العرب والعجم استاذ الکل حضرت مولانا محمود الحسن شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ، حجۃ الاسلام والمسلمین حضرۃ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور عارف باخدا حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمنؒ، عالم ربانی حضرۃ مولانا سید اصغر حسینؒ میاں صاحب، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور دوسرے طبقہ میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب، حضرت مولانا رسول خانصاحبؒ جیسے اساطینِ اُمت بزرگوں کے امتیازی اوصاف پر قلم اٹھاؤں تو سمندر کو تیراکی کے ذریعہ پار کرنے کی مثال سے کیا کم ہوگا۔ اس وقت تو بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ع

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

اور یہ کہ ؎

تو لائے مرداں یک پاک بوم
برانگیختم خاطر از شام و روم

اور یہ کہ ؎

نازم بچشمِ خود کہ جمالِ تو دیدہ است
رفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی معیت آخرت میں نصیب فرماویں۔ آمین

وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

شیخ التفسیر حضرت العلّامہ

مولانا شمس الحق افغانیؒ

آج یکم ستمبر ہے، پندرہ یوم کی رخصت بوجہ ضعف و مرض کے لی گئی ہے ورنہ آج جامعہ میں حاضر ہونا تھا۔ آپ کے سوالات کا جواب آج لکھ کر ارسال کر رہا ہوں۔

لیکن مختصر دورِ عقلیت اور افرنجیت کے لیے آٹھ مصنّفین کی کتابیں مفید ہیں:
امام[1] غزالیؒ، امام[2] شاطبیؒ، حافظ[3] ابن تیمیہؒ، حافظ[4] ابن قیمؒ، اور ان چار کے بعد شاہ[5] ولی اللہؒ، شاہ[6] عبدالعزیزؒ، شاہ[7] اسمٰعیل شہیدؒ، مولانا[8] محمد قاسمؒ۔ ان آٹھ حضرات کی تصنیفات اہم ترین ہیں۔
ان حضرات کی تالیفات و سوانح اپنی جگہ معلوم و مشہور ہیں: امام غزالیؒ کی احیاء[1] العلوم، مکاتیب[2] غزالیؒ، والتبر[3] المسبوک فی نصائح الملوک علیٰ حاشیٔ کتاب سراج الملوک لابی بکر داطرطوشی)، المضنون[4] بہ علیٰ غیر اہلہ، معارج[5] القدس، التفرقہ[6] بین الاسلام دالزندقہ، قاصم[7] الباطنیہ، امام شاطبیؒ کی کتاب[1] الموافقات، والاعتصام[2]۔ امام ابن تیمیہؒ کی کتاب

منہاج[10] السنۃ النبویہ فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ، وکتاب[11] موافقۃ المعقول لصریح المنقول، الحسبۃ[12] فی الاسلام، السیاسۃ[13] الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیہ، الصارم[14] المسلول۔ امام ابن قیمؒ کی کتاب شفاء[15] العلیل فی القضاء والقدر والتعلیل، کتاب[16] الروح، حادی[17] الارواح الی بلاد الافراح، اعلام[18] الموقعین، احکام[19] اہل الذمۃ، الطرق[20] الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ۔ شاہ ولی اللہؒ کی کتاب حجۃ[21] اللہ البالغہ، ازالۃ[22] الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، الفوز[23] الکبیر، البدور[24] البازغہ، الخیر[25] الکثیر، عقد[26] الجید فی الاجتہاد والتقلید، الانصاف[27] فی بیان سبب الاختلاف۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی تفسیر فتح[28] العزیز، فتاوٰی[29] عزیزیہ، بستان[30] المحدثین، کمالات[31] عزیزی۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی کتاب عبقات[32]، منصب[33] امامت، الصراط[34] المستقیم، مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تقریر دلپذیر[35]، آب[36] حیات، حجۃ[37] الاسلام، قبلہ[38] نما ــــــــ

ان کتابوں سے میں متاثر ہوا اور ان سے میری لوحِ حیات پر یہ نقوش ثبت ہوئے کہ نبی اُمی علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت حِکم و اسرار کا مخزن ہے اور حقیقی حکمت و فلسفے کا گنجینہ ہے۔

(ب) ان کتابوں اور مصنفین کی تفصیلی خصوصیات کے لیے دفتر درکار ہے، ان سب میں اجمالی مشترک خصوصیات یہ ہیں: (۱) دینی احکام کی ایسی تشریح کرنا جس سے دل و دماغ متاثر ہو سکے۔ (۲) احکامِ شرعیہ کے عمیق فلسفہ اور اصولِ دین کی غامض حکمتوں سے پردہ ہٹانا۔ (۳) عقل پرستوں کی عقلی کجی کو دور کرنا اور ان کو صحیح راہ پر لانا۔ (۴) دورِ حاضر کی ضرورتوں کے مقتضیات کے مطابق اسلامی حقائق کی تعبیر کرنا۔ (۵) بیان میں تفہیم و تسلیم دونوں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنا کہ اسلامی مسئلہ کو سمجھایا بھی جائے اور منوایا بھی جائے۔ صرف مناظرانہ انداز میں مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش نہ کی جائے کہ ایسا کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں۔ اور یہی اسلوب کتاب و سنت کا ہے۔

(ج) تقریر و تحریر دو عظیم نعمتیں ہیں اور ذہنی انقلاب اور اصلاح نشری کے اہم ذرائع ہیں، اس لیے تقریری اور تحریری دنیا کے حُسن و قبح کا صحیح معیار میرے نزدیک، عوامی جذبات کی پرستش نہیں ہونا چاہیئے، وہ جرائد و مجلات کی فروخت کے لیے نفع بخش کیوں نہ ہوں بلکہ حسن کا صحیح معیار ذہنی و فکری اصلاح ہے کہ لوحِ فکر سے غلط نظریات کو معقول دلائل کے ذریعے مٹایا جائے اور حق اور صواب کو اس پر نقش کیا جائے۔ اگرچہ تجارتی معیار کے لحاظ سے اس میں خسارہ ہو۔ تجارتِ باقیہ تجارتِ فانیہ سے بدرجہا بہتر ہے ما عندکم ینفد و ما عند اللہ باق۔ اس قسم کے جرائد مغربی پاکستان میں بیّنات، الحق، البلاغ، انوارِ مدینہ ہیں۔

(د) میرے اساتذہ کرام میں سے کوئی زندہ نہیں، لیکن سب سے زیادہ اثر جو میری زندگی پر پڑا وہ میرے سب سے بڑے اور آخری شیخ و استاذ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری ہیں جن کے تبحّر علمی و تقویٰ عملی سے میں بے حد متاثر ہُوا، اور اب تک ہوں اور رہوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ آپ کی ذات تعریف سے بالاتر رہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ نے حضرتؒ کے متعلق یہ جملہ درست تحریر فرمایا: "ما رایت مثلہٗ قط ولا ھو رای مثل نفسہٖ۔ نہ میں نے اس کی نظیر دیکھی اور نہ خود انہوں نے اپنی نظیر دیکھی"۔ حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ "مولانا انور شاہ صاحبؒ جیسے عالم کا اسلام پر ہونا اسلام کی صداقت کی دلیل ہے"۔ آپ دار العلوم دیو بند کے صدر مدرس تھے۔

(ھ) اکابر اساتذہ دار العلوم اور خاکِ دار العلوم کی امتیازی شان بصیرت سے متعلق ہے نہ بصر سے، ان حضرات میں علوم ظاہری اور باطنی جمع تھے۔ ان کی ذات جامع الکمالات تھی۔

(و) ان کمالات کا محرر پر کچھ اثر تو نہیں ہے، البتہ ان حضرات سے مناسبت ضرور پیدا ہوئی ہے۔

(ز) جدید مسائل و حوادث کے لیے (۱) کتاب روح الدین الاسلامی لعبد الفتاح (۲) المقارنات الشرعیہ بین القوانین الوضعیہ المدنیہ والتشریع الاسلامی للسید عبداللہ (۳) قصۃ الایمان بین الفلسفہ والعلم والقرآن لابن ندیم الجسر والرسالۃ الحمیدیہ لحسین الافندی۔

(ح) قادیانیت کی تردید میں بہترین کتاب "قادیانی مذہب" الیاس برنی ایم اے کی ہے جو ہزار صفحات یا زیادہ پر مشتمل ہے اور خود مرزا صاحب کی تحریرات سے قادیانیت کی تردید ہے۔ یہ کتاب اس مذہب جدید کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ انکارِ حدیث پر کافی رسائل و کتابیں لکھی گئی ہیں، سب اپنے موضوع میں کسی حد تک مفید ہیں، آپ انتخاب کریں۔

(ط) معاشی مسائل اور سائنسی مسائل پر مکمل کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی کتابیں بھی مفید ہیں لیکن ابھی عملی حل کے لیے خلا باقی ہے۔ سائنس اور اسلام پر میں نے کچھ لکھا ہے لیکن ہجومِ امراض نے تعویق میں ڈال دی، لہٰذا تکمیل نہ ہو سکی۔

محدّث العصر حضرت العلّامہ

مولانا سیّد محمّد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

"علمی اور مطالعاتی زندگی" کے بارے میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کا پیش نظر مضمون نذرِ قارئین ہے جس میں سوالنامہ کی متعدد شقوں، علم و

مطالعہ اور نصابِ تعلیم سے متعلق کئی اہم گوشے واضح ہو جاتے ہیں۔ (مرتب)

عرصہ دراز سے دینی حلقوں میں مسئلہ نصاب تعلیم زیرِ بحث ہے اور شدّت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ موجودہ مدارس دینیہ عربیہ کا مروجہ نصاب قابلِ ترمیم ہے اور مسائل حاضرہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یہ نصاب کافی نہیں، امت کے مصالح اور وقت کے تقاضے اس سے پورے نہیں ہو سکتے بلکہ بہت سے ابنائے عصر اور جدید تعلیم یافتہ قدیم نصاب کی افادیت ہی سے منکر ہیں۔ یہاں تک کہ بعض غیر سنجیدہ دماغ تو ان علمی درس گاہوں کے وجود کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں

جہاں تک اصل موضوع بحث کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ وقت کی دوسری اہم ضرورتوں کی طرح یہ مسئلہ بھی اہم اور بے حد توجہ کا مستحق ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے، خیالات بدل گئے، قوموں کی نفسیات بھی تبدیل ہو گئیں، سائنس کی ترقیات نے معاشیات و اقتصادیات کی نئی راہیں کھول دیں۔ فقہ اسلامی کے ابواب میں تمدن

حاضر کے بہت سے جدید ابواب کا اضافہ ہوا، ممالک خارجہ سے تجارت درآمد کے نئے وسائل اور بینکوں کے نظام نے اسلامی نقطہ نگاہ یا شرعی نظام کے راستے میں بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے اِن نئے افکار و خیالات جدید معتقدات اور مختلف علمی و دینی فتنوں نے جدید علم کلام کی اہمیت اور واضح کر دی۔ یہ خیالات سب درست اور بجا ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ جل ذکرہ نے بھی باوجود اپنی قدرت لامحدود اور علم محیط کے انبیاء کرام علیہم السّلام کے معجزات میں وقت کے تقاضوں کی رعایت فرمائی۔ عہد ابراہیمی میں صائبین بابل و نینوی کے طبیعین کا عروج تھا، اس لیے ابراہیم علیہ السّلام کو معجزہ بھی ایسا ہی عطا ہوا کہ صائبین اور طبیعین کے لیے باعث حیرت و اعجاز ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں سحر و شعبدہ بازی اور اس قسم کے فنون کا عام چرچا تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یونانی اطبا اور ان کے حیرت انگیز معالجات کا دور دورہ تھا۔ خاتم الانبیاء محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم کے عہد میں اگر سرزمین عرب میں فصاحت و بلاغت، قوت بیانی، شعر و خطابت کا شہرہ تھا۔ تو ایران میں خسروانہ کروفر و ایرانی تہذیب کا دل ربا منظر تھا، اور روماۃ الکبریٰ میں بازنطینی نظام و آئین کارفرما تھا، لیکن دنیا نے دیکھا اور بڑی حیرت سے دیکھا کہ ان طاغوتی طاقتوں کو رب العلمین کے بندوں کی معجزانہ کارفرمائیوں نے کیسی فاش شکست دے دی اور رب العلمین نے کیسے فصیح و بلیغ معجزانہ اسلوب و بیان میں کیسا محیر العقول دستور اور مکارمِ اخلاق کا کیسا جامع ترین نظام نامۂ حیات نازل فرمایا۔

اور پھر اسلام کی علمی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ ہمارے صالحین نے ہر دور میں وقت کے تقاضوں اور امت کی مصلحتوں کا کیسے خیال کیا۔ بلاشبہ اب بھی اسکی تقلید کرنے کی ضرورت ہے اور صحیح ضرورت ہے۔ عصری علوم کی ضرورت اور معاشی

اقتصادی وسیاسی مشکلات کی عقدہ کشائی کے سوال کی اہمیت بھی واضح ہے لیکن تعلیم قرآن، درس حدیث اور علوم عربیہ وغیرہ قدیم علوم و معارف کی جتنی اہمیت اب ہونی چاہیئے شاید ہی کسی دور میں اہمیت سمجھی گئی ہو۔ کسی مفید اور نافع علاج کی اہمیت اسی وقت زیادہ محسوس ہونی چاہیئے جبکہ مرض عام ہو اور ضرورت شدید ہو۔ ہماری انہی درسگاہوں سے اسی صدی میں ایسے ایسے اکابر اور امت کے ایسے ایسے رہنما پیدا ہوئے کہ تاریخ بجا طور پر ان پر فخر کرے گی اور دنیائے اسلام کی علمی تاریخ میں ان حضرات کے اسمائے گرامی سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ قدیم نصاب پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ حضرات سارے علوم عربیہ پڑھ لینے کے بعد عربی گفتگو پر قادر نہیں ہوتے، کتنے علماء کرام کے اسمائے گرامی پیش کیے جاسکتے ہیں جو بلا تکلف فصیح ترین عربی لب ولہجہ میں گفتگو کی مقدرت رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بولنا خاص ممارست و تمرین ومشق پر موقوف ہے ہم نے ممالک اسلامیہ بلکہ خاص قاہرہ، مصر کے بہت سے علماء کو دیکھا کہ وہ فصیح و صحیح عربی پر ارتجالا پوری قدرت نہیں رکھتے بلکہ بعض بہترین لکھنے والے ادباء کو دیکھا کہ وہ بلا تکلف فصیح علمی زبان بولنے پر قادر نہیں جیسے وہ لکھتے ہیں بلکہ عام مروجہ عامیانہ زبان استعمال کرتے ہیں۔

تیسری چیز یہ کہ عربی علوم کو لسانیات کے طرز تعلیم پر نہیں پڑھایا جاتا بلکہ کتابیں علوم سکھانے کے لیے پڑھائی جاتی ہیں۔ اسی لیے ہمارے عربی نصاب کے ابتدائی درجات میں متعدد کتابیں صرف ونحو کی فارسی میں پڑھائی جاتی ہیں۔ الغرض یہ کہ علوم کو درجہ اولیٰ میں رکھا گیا ہے اور لسانیات کو ثانوی درجہ بلکہ ضمنی درجہ دیا گیا۔ اس لیے جو عربی بولنے لکھنے کو مقاصد میں شمار نہیں کیا گیا تھا۔ بہرحال یہ ایک

نقطہ نگاہ کا فرق تھا۔ انگریزی تعلیم میں زبان کو پہلے درجہ پر رکھا گیا اور جو اسلوب تعلیم زبان کے لیے مناسب ہو سکتا تھا وہی اختیار کیا گیا اور پھر دنیا میں جو ترغیبی وسائل اس کے لیے تھے وہ اس پر مستزاد، بے شک اب وقت کے تقاضوں کے پیش نظر اس اسلوب کو بدلنے اور عربی زبان کی تعلیم مقاصد میں شامل کر کے پہلے درجہ پہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

قدیم مروجہ نصاب پر ناقدانہ نظر اور اس کی خصوصیات

اس سے پہلے کہ ان وجوہ تنقید کا ذکر کیا جائے جو مروجہ نصاب مدارس عربیہ پہ ہو سکتے ہیں۔ یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اصل قصور نصاب کا نہیں بلکہ اسلوب تعلیم و منہاج تدریس کا ہے۔ نصاب کیسا بھی ہو اگر طرز تعلیم و طریقہ تربیت کی اصلاح کی کوشش ہوتی تو یقیناً عام طور سے جو نقائص محسوس ہوتے ہیں، یہ نہ ہوتے، مروجہ نصاب جس کو درس نظامی کہا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ تو چند صدیوں سے اصلاح و ترمیم کے بعد کی ایک مکمل صورت ہے۔ اس ملک کے مختلف ادوار میں کیا کیا نصاب رہا، اس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں اور زیادہ تر مقصد اس نصاب کا یہ تھا کہ اس کے پڑھنے سے سارے علوم نقلیہ و عقلیہ میں بحث و نظر اور تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے صحیح رسوخ پیدا ہو جائے اور قومی استعداد و قابلیت میسر آئے۔ یہ کبھی مقصد نہیں رہا کہ یہ درس اور یہ نصاب ان علوم کی آخری معلومات اور تفصیلی ابحاث کے لیے بھی کافی ہے لیکن اس میں شک نہیں اور بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قدیمی نصاب کا واقعی فاضل اور فارغ التحصیل ہر مشکل سے مشکل نظریہ اور جدید مسائل اور جدید علوم کو سمجھنے کی پوری قابلیت و اہلیت رکھتا ہے بطور مثال یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ قدیم بطلیموسی یا فیثا غورسی علم ہیئت

سمجھنے والا آج بھی یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ محض مطالعہ سے جدید ہیئت وجدید فلسفہ وسائنس کو سمجھے اور صرف مطالعہ سے ان مشکلات سے عہدہ برآ ہو۔ کیا شرح چغمنی، صدرا، شمس بازغہ اور شرح اشارات سمجھنے والا یہ قابلیت نہیں رکھتا کہ جدید طبیعات وریاضیات کی جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں انہیں سمجھ سکے؟ یقیناً رکھتا ہے۔ کیا غزالی اور ابن رشد کی تہافۃ الفلاسفہ کو سمجھنے والا ان جدید تالیفات کو نہیں سمجھے گا، یقیناً سمجھے گا۔ اگر قصور ہے تو مطالعہ کا ہے اور نقص ہے تو توجہ نہ کرنے کا بلکہ ان جدید کتابوں کا اسلوب اتنا شگفتہ اور بیان اتنا واضح ودلکش ہوتا ہے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ہم نے دیکھا کہ جب مصر سے الدروس الاولیۃ فی الفلسفۃ الطبیعیۃ چھپ کر آگئی تو حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری دیوبندیؒ نے اساتذہ دارالعلوم کو پڑھائی تاکہ جدید طبیعات سے ابتدائی واقفیت ان حضرات کو بھی ہو جائے اور ہم نے دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب کو صرف مطالعہ ہی سے ان جدید علوم ریاضیات وطبیعات کی اتنی ہی معلومات تھیں جتنی کسی فن کے ماہر ومتخصص ہی کو ہوسکتی ہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ بعض نظریات یا تحقیقات جو اب تک انگریزی یا جرمنی وغیرہ یورپ کی زبانوں سے عربی میں منتقل نہیں ہوئے ان کا علم بغیر ان زبانوں کے حصول کے نہ ہوسکے۔ لیکن اس میں قصور فن یا استعداد کا نہیں بلکہ زبان کا ہوگا۔

غرض یہ کہ جہاں تک قابلیت واستعداد کا تعلق ہے۔ سابقہ نصاب سے زیادہ معیاری نصاب شاید ہی پیش کیا جاسکے۔ اگر صحیح طریقہ سے سمجھ کر ان علوم کو اور ان سارے فنون کو حاصل کیا جاوے تو ایک غبی ذکی فاضل بن سکتا ہے اور ذکی شخص ایک محقق روزگار بن سکتا ہے۔ اگر کسی کی تحصیل ہی ناقص ہے جملہ علوم وفنون حاصل ہی نہ کیئے تو نصاب کا کیا قصور!!

سوال تو یہ ہے کہ ان قدیم علوم و فنون کو اور اس نصاب کو کسی نے باقاعدہ حاصل کیا اور صحیح معنے میں تکمیل کی تو یقیناً جو جامعیت و قت نظر اور رسوخ فی العلم اسے حاصل ہوگا، اس کی نظیر کہیں اور مشکل سے ملے گی۔ بہرحال جو کچھ عرض کیا گیا اس کے صحیح ہونے کے باوجود عربی مدارس کے نصابِ تعلیم کی تجدید و ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنے زمانے میں کافی نہ تھا یا صحیح استعداد پیدا کرنے سے قاصر تھا بلکہ مزید علوم جدیدہ یا معلوماتِ عامہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ وقت کے تقاضے بدل گئے، طبیعتوں کے سانچے بدل گئے اذواق و افکار میں فرق آگیا، عبارتی دقت اور موشگافی کے لیے مزاجوں میں صلاحیت نہیں رہی۔ اب بہت اختصار کے ساتھ ان لفظوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے یہ تبدیلی یا ترمیم ضروری ہے۔

مدارس دینیہ عربیہ میں اس وقت جو نصابِ تعلیم رائج ہے، حدیث و فقہ کی چند کتابوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد زیادہ تر ساتویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے قرون کی یادگار ہے جہاں سے صحیح معنے میں انحطاط کا دور شروع ہو چکا تھا۔ قدماءِ امت کی وہ تالیفات جن میں علم کی روح موجود تھی، عبارت سلیس و شگفتہ، مسائل و قواعد واضح، جن میں نہ عبارتی تعقیدات تھیں، نہ دور از کار ابحاث۔ جن کے پڑھنے سے صحیح معنے میں دل و دماغ متاثر ہو سکتے تھے، نہ وقت ضائع ہوتا تھا، نہ دماغ پر بوجھ کا خطرہ ہوتا تھا، ان کی جگہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں سب سے زیادہ کمال اختصار نویسی کو سمجھا گیا، زیادہ زور لفظی بحثوں پر دیا گیا لفظی موشگافیاں شروع ہوئیں، یوں اگر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کاغذ تو کم خرچ کیا گیا، لیکن وقت و دماغ کو اس کے حل پر زیادہ صرف کیا گیا، بڑا کمال یہی سمجھا گیا کہ عبارت ایسی دقیق و غامض ہو جس کے لیے شرح

وحاشیہ کی ضرورت ہو۔ کئی کئی توجیہات کے بغیر حل نہ ہو، آخر یہ علمی عیاشی نہیں تو اور کیا ہے۔ میرے ناقص عیال میں یہ علم کا سب سے بڑا فتنہ تھا، جس سے علوم اور اسلامی معارف کو بڑا نقصان پہنچا۔ بطور مثال اسلامی علوم میں اصول فقہ کو لیجیے جو علوم دین اور علوم اجتہاد میں ایک لطیف ترین اور اہم ترین فن ہے، جو قرآن وسنت سے نئے نئے استنباطات کے لیے سب سے اہم راستہ تھا جس کی باقاعدہ تدوین کا فخر دولت عباسیہ کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ کو حاصل ہے اور امت میں اس کے بعد سب سے پہلی کتاب امام محمد بن ادریس الشافعی کی کتاب الرسالہ ہے جو عرصہ ہوا کہ مصر میں کتاب الام کے ساتھ چھپ چکی تھی اور اب کچھ عرصہ ہوا بہت آب وتاب سے دوبارہ قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔ اسی فن میں امام ابو بکر رازی جصاص (متوفی ۳۷۰ھ) نے کتاب الفصول فی الاصول لکھی جس کا ایک عمدہ نسخہ دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے، اور جس کی نقل راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی ڈابھیل۔ حال کراچی کے لیے ہندوستان و پاکستان آئی۔ امام فخر الاسلام بزدوی نے کتاب الاصول لکھی جس کی عمدہ ترین شرح عبد العزیز بخاری کی ہے جو ترکی کے سابق دار الخلافہ سے دو دفعہ شائع ہوئی اور جس کی محیر العقول عظیم ترین شرح امیر کاتب عمید الدین اتقانی کی "الشامل" دس جلدوں میں دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے اور اس کا ایک نسخہ استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں ہے لیکن افسوس کہ دونوں جگہ ابتدائی دو ڈھائی جز کا نقص ہے۔ اس کی نقل بھی راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی میں آ چکی ہے۔ امام شمس الائمہ سرخسی نے کتاب الاصول لکھی جس کے نسخے ترکی و مصر میں موجود ہیں۔ یہ اور اس کے علاوہ اس فن میں متقدمین کی عمدہ و نافع کتابیں ہیں۔ امام حجۃ الاسلام غزالی کی "   الاصول" اس

فن کی عمدہ کتاب ہے اور اس کے علاوہ اس فن میں امام ابو زید دبوسی کی کتاب "تقویم الادلۃ" بے نظیر ہے۔

اب خیال فرمائیے کہ ایسی نادرۂ روزگار کتابوں کی جگہ امام ابن ہمام کی "تحریر الاصول" اور ابن حاجب کی مختصر الاصول اور بیضاوی کی منہاج الاصول یا ابو البرکات نسفی کی منار الاصول یا صدر الشریعۃ کی تنقیح الاصول نے لی۔ اگر تحریر الاصول کی شرح التحبیر والتقریر ابن امیر الحاج کی نہ ہو یا التیسیر ابن امیر بخاری کی نہ ہو اور قاضی بیضاوی منہاج شرح الاسنوی کی نہ ہو تو یہ چیستانیں امت کے کیا کام آسکتی ہیں؟ یہ مانا کہ ان میں کچھ دقیق و لطیف انکے مختارات یا خصوصی ابحاث بھی ہیں، لیکن دوسری طرف مہمات جس تعبیر میں ادا ہوئی ہیں وہ کوئی علمی روح پیدا کرنے کے لیے مفید نہیں ہو سکتیں۔

اسی طرح صرف ونحو، معانی، بیان، فلسفہ، فقہ وتفسیر ادب وغیرہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو سب کا حاصل یہی نکلے گا۔ مروجہ درسیات میں ایسی کتابیں داخل ہیں جن میں پوری داد تدقیق دی گئی اور ایجاز و اختصار کا ریکارڈ قائم کیا گیا ہے۔

بیشک ذہن کی جلا، دقت نظر اور موشگافی کے کمال کو حاصل کرنے کے لیے یہ موزوں ترین ہوں تو ہوں۔ لیکن عہد حاضر میں ان کے جو نقائص محسوس ہوئے ہیں۔ ان میں سے بطور مثال چند پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ان کتابوں میں زیادہ تر دقت لفظی مباحث اور عبارتی موشگافیوں پر خرچ ہوتا ہے۔

۲۔ فن کے قواعد اور مسائل کے یاد کرنے کی بجائے مصنف کے مقصد سمجھنے پر وقت ضائع ہوتا ہے۔

۳۔ فن کے قواعد اور مسائل یاد ہو جاتے ہیں اس سے جو ایک اعلیٰ سلیقہ اور ملکہ پیدا ہوتا ہے اور جو ایک خاص قسم کی بصیرت حاصل ہونی چاہیئے ان مختصرات سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

۴۔ صرف ان کا پڑھنے اور پڑھانے والا بہت مشکل سے اس فن کا محقق و بالبصیرت عالم بن سکتا ہے۔ مدرس کا سارا وقت اس لفظی اور عبارتی تعقیدات کی نذر ہو جاتا ہے اور اس میں نکتہ آفرینی کو کمال سمجھنے لگتا ہے۔ اس کو اتنی فرصت ہی نہیں مل سکتی کہ اس فن کی امہات اور اساسی تصنیفات کا مطالعہ کر سکے۔

۵۔ مشکل پسندی کا ذوق ختم ہو چکا ہے۔ صرف و نحو کے مسائل میں فقہ و اصول کی عبارات میں ہئیت و ریاضی کی مثالوں کے قائم کرنے کا دور گزر چکا ہے۔

۶۔ بہت سے دیندار حضرات کو ان علوم اسلامیہ کے حاصل کرنے کا ذوق دامنگیر ہوتا ہے۔ لیکن جب ان مشکلات کا احساس ہوتا ہے تو گھبرا کر مجبوراً اپنے ارادہ کو شرمندۂ عمل نہیں کر سکتے۔

۷۔ جو شخص ذکی الطبع اور ذہین نہ ہو یا محنتی نہ ہو وہ ان کتابوں سے مستفید نہیں ہو سکتا۔

۸۔ متن اور اس پر شرح اور پھر شرح کا حاشیہ یہ اسلوب عصر حاضر کے ذوق کے بالکل خلاف ہے۔

۹۔ ان کتابوں میں اختصار کی وجہ سے فن کے بہت سے اہم مسائل اور جزئیات نہیں آسکتے اور جتنے آسکے اختصار کی وجہ سے اس کے اطراف و جوانب اتنے واضح نہ ہو سکے۔

۱۰۔ علم کلام جدید فلسفہ جدید علم الاقتصاد اور بعض جدید علوم سے قدیم

نصاب کا دامن خالی ہے اور آج اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جس طرح پہلے جہمیہ، حشویہ، خوارج، معتزلہ و قدریہ صحیح مسلک سے ہٹے ہوئے اور باطل فرقے پیدا ہوئے تھے اور جس طرح ان کے عقائد اور ان کی تردید دین کا اہم جز تھا۔ اسی طرح آج لادینی نظام حیات اشتراکیت و فسطائیت وغیرہ کے مسائل پر قواعد اسلام کے پیش نظر، نقد و تبصرہ دین کا اہم جز ہے۔ آج اگر ہمارے اسلاف زندہ ہوتے تو جس طرح اس وقت فرق باطلہ کی تحقیق و تنقیح کے بعد امت کے لیے اسلحہ تیار کر کے دے چکے تھے اسی طرح آج بھی جدید اسلحہ دفاع کے لیے تیار کرتے اور علوم کا بیش بہا اضافہ فرماتے۔

اس ضمن میں سرسری طور پر چند موٹی موٹی باتیں عرض کی گئی ہیں۔ اگر ہم ان اشارات کو اور اختصار سے پیش کرنا چاہیں تو اس کا خلاصہ دو چیزیں ہیں۔

الف۔ قدیم علوم کی کتابوں میں اکثر مروجہ کتابوں کی تبدیلی

ب۔ جدید علوم کا اضافہ

اگر غور کیا جائے تو ہمارے مدارس میں بیس بائیس علوم کی تقریباً سو (۱۰۰) کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن پر کم از کم آٹھ سال کا عرصہ لگتا ہے۔ ان پر جہاں تک راقم الحروف نے غور کیا بمشکل دس کتابیں ایسی ہیں جن کا ہمیں بدل نہیں ملے گا۔ بقیہ سب کا نعم البدل قدماہی کی کتابوں میں مل سکتا ہے ہم ان قدیم علوم کو ہٹانا نہیں چاہتے بلکہ ان علوم میں صحیح مہارت و قابلیت پیدا کرنے کے لیے بہتر کتابوں کو داخل کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ہم اس سلسلہ میں "تجدد" نہیں بلکہ "تقادم" چاہتے ہیں۔ اور یہ ان علوم اسلامی کی خیر خواہی کے لیے چاہتے ہیں اور امت حاضرہ کے مفاد کے پیش نظر یہ خواہش رکھتے ہیں۔

اب میں جن لفظوں کے پیش نظر جن خطوط پر جدید نصاب کی بنیاد یا قدیم

نصاب کی ترمیم کا خواہشمند ہوں ان کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جدید نصاب تعلیم اور اس کی خصوصیات

جدید نصاب تعلیم میں جو بنیادی خطوط ہیں میرناقص خیال میں اس کے تین نقطے ہیں۔

(الف) **تخفیف**۔ یعنی نصاب مختصر ہو جس کی فراغت و حصول میں بہت زیادہ عرصہ کی ضرورت نہ ہو۔

(ب) **تیسیر**۔ یعنی نصاب میں مندرجہ کتابیں سہل و سلیس زبان میں ہوں، پیچیدہ و دقیق نہ ہوں۔

(ج) **محو و اثبات یا اصلاح و ترمیم**۔ یعنی بعض غیر اہم فنون کو ساقط کر کے جدید مفید علوم کا اضافہ ہو۔

پہلے نقطے کی تشریح

نصاب جتنا مختصر ہو گا اس کے طالبین و شائقین میں حصول کا جذبہ زیادہ پیدا ہو گا۔ یہ درست ہے کہ مختصر نصاب سے بعض اوقات ہر طبیعت پوری طرح مستفید نہ ہو سکے گی لیکن اس کی تلافی کے لیے ایک مشترکہ عام نصاب کے بعد تخصیص و تکمیل (ڈاکٹریٹ) کے درجات مقرر کیے جائیں، جس کو جس فن سے زیادہ مناسبت ہو یا طبعی رجحان ہو اس کو وہ حاصل کر کے فن کا ماہر خصوصی بن سکے گا۔ مصر کے جامع ازہر نے جدید نظام تعلیم میں انہی اصولوں کا خیال کیا ہے اور جامع ازہر کے جدید نظام تعلیم میں تین کلیات (کالج) ہیں۔ (۱) کلیۃ اصول الدین۔ (۲) کلیۃ الشریعۃ (۳) کلیۃ الآداب پھر ہر کلیہ میں کچھ درجات تخصص (ڈاکٹریٹ) کے رکھے ہیں۔

میرے خیال میں تخصیص و تکمیل کے لیے حسب ذیل درجات ہونے چاہئیں

(۱) التخصص فی علوم القرآن والتفسیر (۲) التخصص فی علوم الحدیث (۳) التخصص

فی الادب والتاریخ (۴) التخصص فی الفقہ واصول الفقہ والقضاء والافتاء (۵) التخصص فی علم التوحید والفلسفۃ والمعقول (۶) التخصص فی علم المعیشۃ والاقتصاد (۷) التخصص فی علم الاخلاق والتصوف۔

سہ سالہ مختصر نصاب | اس ضمن میں میری ایک خواہش یہ ہے کہ ہمارے مرکزی مدارس میں جہاں علمی نصاب وعلمی تحقیقات کے لیے کوشش ہو اس کے ساتھ ایک ایسا مختصر نصاب ان حضرات کے لیے مقرر کیا جائے جو انگریزی تعلیم سے بقدر ضرورت فراغت پا چکے ہیں۔ وہ مدرس عالم بننا نہیں چاہتے بلکہ صرف اپنی دینی ضرورت کے پیش نظر قرآن وحدیث و اسلامی علوم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک سہ سالہ نصاب مقرر کیا جائے جس میں صرف ونحو، قرآن وحدیث فقہ وعقائد اور ادب وتاریخ تک علوم شامل ہوں ان کو پڑھ کر عربی زبان میں بولنے اور لکھنے کی قدرت کے ساتھ اپنی ضرورت کو پورا کر سکے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وقت کے اہم تقاضوں میں سے ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ بہت سے قلوب میں یہ تڑپ موجود ہے۔ جہاں اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ ایک انگریزی گریجویٹ عالم دین بن سکے۔ اس کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دینی ودنیوی تعلیم میں جو خلیج حائل ہے اور فریقین ایک دوسرے سے مسلک وخیال میں دو نقطوں پر الگ الگ ہیں ان میں اجتماع کی خوشگوار صورت پیدا ہوگی اور ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں گے اور خیالی ووہمی بدگمانیوں میں جو ہر فریق مبتلا ہے۔ یہ اختلاف بھی ختم ہو جائے گا۔ اس لیے اب ہمیں تین نصابوں کی ضرورت ہوگی (۱) ایک مدرس عالم کے لیے نصاب (۲) دوسرا ماہر خصوصی کے لیے نصاب (۳) تیسرا صرف دینی ضرورت کے لیے عالم بننے کا

نصاب۔

دوسرے نقطے کی تشریح

دوسرا نقطہ تیسیر کا تھا۔ اس کے متعلق گذارش یہ ہے کہ ہر زمانے کا ایک خاص مزاج اور خاص ذوق ہوتا ہے۔ جب علم کی صحیح ترقی ختم ہوگئی یا رک گئی یا یوں کہیے کہ معراج کمال تک ان علوم اسلامیہ اور مبادی علوم کا معیار جب بلند ہوا تو طبعی طور پر انحطاط لازمی تھا، اب سارا زور کمال تالیف کا معیار، قواعد کی تلخیص، مسائل کی تنقیح، عبارت آرائی، متن نویسی و ایجاز طرازی، اختصار کے نئے نئے اسلوب، لفظی موشگافی وغیرہ قرار پایا۔ علمی مسابقت کا میدان بھی بن گیا منظوم قواعد تیار ہونے لگے۔ مبادی و وسائل مقاصد بن گئے۔ علوم عربیت کا مقصد قرآن و حدیث کے لغوی ترکیبی اور اعرابی مشکلات کا حل تھا لیکن آگے چل کر یہ مبادی خود مقاصد بن گئے۔ قرآن و حدیث کی تراکیب اپنی جگہ رہیں۔ خود ان کتابوں کے مسائل و عبارات مرکز توجہ بن گئے۔ ابن حاجب کے کافیہ کو لیجئے جس کی پچاس سے زیادہ شرحیں لکھی گئیں، پھر شرح ملا جامی جو ان شروح میں سے ایک شرح ہے۔ اس کے حواشی اور شروح کے لیے ایک دفتر چاہیئے۔ اس پر اس کی شرح عبدالغفور کو لیجیئے۔ پھر اس کا تکملہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور ان دونوں کی شرح "دافع الغوہمات"، کو دیکھیے، اسی طرح ابن مالک کی "الفیہ" اس کی شرح اور ان میں سے شرح "شرح"، اور پھر اس کی شرح "صبان"، سات ضخیم مجلدات میں دیکھیئے کہ ساری عمر انہی کے مطالعہ کی نذر ہو جائے۔ آخر غور کیا جائے کیا یہ مبادی واقعی اتنی توجہ کے مستحق تھے؟ بہرحال جو کچھ ہوا ایک خاص دور کا تقاضا تھا اور ذوق طلب تھا جو پورا ہو گیا۔ اسی طرح بقیہ علوم و بقیہ کتب کی حالت کو قیاس کر لیجیے۔ اب نہ تو طبائع میں وہ جولانی رہی اور نہ وہ جفاکشی، محنت و

عرق ریزی کی صلاحیت دماغوں میں رہی، نہ وہ فرصت وطمانیت رہی اور سب سے بڑی بات یہ کہ نہ اس کی حاجت رہی۔ مشکل پسندی سے فکر اکتانے لگی جدید کتابیں لکھی گئیں، ادب وانشاء کا طرز و اسلوب بدل گیا۔ قدما کی کتابیں پریس میں آنے لگیں۔ اہلِ عصر نے ہمت کرکے ذوقِ عصری کی تشنگی کے لیے جدید سانچوں میں ضیافتِ طبع کی خاطر عمدہ تصنیفات پیش کیں۔ اس ماحول میں اگر ہم اب بھی ان غیر اہم وسائل پر جمیں رہیں گے تو علوم اسلامیہ سے توجہات ہٹ جائیں گی اور ہمارا یہ طرزِ عمل ہمارے اکابر وسلف کی اس "تراث فاخر" اور اس علمی ثروت و سرمایہ کو فنا کے گھاٹ اتار دے گا۔ یہ درحقیقت علم کی خیر خواہی نہیں بلکہ نادان دوست کا سا طرزِ عمل ہوگا، کیا فقہ اسلامی میں کنز الدقائق، وقایہ، نقایہ اور شرح وقایہ کے بہترین بدل اسلاف کی کتابوں میں موجود نہیں، کیا جامع صغیر، جامع کبیر وغیرہ براہ راست مدون فقہ امام محمد بن الحسن الشیبانی کی کتابیں ہر حیثیت سے جامع نہیں ہیں؟ ان میں جو علم اور برکت ہوگی وہ ان متاخرین کی کتابوں میں کہاں سے ملے گی۔ میرے ناقص خیال میں کتب فقہ میں نور الایضاح، قدوری اور ہدایہ کے علاوہ بقیہ سب قابلِ تبدیلی ہیں۔

دیکھیے فلسفہ، منطق اور کلام کو لیجیے، امام حجۃ الاسلام غزالی کے چند رسائل محک النظر، معیار النظر، مقاصد الفلاسفہ الاقتصاد فی الاعتقاد، وغیرہ وغیرہ کے پڑھنے سے وہ مہارت پیدا ہو سکتی ہے جو بمشکل ان بڑی دقیق وطویل کتابوں سے حاصل ہوگی، غزالی کی حسن تعبیر، تفہیم اور حل مشکلات کی فوق العادۃ قدرت کا کیا دنیا کے مسلّمات میں شمار نہیں؟ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض مسائل فن کے غیر مذکور ہوں اور بعض غیر منقح ہوں، لیکن جتنے مذکور ہیں ان سے جتنی مہارت و مناسبت انشراح صدر و اطمینان قلب حاصل ہو سکتا ہے۔ متاخرین کی اکثر کتابوں میں وہ

روح کبھی نہیں مل سکتی، امام رازی، جو منطق و فلسفہ کے سب سے بڑے امام ہیں ان کی کتابیں نہایت سلیس شگفتہ عبارت میں امت کی جو رہنمائی و عقدہ کشائی کر سکتی ہیں وہ متاخرین کی کتابیں کبھی نہیں کر سکتیں۔ امام رازی کے لباب الاشارات، المحصل والاربعین کو دیکھیے۔ مصنف کو دل سے دعا دیجیے۔ کیا مشکلات کو مشکل تر بنانا یہ کمال ہے۔ یا مشکلات کو آسان بنا کر امت کے سامنے پیش کرنا کمال ہے یہ صرف چند مثالیں ناظرین کی خدمت میں پیش کی گئی ہیں۔ بہرحال تیسیر کو اختیار کرنا نہ صرف وقت کا اہم تقاضا اور امت حاضرہ کی اہم ضرورت ہے بلکہ علوم اسلامیہ کی صحیح خدمت ہے اور علوم سے پہلے دین اسلام کی خدمت ہے۔

فرض کیجیے کہ ہم نے کاغذ بچا کر ایک صفحہ میں اتنے اختصار کے ساتھ کسی مضمون کو ادا کیا جس کی تفصیل چند ورق میں ہو سکتی ہے، لیکن اس کے پڑھانے کے لیے مدرس کو ایک گھنٹہ کا وقت دینا پڑا اور کافی تمہید و تشریح کے بعد وہ مشکل حل ہوا، لیکن جہاں تشریح دماغ سے غائب ہوئی مضمون بدستور چیستاں رہا۔ اگر اس کے بجائے وہ مضمون دو صفحات میں ادا کیا جاتا اور سرسری نظر میں ذہن نشین ہو جاتا تو بتلائیے کون سا طریقہ بہتر ہوتا۔؟ غور فرمائیں بلاشبہ کاغذ روشنائی تو زیادہ خرچ ہوئی، لیکن وقت اور دماغ کم خرچ ہوا، گویا ہم نے اختصارات و ایجازات سے کاغذ پر تو رحم کیا لیکن دماغ جیسے لطیف جوہر اور وقت جیسے گرانمایہ سرمایہ کو بے رحمی سے خرچ کیا۔ کیا غزالی و رازی، تقی الدین ابن دقیق العید عزالدین ابن عبدالسلام، ابن تیمیہ، ابن القیم جیسے افراد روزگار محققین ان چیستانوں کی بدولت اذکیاء امت میں شمار ہوئے ہیں۔ کیا ان بزرگوں کی کتابوں میں ان متاخرین یا قرون وسطیٰ کے مشکل پسند طرز تعبیر کا کہیں پتہ ملتا ہے۔؟ یہ داستان طویل اور دردناک ہے، حاصل وہی ہے جو گزشتہ سطور میں پیش کیا گیا۔

تیسرے نقطے کی تشریح

تیسرا نقطہ جس کا ذکر کیا گیا وہ "محو و اثبات"، یا اصلاح و ترمیم ہے ۔۔۔ میری مراد اس سے یہ نہیں کہ یہ سارا دفتر پارینہ اور غرق مے ناب کر دینے کے لائق ہے ہرگز نہیں، بلکہ یہ علوم امتِ محمدیہ کا سب سے بڑا سرمایۂ حیات ہے۔ اس کی حفاظت، اس کی تربیت ابناء امت کا سب سے بڑا فرض ہے۔ مسلمانوں کے دین اور ان کے تمدن کی بقاء کے لیے ان علوم کا بقاء ایسا ہی ضروری ہے جیسے حیات، بدن کے لیے روحِ انسانی کا وجود بلکہ اس دورِ الحاد و دہریت میں ان کا تحفظ ان کی نشر و اشاعت کی ضرورت سابق سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل کر چکی ہے لیکن اس واقعی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ اس پُر فتن و پُر آشوب عہد میں نجات کی راہ، فلاح و ترقی کا صحیح میدان بھی علوم اسلامیہ ہیں یا یہی دین اسلام ہے، اس کے ثبوت کے لیے ہمیں کچھ اصلاح و تبدیلی کی ضرورت پیش آئے گی گذشتہ چند صدیوں سے جو علمی نظام یا علمی نصاب رائج ہو گیا ہے، وہ امت کی موجودہ سمیت کے لیے تریاق نہیں بن سکتا، جو امراض پیدا ہو چکے ہیں ان کی شفایابی کے لیے یہ کافی نہیں ہے۔

گذشتہ رائج نصاب، تعلیم میں قرآن مجید، علوم حدیث، تاریخ اسلامی، سیرت نبویہ، ادب و علوم بلاغت کو وہ اہمیت حاصل نہیں تھی جو بقیہ علوم و فنون کو حاصل تھی۔ نصابِ تعلیم میں اولیت و اہمیت کا درجہ ان علوم کو حاصل ہونا چاہیئے بقیہ علوم کو ثانوی درجہ میں رکھنا چاہیئے، عربی ادبی زبان میں گفتگو، خطابت، انشاء ان کو بھی اہمیت نہیں دی گئی لیکن اب وقت کا اہم تقاضا ہے کہ ان امور کو سب سے پہلا درجہ نصاب میں شامل ہونا چاہیئے۔

لسانیات ہی کے طرز تعلیم پر عربی ادب کی تعلیم و تربیت ہونی ضروری ہے۔ جدید ادبی اسلوب جس میں فرانسیسی ادب کے اسلوب سے استفادہ کیا گیا

ہے۔ جس میں غضب کی جاذبیت و عجیب شیرینی ہے۔ اور ادب کا یہ اسلوب قدیم تر اسلوب سے بہت قریب ہے۔ جاحظ، ابن المقفع اور عہد مامون کے ادبی اسلوب کا ذخیرہ امت کے سامنے موجود ہے، بلکہ احادیث نبویہ کا اسلوب بیان اور فصحا صحابہ کا طرز بیان خطباء عرب کا قدیمی اسلوب بہت ہی متقارب ہے۔

تیسری چوتھی صدی تک تقریباً یہی اسلوب بیان تھا، بعد میں بدیع الزمان ہمدانی کے مقاماتی انشاء ادب نے پھر حریری کے پر تکلف سجع بندی نے اس ادب کا خاتمہ کر دیا، لیکن پھر بھی قرون متوسطہ میں جستہ جستہ ادباء کا یہی طرز رہا۔ غرض یہ کہ الادب الحدیث یا الادب الجدید قدیم ترین اسلوب سے بہت اقرب و اشبہ ہے اور اسی میں مہارت و قابلیت و امتیاز پیدا کرنے سے قرآن و حدیث کی زبان کی شیرینی محسوس ہو سکتی ہے۔ اگر ہمارے نصاب تعلیم میں جاحظ اور ابن قتیبہ و ابن المقفع کی کتابیں نہ سہی کم از کم الشریف الرضی کی نہج البلاغۃ ہوتی۔ جب بھی ادبی ذوق میں اتنا انحطاط نہ ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ قدیم علوم کی بہت سی کتابوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور بجائے متاخرین کے قدماء کی کتابوں و مصنفات میں بہترین بدل موجود ہے منطق، قدیم فلسفہ اور قدیم کلام میں بہت سرسری معلومات بھی کفایت کر سکیں گی۔ تنقیح کے ساتھ قواعد و مصطلحات کا علم کافی ہو گا۔ اور ان کی جگہ تکمیل کے لیے جدید علم کلام اور جدید علم ہیئت و ریاضی و اقتصادیات کو دینا چاہیئے — اس نصف صدی میں ان علوم کا کافی ذخیرہ عربی میں آچکا ہے۔ لیکن بہت سے گوشے ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں۔ تاہم جتنا ذخیرہ عربی میں مدون ہو چکا ہے۔ اس سے مستفید ہونا چاہیئے۔ بعض عمدہ کتابیں اردو میں ملیں گی ان کو داخل نصاب کیا جائے۔ اس وقت اس موضوع کی تفصیل مقصود نہیں صرف اصولی بحث ملحوظ ہے، جس وقت

نصاب کی تعیین کا مسئلہ پیش نظر ہو گا اس وقت مزید تبصرہ کی ضرورت ہو گی تاکہ "نصاب جدید" میں فیصلہ کن اقدام ہو سکے۔ یہ چند منتشر پراگندہ تصورات تھے جو ناظرین کی خدمت میں "جہد المقل و موءۃ" پیش کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں۔

ہم مدرسہ اسلامیہ عربیہ کراچی میں انہی اصول کے پیش نظر انہی خطوط پر نصاب کی بنیاد چاہتے ہیں۔ اور الحمدللہ کچھ جزئی ترمیم و اصلاح کا قدم بھی اٹھایا جا چکا ہے، جس کی تفصیل کی شاید اس وقت حاجت نہ ہو گی۔ اس نصاب تعلیم کیساتھ ایک جدید نظام تعلیم کی بھی ضرورت ہے۔ قدیم نصاب تعلیم پر اصرار کے بہت سے وجوہ و اسباب تھے۔ اور کچھ موانع و مشکلات بھی ہیں۔ اس وقت اس کو زیر بحث لانا غیر ضروری سمجھا گیا۔ اب اس کی بہت شدید ضرورت ہے کہ مفکر علماء ملت اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے جلد کسی مرکز پر جمع ہو جائیں اور متفقہ نصاب تعلیم جلد ملک و ملت کی درسگاہوں میں رائج کیا جائے اور کل پاکستان کا علمی نظام اور علمی نصاب تعلیم ایک ہی سلسلہ میں منسلک ہو اور اس سلسلہ کے تحزب و تفرق خلاف و اختلاف کو جلد ختم کیا جائے اور دین و علم کی خدمت کے لیے متفقہ آواز اٹھائی جائے۔ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ۔

مدارس عربیہ کا نصاب تعلیم جس طرح محتاج اصلاح ہے جس کا اجمالی خاکہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا گیا۔ اس سے کہیں زیادہ نظام تعلیم کی اصلاح کی حاجت ہے۔ نظام تعلیم سے میری مراد ایک وسیع مفہوم ہے جس میں طلبہ کی تربیت و نگرانی، طلبہ کا علمی معیار، طلبہ کا اخلاقی معیار، تدریس کا طریقہ۔ مطالعہ کا طریقہ۔ کن کن مضامین پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت۔ طلبہ کی ذہنی تربیت کے لیے کیا کیا ذرائع اختیار کیے جائیں۔ طلبہ میں علمی استعداد پیدا کرنے کے لیے ترغیب و ترہیب کے کیا کیا وسائل

ہونے چاہئیں۔ غرض صلاح و تقویٰ، علمی معیار، قابلیت، اخلاص و عمل کی روح کے پیدا کرنے کے لیے کن کن تدابیر کو کام میں لایا جائے۔ جب تک طلبہ کے قلوب میں امراض نہیں تھے، دماغوں میں جدوجہد کا جذبہ موجود تھا، طبیعتیں علمی مناسبت سے سرشار تھیں۔ اساتذہ میں اخلاص و تعلق مع اللہ کی روح جلوہ گر تھی اور تعلیم و تعلم دونوں کا مقصد خدمت علم و خدمت دین تھا یا کم از کم حصول علم صحیح تو ان تدابیر کی حاجت نہیں تھی، لیکن نقطۂ خیال بدل گیا۔ تعلیم کا مقصد حصول سند ہے یا حصولِ ملازمت۔ اساتذہ میں وہ روح نہ رہی، ان کا مقصد مشاہرہ کا حصول یا مہتمم کو خوش کرنا یا پھر طلبہ سے خراج تحسین کی سند حاصل کرنا۔ جب یہ امراض پیدا ہو گئے تو اب ضرورت ہے کہ انتہائی دل سوزی اور جانفشانی کے ساتھ اس کے علاج کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ سابق الذکر امور میں سے ہر ایک کافی تفصیل طلب ہے۔ لیکن یہاں چند اہم ترین امور کی اصلاحی تدابیر کا اجمالی خاکہ پیش کرنا ہے۔

تدریس کا طریقہ مدرسین حضرات کا طریقۂ تدریس یہ ہونا چاہیئے کہ کتاب کے مشکلات کو سادے الفاظ میں اور اختصار کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کریں تعبیر کے لیے عمدہ دلنشیں واضح طریقہ اختیار کریں۔ کتاب کے حل کرنے میں قطعاً تسامح سے کام نہ لیا جائے۔ حل کتاب کے بعد فن کی مہمات پر طلبہ کو متوجہ کیا جائے۔ جس مشکل کی تحقیق کسی نے عمدہ کی ہے، ان کا حوالہ دیا جائے اور طلبہ کو ان ماٰخذ سے روشناس کرایا جائے تاکہ مستعد و ذہین طلبہ اپنی معلومات کو آگے بڑھا سکیں۔ فضول و بیکار مباحث میں طویل طویل تقریر کر کے طلبہ سے دادِ تحقیق حاصل کرنا۔ یہ تدریس کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس کو کسی نہ کسی طریقہ سے ختم کرنا چاہیئے۔

۲۔ کتابوں کا اختتام اور اول سے آخر تک تعلیم میں تطابق

جو کتابیں ایسی ہیں جن کا ختم کرنا ضروری ہے، پوری توجہ کرنی چاہیئے کہ کتاب ختم ہو جائے۔ کوئی بحث رہ نہ جائے جب تک کتاب ختم نہ ہو جائے امتحان نہ لیا جائے۔ تا اختتام امتحان سالانہ مؤخر کیا جائے اور اس شکل پر قابو پانے کے لیے کتابوں کو تین حصوں پر تقسیم کرنا چاہیئے کہ سہ ماہی، ششماہی، سالانہ امتحان تک کہاں سے کہاں تک کتاب پہنچ جانا چاہیئے اس کا شدت سے انتظام کیا جائے ایسا نہ ہو کہ ابتداء میں ماہ دو ماہ بڑی بڑی تقریریں ہوں۔ اور آخر میں صرف ورق گردانی جس نے علم کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔

۳۔ جو اساتذہ جن کتابوں کے لیے زیادہ موزوں ہوں، علمی استعداد اور طبعی رجحانات کے اعتبار سے تقسیم اسباق میں اس کا خیال ضرور رکھا جائے۔

۴۔ ابتدائی دو سال کی تعلیم میں نتائج امتحانات میں نہایت سختی کی جائے۔ ناکامیاب کو قطعاً کسی مراعات کی بناء پر کامیاب نہ بنایا جائے۔

وسط اور انتہائی تعلیم میں معقول اعذار کی بناء پر تسامح قابل برداشت ہے لیکن ابتدائی تعلیم میں ہرگز ایسا نہ کیا جائے۔

۵۔ ابتدائی تعلیم اچھے اور تجربہ کار اساتذہ کے حوالہ کرنی چاہیئے جو مسائل کو عمدہ اور مفید ترین طریقے پر ذہن نشین کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ الغرض ابتدائی تعلیم کی عمدگی و پختگی پر بے انتہا توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ کو ابتدائی درجہ کا کوئی سبق بھی دیا جائے تو اس میں بہت فوائد و مصالح ہیں۔

۶۔ مدرسین کو اسباق اتنے دیئے جائیں کہ وہ مطالعہ و تدریس کی ذمہ داری

پر صحیح طریقے سے عہدہ برآ ہو سکیں جس کا اجمالاً اندازہ یہ لگایا جاسکتا ہے۔
ابتدائی درجہ کے اساتذہ کے پاس زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے تعلیم کے لیے ہوں، متوسط درجات کے لیے چار گھنٹے، آخری درجات کے لیے تین گھنٹے

۷۔ اساتذہ ایسے رکھے جائیں جو ہمہ تن مدرسہ سے وابستہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ صرف دو تین گھنٹے کا رسمی تعلق ہو یا کہیں اور ملازم ہوں۔ مدرسہ کے مصالح کے پیش نظر یہ صورت بہت اہم و قابل توجہ ہے۔

۸۔ اساتذہ کے انتخاب میں حسب ذیل امور معیار انتخاب ہوں۔
اخلاص و تقویٰ، صلاح و اعلیٰ قابلیت اور اس فن سے مناسبت جو اس کو حوالہ ہو، مدرسہ کے نظام سے وابستگی اور طلبہ کے تعلیمی و اخلاقی معیار کو بلند کرنے کا جذبہ، تدریس سے شوق۔ یہ سب باتیں بہت اہم ہیں۔ ان میں کسی ایک بات کی بھی کمی ہو تو صحیح کام نہ ہو سکے گا۔

۹۔ اساتذہ کو فن کی اعلیٰ کتابوں کی طرف مراجعت کرنی چاہیئے تاکہ عمدہ معلومات طلبہ کے لیے فراہم کر سکیں، الغرض مطالعہ و جد و جہد ضروری ہے تن آسانی و راحت کوشی سے صرف سابقہ معلومات پر اکتفاء نہ کرنا چاہیئے۔ طلبہ کے اندر علمی اعلیٰ معیار پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ اساتذہ اعلیٰ معیار کے ہوں۔

۱۰۔ جہاں تک مقدرت ہو طلبہ کو راحت و آسائش پہنچائی جائے اور طلبہ اتنے رکھے جائیں جن کی عمدہ خدمت ہو سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ان کی علمی نگرانی، درس میں حاضری، رات کا مطالعہ، امتحان میں سختی، ان سب باتوں میں کوئی رعایت یا مسامحت نہ اختیار کی جائے۔ باقاعدہ طلباء کے احوال کا تفقد رکھا جائے اور اس کے لیے انتظام ہو۔ اگر کوئی طالب علم سہ ماہی میں ناکام ہو اس کا کھانا بند کر دیا جائے اور اگر ششماہی میں بھی ناکام ہو تو آخر سال تک مزید

موقع دیا جائے۔ اگر سالانہ امتحان میں بھی نتیجہ ساقط رہا تو اسکو علیحدہ کر دیا جائے۔ ان امور میں تسامح و مراعات کرنا علم کو دفن کرنے کے مترادف ہے۔

۱۱۔ ابتدائی درجہ عربی کے طلباء کا ماہانہ امتحان لازمی قرار دیا جائے۔ مقدارِ خواندگی متعین کی جائے۔ کوشش ہو کہ اس حد تک کتاب پہنچ جایا کرے۔

۱۲۔ ہر درجہ کے مناسب مطالعہ کے لیے کوئی نہ کوئی کتاب منتخب کر کے متعلم کو دی جائے۔ اس کتاب کا امتحان سالانہ لازمی قرار دیا جائے۔

۱۳۔ طلبہ کی اخلاقی نگرانی، عادات کی اصلاح، دینی وضع کی پابندی بے حد ضروری ہے۔ باجماعت نماز کی پابندی سیرت وصورت کی تربیت واصلاح کی طرف پوری توجہ ہونی چاہیئے۔ ان امور میں تسامح سم قاتل ہے۔ غیر ذکی طالبعلم اگر محنتی ہو و صالح ہو اسکو برداشت کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ذکی، بدشوق و بداطوار ہرگز رعایت کے مستحق نہیں۔

۱۴۔ مدرسہ کے ضوابط ایسے ہوں کہ طلبہ خود بخود دینی وضع۔ صالحین کے شعار، لباس پوشاک، خورد ونوش، معاشرت وعبادت میں پابند ہو جائیں

۱۵۔ امتحانات میں مسابقت وتقدم کے لیے ترغیبی وظائف رکھے جائیں۔ سالانہ امتحان میں اعلیٰ کامیابی پر انعامات مقرر کیے جائیں، انعامات میں بجائے نقد رقوم کے عمدہ عمدہ کتابیں دی جائیں۔ اگر انعامی کتب میں ان کی علمی استعداد و طبعی خصوصیات کی رعایت رکھی جائے تو اور سونے پر سہاگہ کا کام دے گی۔ مثلاً حدیث میں اعلیٰ کامیابی پر حدیث کی کوئی عمدہ کتاب تفسیر میں اعلیٰ کامیابی پر تفسیر کی اعلیٰ کتاب دی جائے۔

۱۶۔ ہر سال کے امتحانات میں ایک پرچہ امتحان کا ایسا ہو جس سے عام اہلیت و قابلیت وعلمی استعداد کا پتہ چلے۔ کسی خاص کتاب سے تعلق نہ ہو۔ آخری فراغت

علوم کے امتحان میں یہ تشخیص بہت ضروری سمجھی جائے۔

۱۷۔ عربی ادبی زبان کی قابلیت مقاصد تعلیم میں شامل کرنی چاہیئے۔ ابتداء سے عربی انشاء نویسی کی مشق و تمرین کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ ایک گھنٹہ مخصوص تحریر عربی کا ہو جو ہر درجہ میں لازمی ہو۔ تین سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد چوتھی جماعت میں تدریس کی زبان عربی ہو۔ مدرس عربی میں پڑھائے طلبہ و اساتذہ کے سوالات و جوابات کا سلسلہ بھی عربی میں ہونا چاہیئے۔

۱۸۔ طلبہ میں عربی ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے عربی مجلات و صحف و جرائد کا اجراء لازمی ہے اور ایک دار المطالعہ کا قیام اس مقصد کے لیے ضروری ہے

۱۹۔ طلبہ میں تقریر و خطابت کی روح پیدا کرنے کے لیے ہفتہ وار جمعہ کی رات تقریر کرنے کے لیے مجلسیں قائم کی جائیں۔ ہر درجہ کے طلبہ کے لیے علیحدہ مجلسِ تربیت ہو اور ہر ایک مجلس کی نگرانی و تربیت ایک استاد کے سپرد ہو۔ آخری تقریر اس استاد کی ہو۔ ہر جلسہ کے لیے تقریر کا موضوع متعین ہو اور آخری استاد کی تقریر میں تقاریر پر تنقید و تبصرہ ہو۔ ہر ہفتہ وار مجلس کا وقت کم از کم تین گھنٹہ ہو۔

۲۰۔ مدرسہ میں طلبہ کی تکثیر جماعت و تکثیر افراد کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ کمیت قابلِ التفات نہ ہو۔ کیفیت پر توجہ مرکوز رکھی جائے۔ مستعدین کی قلیل جماعت غیر مستعد نااہل کے جمِ غفیر سے زیادہ قابل قدر سمجھی جائے۔ ارباب مدارس کو تکثیر سواد کے تنافس سے بے حد نقصان پہنچا۔ دس صحیح طالب علموں پر سالانہ بیس ہزار کا خرچ قابل برداشت ہونا چاہیے لیکن سو نااہلوں پر بیس ہزار کا خرچ بھی قابل مواخذہ ہے۔ الغرض خطرناک وبا کی شکل میں مدارس عربیہ دینیہ میں یہ مرض پیدا ہو گیا۔ اس کے علاج و تدارک کی طرف بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔

نظام تعلیم میں عوام کو مدرسہ کی امداد پر مائل کرنے کی بجائے علم و دین کی خیر خواہی مقدم ہونی چاہیئے. خالق کی رضا مخلوق کی رضا سے مقدم ہونی چاہیئے مخلوق کی رضامندی کی کوشش سے اور حق تعالیٰ کی رضا جوئی سے غفلت کے نتائج دینی و دنیوی خسران ہے۔

۲۲. مدرسہ کے سالانہ بجٹ میں امتیازی وظائف و انعامی کتب کی مد ضرور رکھی جائے ۔

مدارس دینیہ عربیہ کا نظام

دورِ حاضر میں علمی زوال کے لیے جتنے خطرے پیدا ہو گئے تاریخ اسلام کے کسی دور میں اتنے خطرے نہ تھے ۔موجودہ دور میں مدارس کے آپس کے اختلافات و رقابتوں نے یا غلط مسابقت و بیجا تحاسد و تباغض نے ان خطرات میں مزید اضافہ کیا بلکہ ان خارجی فتنوں سے زیادہ خطرناک یہ داخلی فتنے ہیں۔ اگر ان حریفانہ رقابتوں کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی گئی تو خاکم بدھن وہ دن قریب ہیں کہ سارے مدارس فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ مدارس عربیہ کے درمیان علمی مواسات اور علمی مواخات و علمی روابط ہوں۔ اس مقصد کے پیش نظر موثر ترین تدابیر اختیار کرنے کی حاجت ہے دوسروں کے لیے نہیں بلکہ اپنی خیر منانے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ اس وقت اس جاہ پسندانہ وضاحت سے مرکز کونسا ہو اور کیسا ہو اور کہاں ہو صرف نظر کر کے چند امور قابل توجہ ہیں ۔

۱. کراچی سے سرحد تک جتنے دینی مراکز ہیں آپس میں ایک متحدہ محاذ، متحدہ نظام، متحدہ مجلس شوریٰ بنائیں. سال میں دو مرتبہ جمع ہو جایا کریں اور اراکین متحدہ اپنے اپنے مدارس کے مصارف پر یہ سفر اختیار کر لیا کریں ۔

۲. ہر مدرسہ اپنا اپنا ایک نمائندہ منتخب کر لیا کرے۔ ان مندوبین کے اجتماعات
میں حسب ذیل امور زیر بحث آئیں
(الف) نصاب تعلیم (ب) نظام تعلیم (ج) ممتاز فارغ التحصیل حضرات کی
مکمل فہرست (د) ممتاز فارغ التحصیل حضرات کے لیے کوئی علمی مقام تدریس کا
تقرر (ھ) ایک مشترکہ فنڈ کا قیام (و) اس فنڈ سے ایک مطبع کا قیام (جس میں
مدارس کے نصاب تعلیم کی کتابیں طبع ہوتی رہیں) (ز) جو کتاب نادر ہے نہیں
ملتی یا طبع نہیں ہوئی اور نصاب تعلیم میں اس کی ضرورت ہے۔ اس کو مشترکہ
سرمایہ سے طبع کرا کر مدارس متعلقہ میں تقسیم کرائی جائے۔

۳. جس مدرسہ میں ممتاز شخصیت ہو اسکو ان مدارس میں جا کر علمی مشکلات
اور علمی نفائس پر تقریر کرنی چاہیئے۔ اور ان تقاریر اور ان خطبات کو شائع کرنا
چاہیئے ـــ الغرض اس قسم کے اسباب کو اختیار کیا جائے جس کے ذریعہ
غلط تحاسد کی فضا ختم ہو جائے اور آپس میں اتحاد ہو اور مشترکہ طور پر علمی
خدمت اور دینی خدمت میسر ہو



مولانا سمیع الحق مدظلہ

مدیر ماہنامہ "الحق"

نیرنگیٔ تقدیر کہ اکابر علماء اور مشائخ کی خدمت میں سوالنامہ کے مرتب حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہ کو گردشِ دوران نے قومی وملی اور سیاسی خدمات اور تحریک نفاذِ شریعت کے سلسلہ میں پارلیمانی مشاغل، مسلسل اسفار اور شبانہ روز مساعی کی وجہ سے احقر کے اصرار کے باوجود خود اپنے سوالنامہ کا جواب لکھنے کا موقعہ فراہم نہیں کیا۔ تاہم مولانا کی ماہنامہ "الحق" کیلئے بعض اہم ادارتی تحریروں میں پیشِ نظر سوالوں کا مفصل جواب مل گیا ہے جو ہر لحاظ سے دلچسپ اور نافع ہے۔ امید ہے کہ قارئین بھی اس سے حظ وافر حاصل کریں گے ——— (عبدالقیوم حقانی)

نظامِ دعوت و تعلیم کو موثر بنانے کی ضرورت

اس میں شک نہیں کہ ہمارا موجودہ نظامِ دعوت و اصلاح امت ارباب فکر و دانش اور اصحابِ بصیرت کی نہایت گہری سوچ و بچار کا مستحق ہے۔ بلاشبہ اب تک دینی اقدار اور اسلامی روایات کی جڑیں برِ صغیر میں بہ نسبت دیگر اسلامی ممالک کے کچھ گہری اور مضبوط رہیں۔ مگر یہ بات رسمی انجمنوں، اداروں اور جماعتوں یا تنظیموں سے زیادہ اصحابِ دعوت و عزیمت کے سوزِ دروں، جذباتِ اخلاصِ قوت اور جوشِ عمل، پاکیزگیِ کردار کی منت پذیر رہی اس وقت اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے لئے رسمی طور طریقوں کی نہایت فراوانی ہے۔ لٹریچر کا سلسلہ پورے عالمِ اسلام میں اتنا کبھی نہیں رہا، جتنا اب ہے۔ صرف عرب ممالک سے آئے دن نکلنے والی مطبوعات وہاں کے پٹرول سے زیادہ اُبل اُبل کر دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ صحائف اور مجلات کی بہتات ہے، ایک سے ایک بڑھ کر خطیب اور واعظ زورِ خطابت دکھا رہا ہے۔ دینی مدارس اتنے کبھی نہ تھے جتنے آج ہیں۔ جماعتوں اور تنظیموں کا دور دورہ ہے، گلی گلی اصلاحی اداروں اور سماجی انجمنوں سے آباد ہے۔ زبانی حد تک راعی سے لے کر رعیت سب اسلام کی حمد و ستائش میں رطب اللسان ہیں۔ تحقیق اور ریسرچ کے طویل الذیل منصوبوں کی بھی کمی نہیں، اور اس میں شک نہیں کہ اس تمام جہاد و جہد کے اثرات کچھ نہ کچھ ظاہر بھی ہو رہے ہیں اور اپنی جگہ ہر چیز کی افادیت مسلّم ہے۔ مگر ان تمام مظاہر اصلاح اور رسومِ دعوت کے باوجود نتائج نہایت بھیانک شکل میں آ رہے ہیں، خرابی، بھلائی پر اور بدی، نیکی پر غالب آتی جا رہی ہے۔ معاشرہ کی گاڑی عقائد، اخلاق اور آدابِ معاشرت کے لحاظ سے منزلِ مقصود کو گم کر چکی ہے اور ہماری یہ تمام کد و کاوش مادیت اور بے دینی کے طوفان کے سامنے تنکوں کا ڈھیر ثابت ہو رہی۔ اس لئے

لازمی طور پر یہ تمام امور امت کے برجستہ دماغ اور دلِ بیدار کے لئے سوچنے کے ہیں۔ خرابیوں کا سرچشمہ کیا ہے ؟ اگر اسے متعین کیا جائے اور پھر دعوتی کام کو اس کے مطابق مرتب کر لیا جائے تو کام کے نتائج ایسے نہ ہوں۔

اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ہمارے تمام تعلیمی، دعوتی اور تبلیغی کام ضعف و اضمحلال کی طرف جا رہے ہیں۔ ان سب چیزوں پر کسی ایک فہرست میں نہ تو بحث کی جا سکتی ہے، اور نہ ایک کم سواد کی تنگ داماں اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔ افادیت، اہمیت اور امت پر پچھلی چند صدیوں میں نہایت گہرے اور دور رس اثرات چھوڑنے کے لحاظ سے خالص اللہ کے توکل پر چلنے والے دینی مدارس پہلے نمبر پر آتے ہیں۔

دینی مدارس کی موجودہ حالت اور چند اہم سوالات | اس لحاظ سے اس کی موجودہ حالت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں معاصر البلاغ کراچی نے تازہ اداریہ میں اپنے نگارشات قلمبند کرتے ہوئے بجا طور پر بڑے اہم سوالات اٹھائے ہیں۔ چونکہ ہمارا تعلق بھی ایک دینی مدرسہ سے ہے اور ان تاثرات کو ہم اپنے دل کی ترجمانی سمجھتے ہیں۔ اس لئے اپنے حلقۂ قارئین کے اصحابِ فکر و بصیرت (خواہ ان کا تعلق قدیم سے ہے یا جدید سے) اور خاص طور سے اربابِ مدارسِ عربیہ کی توجہ بھی ان سوالات کی طرف مبذول کراتے ہوئے ایک اہم دینی ضرورت پر اظہارِ خیال کی دعوت دیتے ہیں۔

(۱) "ایک عام تاثر یہ ہے کہ ہماری موجودہ دینی درسگاہوں سے مؤثر علمی و دینی شخصیتوں کی تیاری تقریباً بند ہو رہی ہے۔ جناب کی نظر میں اس کے اسباب کیا ہیں ؟

(۲) موجودہ دینی مدارس کو دوبارہ مردم خیز اور امت کے لئے زیادہ نفع بخش بنانے کے لئے کون سے اقدامات آپ کی نظر میں ضروری ہیں ؟

(۳) محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہماری دینی درسگاہوں میں تعلیم و تعلم کا اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ براہ کرم نشاندہی فرمادیں کہ آپ کی نظر میں یہ مقصد کیا ہے۔ اور اہلِ مدارس میں اس کا استحضار کیوں کر پیدا کیا جا سکتا ہے، جو ان کے فکر و عمل پر اثر انداز ہو سکیں"۔

مدارس عربیہ کے سلسلہ میں یہ چند سوالات ایسے ہیں جن سے صرف نظر کرنا اور انہیں اپنے شبانہ روز غور و فکر کا محور نہ بنانا، پوری ملت کے دینی، علمی اور فکری ضعف و اضمحلال سے بے پروائی برتنے کے مترادف ہے۔

دینی مدارس علوم نبوت کے پاور ہاؤس اور انسانیت کی فیکٹریاں | پچھلی چند صدیوں سے بھی دینی مدارس اور آزاد دینی تعلیم ہی زیادہ تر ہماری حیات جاودانی کے سرچشمے بنے رہے کارگاہِ حیات میں ان کی حیثیت انسانی فیکٹریوں کی رہی اور یہ مدارس علوم نبوت کا ایسا پاور ہاؤس ثابت ہوئے جس کا ایک سرا نبوت محمدی اور دوسرا سرا ملت محمدیؐ سے وابستہ رہا ــــ اس کے ذریعہ ملت کی بڑ مردہ رگوں میں ایمان و یقین کی نئی حرارت دوڑتی رہی اور اس کی ضو افشانی سے الحاد، دہریت اور فاسد اعمال و عقائد کی ظلمتیں کافور ہوتی رہیں۔

تربیتی پہلو | ان مدارس سے نکلنے والوں میں بہت سی ایسی عبقری شخصیتیں تھیں جن میں ایک ایک کبھی کبھی پوری ملت پر بھاری ہو جاتی۔ اور آج مدارس کے اندرونی ماحول، خارجی اثرات، تربیتِ اخلاق، علمی رسوخ، کردار اور عمل کی بلندی، مقصد سے شیفتگی، اساتذہ اور طلبہ کے باہمی مخلصانہ روابط، غرض ہر لحاظ سے کمی آگئی ہے۔ جب کہ نئے حالات کی بنا پر مدارس اور ان میں ایسی چیزوں کی اہمیت رگِ جاں سے بھی بڑھ چکی ہے۔ اس لئے تمام اہلِ علم اور اصحاب دل حضرات کا اس ضعف و تنزل کے اسباب کی نشاندہی کرا کے تدبیرِ اصلاح پر توجہ دینا دین کی ایک اہم پکار پر لبیک کہنا ہوگا ــــ یہ تو مدارس کا تربیتی پہلو تھا۔

عصر جدید اور مدارس عربیہ کا نظام تعلیم | نظام تربیت کے علاوہ نظام تعلیم اور نصاب تعلیم بھی مدتوں سے توجہ طلب مسئلہ ہے۔ بلاشبہ موجودہ درس نظامی نے اپنے عہد کے لحاظ سے ہمہ گیری اور رسوخ فی العلم اور اس سے زیادہ ماحول اور تربیت کی بدولت ملت کو نابغۂ روزگار افراد دیئے۔ مگر عہدِ جدید اور اس کا علمِ جدید اس نصاب کا دامن نہایت وسیع کرنے کا طلبگار ہے۔ بیسویں صدی نے نہ صرف دیگر علوم بلکہ

اسلامی علوم وفنون، تاریخ، اسلامی فلسفہ، فقہ اور قانون سازی، اسلامی علم الکلام عمرانیات، لسانیات، سیاسیات، اقتصادیات، ہر چیز کے متعلق بحث واستدلال، غور وفکر اور مطالعہ وتحقیق کے نئے گوشے پیدا کر کے تمام زاویے اور طور طریقے کافی حد تک بدل دیئے ہیں۔ پھر اتنے ہمہ گیر اور شاخ در شاخ کہ جب تک کوئی عالم ان سے پوری مناسبت پیدا نہ کرے، وہ جدید علمی دنیا کا پورے شرح صدر کے ساتھ چیلنج قبول نہیں کر سکتا۔ اور یہ مناسبت صرف موجودہ نصاب سے پیدا ہونی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ تاریخ اب ایک منضبط سائنس ہے۔ جغرافیہ علم کی سینکڑوں شاخوں کو اپنے اندر سمیٹ چکا ہے ادب کا میدان علم وثقافت کے تمام اہم شعبوں پر حاوی ہو چکا ہے۔ جدید ادب عربی تحریر وتقریر ہر پہلو سے توجہ طلب بن گیا ہے۔ ریاضی علوم اور طبیعات، ثریٰ سے ثریا تک پہنچ چکے ہیں۔ منطق نئی ریسرچ اور بحث واستدلال کی شکل میں مراحل تکمیل کو چھو رہی ہے۔ فلسفے کے کئی مسلمات، مشاہدہ اور تحقیق سے غلط ثابت ہو چکے ہیں نئے مسئلہ نظریاتی اصول بھی آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ پھر اسلامی علوم وآثار پر کہاں کہاں سے گولہ باری ہو رہی ہے۔ اور کن حربوں سے کام لیا جاتا ہے۔ استشراق کے پردہ میں ایک مستقل علمی دنیا اسلام اور اسلامی علوم وشخصیات کو مشق ستم بنائی ہوئی ہے۔ قانون کی تدوین وترتیب اقوام عالم میں ایک مستقل فن بن چکا ہے۔

شراب کہنہ اور جام نو | الغرض اس صدی کے علمی تقاضے، علمی زبان، علمی طریق کار گویا ہر چیز کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ اسلام اور اس کے اصول ابدی اور غیر متبدل ہیں، نہ تحریف کے روادار نہ ترمیم کے، اور نہ تجدد کے۔ مگر علماء اسلام کو یہ شراب کہنہ جام نو میں پیش کرنے کی اہلیت بہم پہنچانی ہے۔ اس لئے کہ اسلام تو عیسائیت کی طرح میدان سے ہٹ کر عزلت نشینی کو غنیمت نہیں سمجھتا، وہ تو جامع کامل دین قوت مقابلہ سے بھر پور اور ہر دور میں نئے جوش اور ولولے سے معمور رہا ہے۔ اور آنکھیں ملا کر ہر دور کے افکار ونظریات کا چیلنج قبول کرتا چلا آیا ہے۔ اس لئے آج بھی ضرورت ہے کہ علماء کرام اور ہمارے علمی ادارے جدید آلات ووسائل اور علمی اوزار حرب وضرب۔

سے پوری طرح لیس ہوکر نئے تقاضوں کا سامنا کرسکیں۔ ہیں دور میں اللہ نے ابوحنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ، غزالیؒ، رازی، ابن تیمیہؒ، رومیؒ، ابن رشدؒ، شاہ ولی اللہؒ، محمد قاسم نانوتویؒ جیسے اہلِ فکر ونظر دیئے جن کی بدولت اسلام آج تک زندہ وتابندہ رہا۔ ضرورت ہے کہ نیا دور بھی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرکے یہ امانتِ علمی پچھلے دور سے بڑھ کر جوش وخروش اور شان بان کے ساتھ اگلی نسلوں تک پہنچا سکے ــــ مقابلہ شدید تر ہے اور ہر آنے والی گھڑی وقت کی نزاکتوں میں اضافہ کر رہی ہے۔ جنگ کا محاذ ہمہ گیر ہوتا جا رہا ہے علمی وفکری لحاظ سے نیا سے نیا اسلحہ میدان میں آرہا ہے۔ اور قرآنِ کریم واعدوالھم ما استطعتم من قوۃ کی صورت میں پکار پکار کر دعوتِ تیاری دے رہا ہے۔ الغرض نصاب کے سلسلہ میں بڑی وسعتِ نظر کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے تعلیم کی کل مدت کتنی ہونی چاہیئے۔ اس مدت کو کتنے حصوں میں کس طرح تقسیم کیا جائے، اہم اور لازمی مضامین اور اختیاری مضامین کا تعین اور پھر طریقہ تعلیم کے ساتھ مطالعہ، تصنیف وتالیف، مؤثر ترین دعوت اور اس کا طریق کار۔ الغرض صدہا گوشے ہیں جو بحث وتحیص کے مستحق ہیں۔ اسے حسنِ اتفاق کہئیے یا البلاغ کے اداریے کے ساتھ توارد فکر کہ علمی وفکری زندگی کے بارہ میں اکابر علماء اور چیدہ چیدہ اربابِ دانش کے تجربات وتاثرات سامنے لانے کے سلسلہ میں الحق نے بھی ایک سوالنامہ روانہ کیا۔ نصاب ونظام پر غور وفکر کرتے وقت اگر ان سوالات کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا تو اس سے بھی تعلیمی، مطالعاتی اور تربیتی امور پر کچھ روشنی پڑسکے گی۔

تعلیمی اور تربیتی پہلو کے بارہ میں چند اور اہم سوالات

(۱) آپ کو علمی زندگی میں کن کتابوں اور مصنفین نے متاثر کیا اور آپ کی محسن کتابوں نے آپ پر کیا نقوش چھوڑے۔

(۲) ایسی کتابوں اور مصنفین کی خصوصیات۔

(۳) کن مجلات اور جرائد سے آپ کو شغف رہا۔ موجودہ صحافت میں کون سے جرائد آپ کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔

(۴) آپ نے تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ اور درسگاہوں سے خاص اثرات لئے، اپنے اساتذہ اور درسگاہوں کے امتیازی اوصاف جن سے طلبہ کی تعمیر و تربیت میں مدد ملی۔

(۵) اس وقت عالم اسلام کو جن جدید مسائل اور حوادث و نوازل کا سامنا ہے اس کے لئے قدیم یا معاصر اہلِ علم میں سے کن حضرات کی تصانیف کار آمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

(۶) علمی، فکری اور دینی محاذوں پر کئی فتنے تحریفی، الحادی اور تجددی رنگ میں (مثلاً انکارِ حدیث عقلیت، اباحیت، تجدد، مغربیت، قادیانیت اور ماڈرنزم) معروف ہیں۔ ان کے سنجیدہ علمی احتساب میں کون سی کتابیں حق کے متلاشی نوجوان ذہن کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔

(۷) موجودہ سائنسی اور معاشی مسائل میں کون سی کتابیں اسلام کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔

(۸) مدارسِ عربیہ کے نصاب میں وہ کون سی تبدیلیاں ہیں جو اسے مؤثر اور مفید تر بنا سکتی ہیں۔

امید ہے اپنے مفید خیالات سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ (ستمبر ۱۹۸۳ء)

دورِ جدید کے مسائل

طلبۂ مدارس اور جدید دور کے مسائل وفاق المدارس العربیہ دینی مدارس کی ایک تنظیم ہے۔ دو ڈھائی سو مدارس عربیہ اس سے وابستہ ہیں۔ اس تنظیم کی نگرانی میں دورۂ حدیث شریف کے سالانہ امتحانات بیک وقت ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت حدیث کی مشہور کتاب مسلم شریف کا پرچہ سوالات ہمارے سامنے ہے جس میں طلباء سے دیگر فقہی و علمی سوالات کے علاوہ عصرِ حاضر کے آمدہ مسائل، تحدید نسل، عزل، عائلی قوانین کے ضمن میں طلاق ثلاثہ کا مسئلہ، ان معاشرتی قوانین کی شرعی حیثیت، احیاء ارضِ موات کے ضمن میں پنجاب اور سندھ کے انگریزی

دور کے مرتہوں اور جاگیروں کی شرعی پوزیشن اور حدیث نہی عن کراء الارض کے ضمن میں اشتراکیت کا تعاقب وغیرہ امور پر روشنی ڈالنے کے لئے کہا گیا ہے۔ ان مسائل میں عربی طلبا کی استعداد کا حال تو نتائج آنے پر معلوم ہوگا، مگر اس قسم کے سوالات سے طلبا اور اساتذہ مدارس عربیہ کو جدید مسائل اور عصر حاضر کی ضرورتوں پر تنبیہ ہو جانی چاہیے۔ بلا شبہ آپ قرأت خلف الامام، آمین بالجہر، امتناع نظیر اور امکان کذب جیسے مسائل پر بھی بحث و تمحیص کرتے رہیں۔ البتہ دور جدید کی ضرورتوں کا تقاضا ہے کہ کتاب و سنت پڑھاتے وقت جدید حوادث و نوازل پر غور و تحقیق اور طلبا کو اس سے متعارف کرانے کا خاص خیال رکھا جائے۔ اسلام دین ابدی ہے اور ان تمام مسائل کا صحیح حل علماء ہی پیش کر سکتے ہیں۔ اور انہیں عصر حاضر کے چیلنج دینا ہے۔ دسمبر ۱۹۶۷ء

دینی مدارس اور لادینی قوتیں

اخبارات میں یہ خبریں آچکی ہیں کہ حکومت اب دینی مدارس کو بھی اپنی تحویل میں لینا چاہتی ہے اور اس کے ساتھ ہی محترم وزیر مذہبی امور نے بھی خطباتِ جمعہ کو سرکاری ہدایات کا پابند بنانے کے لئے ایک "حسین" منصوبہ پیش کر دیا ہے۔

منبر و محراب کے ساتھ مسجد و مدرسہ کو بھی آمریت کی لونڈی بنا دینے کے یہ ارادے نئے نہیں بلکہ اسلامی خلافت کے ملوکیت سے بدل جانے کے بعد ہر دور کی لادینی طاقتوں کی ایک دیرینہ حسرت رہی ہے۔ یہ حسرت انگریز سے پہلے بھی دینِ اکبری کے علمبردار اکبر کے زمانہ میں ظاہر ہوتی رہی۔ اس دور کے ابوالفضل اور فیضی نے دین کے رہے سہے نقوش کو بھی مٹا دینے ہی کے لئے اکبر کو آمادہ کیا کہ آزادانہ دینی نظامِ تعلیم و تبلیغ کے تمام مظاہر کو ایک ایک کر کے مٹا دیا جائے۔ پھر انگریز کا دور آیا اس نے کیا کچھ نہ کیا لاکھوں علماء تہ تیغ ہوئے، دینی مراکز تہس نہس کر دیئے گئے، مدارس اجڑ گئے، مساجد مسمار ہوئیں، کتاب و سنت کو پامال کیا گیا۔

برصغیر کے اسلامی تشخص میں مدارس کا کردار | مگر دین کی آزادانہ شان بان کو برقرار رکھنے والے علماءِ حق اتنے سخت جان نکلے کہ سب کچھ لٹا کر بھی محبوبائے دین اور لیلائے علم کی آبرو برقرار رکھی۔ اور علمِ دین کو اقتدار کی غلط خواہشات کی تکمیل کے لئے ایک داشتہ بن جانے سے بچائے رکھا۔ برصغیر میں عیسائیت کی یلغار ہوئی، ہندو اکثریت نے مسلمانوں کو مٹانا چاہا، مغربی سیلاب کی یلغار ہوئی دو سو برس انگریز نے ہندوستانی مسلمانوں کو ظاہراً و باطناً انگریز بنانے کے لئے کروڑوں اربوں رقم خرچ کی ایک نیا نظام و نصابِ تعلیم رائج کیا، یہ سب کچھ ہوا مگر برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کا انجام اندلس، تاشقند اور سمرقند کی طرح نہ ہوا، اسلام نہ صرف بچا رہا بلکہ ہر باطل قوت کو دبا دبا کر ابھرتا رہا۔ آج ہمارے ہاں اسلامی تعلیم، ثقافت، اسلامی تشخص اور پھر نظریۂ پاکستان کے نام پر الگ خطے کا حصول یہ سب انہی مدارسِ عربیہ ہی کی بدولت ہے۔ جو غلامی کی تاریکیوں میں ایک روشن قندیل

کی طرح نہ صرف اسلامی علوم بلکہ اسلامی اخلاق و عادات، آزادی اور حریت، جہاد اور سرفروشی کی روشنی بھی پھیلاتے رہے۔ یہیں سے حریت فکر اور جودت ذہن سے سرشار قائدین حریت اور سرفروشانِ ملک و ملت نکلے۔

بہر حال یہ سب چیزیں تاریخ کا ایک ایسا واضح اور قطعی عقدہ ہیں جس پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ مدارس عربیہ نہ ہوتے تو آج برصغیر کی مسجدیں اذانوں کو ترستیں، مدرسے تعلیم دین کے نام سے ناآشنا ہوتے اور یہاں کی حالت امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ کے دیس سے مختلف نہ ہوتی آج اسپین کی مسجدِ قرطبہ کی طرح لاہور کی شاہی مسجد بھی اذان اور نماز کے لئے ترستی اور اسلامی سربراہوں کے اجتماع جیسا حسین و جمیل منظر کبھی نہ دیکھ سکتی۔

مسجد و محراب کی قفل بندی کی ناکام کوششیں | ایوب خان کے دور میں اسلام دشمن طاقتوں کی نظریں بھی مدارس پر پڑیں۔ بے دین لوگوں نے اسے سہارا دیا منصوبے بنتے رہے۔ ملت فروش مذہب نما افراد نے تجاویز بنائیں کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امیر المؤمنین بننا ہے تو مولویوں کو ختم کردو۔ دین کو ماڈرن بنادو، مدارس کو قفل لگوا دو، تمہیں بقائے دوام مل جائے گی اور خدائے وقت بن جاؤ گے، ایسے ہی خردماغوں نے ایوب خان سے عائلی قوانین نافذ کروائے اور دین کی تحریف و تلبیس کا ایک طویل سلسلہ رسوائے زمانہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی شکل میں شروع کیا جو ایوب خان کے دوام کا نہیں بلکہ علماء اور دینی قوتوں کی شدید بیزاری کا سبب بن کر بالآخر ایوب خان کے شرمناک زوال پر منتج ہوا۔ ایوب خان اہل دین کو نہ چھیڑتے تو ملکی استحکام و سالمیت اور مادی ترقیاتی منصوبوں کے لحاظ سے وہ اوروں سے بہر حال بہتر تھے اور اہل حق کو اس لحاظ سے ان سے کوئی بیر نہ تھا۔ مگر وہی ہوا جو سنت اللہ ہے۔ آج نہ ایوب خان ہے۔ نہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن، نہ ان لوگوں کو ان کے درباری ملت فروش مولویوں کے فتوے بچا سکے نہ سلطان وقت کی چوکھٹ پر جبہ سائی کرنے والے مشائخ کی دعائیں ان لوگوں کا آج بھی یہی شیوہ ہے۔ صرف لبادہ بدل گیا ہے مگر مذہب زندہ ہے، علماء حق کا ولولہ اور جوش قائم ہے۔ مدارس عربیہ اسلام کی نمیاں باریوں میں

رواں دواں ہیں، ... کلمۂ حق سے گونج رہی ہیں۔ مجالسِ وعظ و تبلیغ شاد و آباد ہیں۔ حیرت تو موجودہ حکومت کے "قائدِ عوام" وزیرِ اعظم بھٹو صاحب پر ہے جنہیں عوام کے مزاج پہچاننے کا ملکہ ہے۔ وہ حالات اور اس کے نتائج کو بھی سمجھتے ہیں۔ مگر بیٹھے بٹھائے کن بے بصیرت لوگوں نے انہیں بھی ایک ایسے راستہ پر ڈال دیا جو بالآخر مسلمانوں کی نہایت دلآزاری اور اللہ کی رحمتوں سے محرومی ہی کا سبب بنے گا۔ اللہ اپنے دامن میں سوائے حرمان اور بربادی کے کچھ نہیں رکھتا۔

مدارس اور لادینی قوتیں قادیانی مسئلہ کے حل ہونے کے بعد یکایک ایسی باتوں کا اخبارات میں آجانا اور حکومت کا اب تک چپ سادھ لینا مختلف پریشان کن افواہوں اور خیالات کا سبب بنتا جا رہا ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے قادیانی مسئلہ پر مجبور اور بے بس ہو کر جو قدم اٹھایا اس سے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ یہاں کی اسلامی طاقت کا ایک اہم ترین سرچشمہ مدارس عربیہ ہیں، قادیانیوں کو تو اپنا دشمن پہلے سے معلوم ہے۔ ملک میں سوشلسٹ طاقتوں کو بھی علماء اور ان کے مراکز اور سرچشموں کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اب اگر حکومت نے خدانخواستہ کوئی بھی ایسا اقدام کیا تو اسے لازماً ان تین طاقتوں کا قادیانی مسئلہ کے فاتحین سے انتقام سمجھا جائے گا۔ کیا واقعی حکومت ایسا اقدام کر کے قادیانیوں کے زخموں کا اندمال کرنا چاہتی ہے اور کیا واقعی یہاں لادینی سوشلزم کا قطعی قیام مقصود ہے؟ اور کیا حکومت کا مقصد یہی ہے کہ اس کے لادینی اقدامات پر کوئی انگلی اٹھانے والا نہ رہے۔ اور بجائے کلمۂ حق کے یہاں ہر فاجر و فاسق کے منکرات و معاصی کو اللہ اور رسول کی عین اطاعت قرار دینے والے سرکاری ملاؤں اور علماء سوء کا دور دورہ رہے؟ یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے اور حالات ان اندیشوں کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔

مدارس کا استحصال حکومت نے بہت سے کارخانے بنک اور زمینیں قومی تحویل میں لے لی ہیں۔ اب شاید وہ ان دینی کارخانوں اور مدارسِ عربیہ کا بھی استحصال کے نام پر استحصال کرنا آسان سمجھتی ہے۔ مگر اسے شاید معلوم نہیں کہ مادی منافع پر مبنی

فیکٹریوں اور املاک کا معاملہ اور ہے اور شمع رسالت کو روشن رکھنے والے مدارس اور مراکز کی حیثیت اور۔ یہ معاملہ بڑا نازک ہے اور اہل علم اس معاملہ میں نہایت حساس حکومت کو چند ٹکوں کے لئے ایمان اور ضمیر بیچنے والے بہت ہی کم ملیں گے۔ مدارس عربیہ کی چٹائیوں پر عمر عزیز صرف کر دینے والے اساتذہ اور سوکھے ٹکڑوں پر گزارا کر کے جوانیاں لٹا دینے والے طلباء علومِ نبوت کے ان باورہاؤسوں کو بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیں گے۔ جو مدارس دینیہ کی شکل میں قائم ہیں۔ جن کا ایک سرا دامانِ نبوت سے اور دوسرا عالم کی بقاء اور مسلمانوں کی حیات ابدی سے وابستہ ہے۔

<u>متحدہ تنظیم</u> | ہمیں خوشی ہے کہ ارباب مدارس اور ہر مکتبِ فکر کے علماء حق نے ملتان میں جمع ہو کر اس بارہ میں اپنی زندگی کا ثبوت دیا ہے۔ مدارس عربیہ کے تحفظ کے لئے ایک فعال متحدہ تنظیم (اتحاد المدارس العربیہ) کے نام سے قائم کر دی گئی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ تمام مدارس بلحاظ اختلاف مسلک و مشرب اس تنظیم کی ہدایات اور مشوروں کی قطعی پابندی کریں گے۔ تاکہ مدارسِ عربیہ کا یہ چراغ مصطفوی ہمیشہ ہمیشہ روشن رہے۔ (جلد ۱، شمارہ ۴)

قادیانیوں کے عزائم

ہم نے اس سے قبل دینی مدارس کو قومی تحویل میں لینے کی افواہوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اس خدشہ کا اظہار بھی کیا تھا کہ قادیانی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو جانے کے بعد ملک کے لادینی عناصر قادیانیوں کی شہ پر علماء اور مدارس دینیہ کی قوتوں کے اصل سرچشمہ مدارس عربیہ کے نظام کو درہم برہم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ان خدشات کی تائید قادیانی حلقوں اور مرزائی پریس کا اس بارہ میں رویہ سے ہو سکتی ہے قادیانی جماعت کے ترجمان "پیغام صلح" ۱۲ جنوری ۱۹۷۵ء کا شمارہ ہمارے سامنے ہے

اس کے مقالۂ افتتاحیہ اور ایک مضمون میں حکومت کے ایسے ارادوں کا پُرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے مدارسِ عربیہ کو امتِ مسلمہ کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔

پیغامِ صلح کا مرزائی مقالہ نگار جو ملت کے اس طبقۂ علماء کے ہاتھوں ضربِ کاری کھا چکا ہے۔ حکومت کو مشورہ دیتا ہے کہ:-

"ایسے اقدامات کو جلد عملی جامہ پہنایا جائے کہ اس طرح سماج دشمن اور تخریب پسند روایت کی اہمیت ختم ہو جائے گی اور قومی اتحاد اور وحدتِ ملی کا تصور روشن ہو جائے گا۔"

قادیانی صحافی کو ان مسلمانوں کے دینی مراکز کے اصلاحِ نظام و نصابِ تعلیم کا درد بھی کھائے جا رہا ہے۔ قادیانی اخبار کو اس بات کا بھی دکھ ہے کہ ان مدارس میں مختلف طریقوں سے جمع کی جانے والی لاکھوں رقومات کا خرچ اموال کا بدترین ضیاع ہے ــــ مگر وہ خود یہ نہیں سوچتا کہ استعمار اور اسلام دشمن طاقتوں کے درپردہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عزائم خبیثہ کی تکمیل کے لئے ان لاکھوں کروڑوں روپیہ کا مصرف کیا ہے۔ جو قادیانیت کے پردہ میں خرچ ہوتے ہیں اور اس دولت سے مسلمانوں کی وحدتِ ملی کو کیا فائدہ پہنچا۔ وہ ۹ کروڑ روپیہ جس کی مرزا ناصر نے اپیل کی تھی، کہاں سے آئے۔ جس کا مصرف ربوہ اور قادیان کی شرمناک پاپائیت کی ہوس رانیوں کی تکمیل کے سوا کچھ نہیں اور جو عالمِ اسلام میں درپردہ آئے دن کی سازشوں میں لگائے جا رہے ہیں۔ اپنے سادہ لوح تبلیغی کے وصایا اور وراثتوں کے خون پسینہ کی کمائی کو جاہ و باہ کے کن قبیح اور شرمناک طریقوں سے ہضم کیا جاتا ہے۔ اور یہ سامراجی گماشتے عالمِ اسلام میں ایک طرف تو صیہونیت کے ہراول دستہ ہیں دوسری طرف استعماری تحریکوں سے ایتھوپیا میں مسلمان کا خون بہا رہے ہیں قبرص میں ترکوں کے خلاف سرگرم ہیں، کشمیر کو بھارت کے ہاتھوں قادیان کی موہوم امید پر رہن کرا چکے ہیں ــــ مگر انہیں نکسے تو ان طیّب و طاہر پاکیزہ چندوں کا

جو دردمند مسلمان اپنا پیٹ کاٹ کر دینی مدارس پر لگاتے ہیں اس لئے کہ تاجدارِ ختمِ نبوت کے علوم اور مواریثِ نبوت وہدایت کی یہ حفاظت گاہیں مسیلمہ کذاب کی اولاد کے استیصال کے مراکز ہیں۔ وہ ان مدارسِ عربیہ سے عشقِ نبوی اور حفاظتِ اسلام کے جذبہ سے سرشار ان جانباز فارغ التحصیل علماء کو انسانی ضیاع قرار دیتے ہیں جو اپنی مرضی سے دُنیا اور اس کی رنگینیوں کو کملی والے آقا کے دین پر تج چکے ہیں اور روکھے سوکھے ٹکڑوں پر قناعت کئے بیٹھے ہیں۔

بہرحال قادیانی اخبار نے ہمارے خدشات کی تائید کر دی ہے کہ مدارسِ عربیہ کا گلا گھونٹنے کی یہ کھچڑی کہاں کہاں پک رہی ہے۔ ہمیں قادیانی جماعت سے اس بارہ میں کوئی شکوہ نہیں کہ ملّتِ مسلمہ کی قادیانیوں کی تو اب کھلی جنگ ہے۔

مدارسِ عربیہ کی "اصلاح" کے پُرفریب سنہری وعدے مگر افسوس تو ہمیں اپنوں کی بعض ایسی دردمندانہ "تجاویز اور منصوبوں" کو دیکھ کر ہوتا ہے جو علماء اور طلبہ مدارسِ عربیہ کی خیرخواہی اور ان کی حالت بہتر بنانے کی شکل میں ہمارے سامنے آرہے ہیں۔

مثال کے طور پر ہمارے محترم وزیر مذہبی امور مولانا کوثر نیازی کا ایک انٹرویو مطبوعہ جنگ ۲۷ر فروری ۱۹۷۵ء ہمارے سامنے ہے انہوں نے دینی مدارس کو سرکاری تحویل میں لینے کی تردید کے باوجود کچھ باتیں ایسی کی ہیں جن پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ انہیں ان مدارس کے اساتذہ کی تنخواہوں اور طالب علموں کی حالت بہتر بنانے کی بھی فکر ہے۔ کیونکہ بقول ان کے یہ لوگ دستِ سوال دراز کئے پھرتے ہیں۔ مدارسِ عربیہ کو مالی امداد دینے کا بھی ذکر ہے۔

اہلِ مدارس کا مطمحِ نظر کبھی دنیاوی نہیں رہا مگر کیا محترم مولانا یہ نہیں جانتے کہ یہ لوگ حصولِ علمِ دین کی راہ اپنی جوانیوں کی متاعِ عزیز جو لٹا دیتے ہیں ان کا مطمحِ نظر دنیاوی آسودگی اور آسائشِ حیات نہیں ہوتا۔ زندگی کے دیگر شعبوں میں جا کر یہ راستے تو ان پر بھی وا ہو سکتے

تھے۔ مگر انہوں نے سوچ کر اور ایسی تمام خواہشات کی قربانی دے کر اپنی زندگیاں کتاب و سنت کی شمع تابناک کو فروزاں رکھنے کے لئے وقف کر دیں انہیں معلوم ہے کہ یہ راہ و رسم وفا مادی خوشحالی کی کبھی مرہون نہیں رہی۔ یہ کانٹوں کی سیج ہے پھولوں کی نہیں۔ اصحاب صفہ کی سیرتِ مقدسہ ان کے سامنے ہے۔ اور وہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ جنہیں مادی حالت کی بہتری اور دنیوی جاہ و جلال، عہدے اور مناصبِ جلیلہ درکار ہوں تو انہیں اس راہِ عشق سے کیا سروکار۔ ع

جس کو ہو جان و دل عزیز تیری گلی میں جائے کیوں

زہد و ایثار کا صلہ | ان لوگوں نے انگریز کے عہدِ غلامی میں چٹائیوں اور بوریوں کی رہائش اور روکھے سوکھے ٹکڑوں پر قناعت کو ترجیح دی ورنہ انگریزی مراحم و عنایات کے دروازے ان پر بھی کھل سکتے تھے۔ یونیورسٹیوں کی ملاقاتی زندگیاں انہیں پکار رہی تھیں وہ بھی سر اور خان بہادر بن سکتے تھے۔ شمس الاسلام اور شیخ الاسلام جیسے مناصب تو خان بہادر اور سر سے بھی سستے داموں بک رہے تھے مگر ان فقرا و زہد و علم نے یہ سب کچھ بھی خدائے غیور کی بارگاہ سے کوئی سید احمد شہیدؒ بن کر نکلا کوئی محمد قاسم نانوتویؒ، کوئی شیخ الہندؒ اور کوئی شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے نام سے اسلامیانِ ہند کے قلوب پر بے تاج حکمران بنا، کوئی حسین احمد مدنیؒ کی شکل میں عرب و عجم کی سیادت کی خلعت سے نوازا گیا، کوئی اشرف علی تھانویؒ کی صورت میں حکیم الامت بنا تو کوئی احمد علی لاہوریؒ کے پیکر میں قطبِ ارشاد اور شیخ التفسیر بن کر نمودار ہوا کوئی سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی صورت میں امیرِ شریعت بن کر منصۂ خطابت پر جلوہ افگن ہوا۔ پھر مولانا یہ کیوں بھول گئے کہ۔

سنہری اور پُرفریب وعدے | اس سے قبل بھی معیارِ زندگی کی بلندی اور معاشی بہتری کے نام پر کئے گئے ایسے سنہری عہد و پیمان کا کیا حشر ہوا۔ مساجد اور مزارات کو تحویل میں لینے کے وقت بھی ایسے ہی اصلاحی جذبات سامنے آئے، خطباء کی معاشی حالت کی بہتری اور باعزت مقام اور وقار کے مژدے بھی سنائے گئے۔

سرکاری تحویل میں لئے گئے اوقاف کی تباہ حالی | مساجد، خانقاہوں اور مزارات کی

خاطر خواہ دیکھ بھال کرنے کے وعدے بھی ہوئے، لیکن کیا بعد کے واقعات نے ان ساری باتوں کو سراب نہیں ثابت کیا بہت سی مساجد کی آمدنی لاکھوں تک پہنچتی تھی، آج وہ کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔ بسا اوقات ایک چٹائی اور بلب کے لئے مسجدیں ترستی ہیں کچھ دردمند نمازی از خود چندا اکٹھے کر کے دیکھ بھال کا کام چلا لیتے ہیں۔ وقف املاک کی لاکھوں آمدنی اپنے اصل شرعی مصارف پر خرچ ہونے کی بجائے افسران اور انتظامیہ کی فوج ظفر موج کی بھاری تنخواہوں اور تکلفات پر لگ جاتی ہیں اور کچھ یورپ کی مادی اور غیر مذہبی تعلیم کے وظیفوں اور نام نہاد ثقافتی سرگرمیوں پر خطیبوں کی تنخواہیں کئی کئی ماہ رکی رہتی ہیں۔ معیارِ زندگی بلند تو کیا ہوتا۔ اوقاف کے بے شمار خطیب ایسے بھی ہیں جن کی تنخواہ اس جان لیوا گرانی میں بھی پچاس روپے سے متجاوز نہیں۔ پھر ظلم یہ کہ وہ مستقل سیاسی جوڑ توڑ کے رحم و کرم پر رہتے ہیں۔ غازیوں کی سیاسی وابستگیوں کی رسہ کشی کا شکار رہتے ہیں۔ اور جدھر کا پلڑا سرکار والا تبار کے ان بھاری ہوا خطیب اس کی زد میں آگیا اور ایک پٹواری کی طرح جب چاہا ایک مسجد سے اٹھا کر دور دراز کسی شہر میں تبدیل کر دیا۔ پھر ۵۸ سال عمر کے جرم میں ریٹائرمنٹ کی تلوار الگ سر پر مسلط، حالانکہ منصب وعظ و ہدایت اور مقام رشد و تبلیغ میں عمر کے ساتھ اور بھی پختگی اور رسوخ آتا ہے۔ ہمیشہ سے یہ لائن ریٹائرمنٹ کی لغت سے یکسر ناآشنا ہی ہے۔ رہی سہی کسر جو رہ گئی تھی، اب ان بے چاروں کو خطبہ میں "وحدتِ موضوع اور تجدید مضامین" کے شکنجوں میں کس کر پوری ہو جائے گی جس کی خبریں آج کل آ رہی ہیں۔

<u>سرکاری تحویل میں لئے گئے سکولوں، کالجوں میں اسلامیات کی حالت</u> پھر پرائیویٹ تعلیمی اداروں اور سکولوں کو تحویل میں لینے کے وقت بھی ایسے ہی دلنواز اور جاذبِ نظر نغمے سننے میں آئے کہ اب ان اداروں کی کایا پلٹ جائے گی۔ نتیجۃً جو ادارے عام مسلمانوں کے جذباتِ ملی کے سہارے چل رہے تھے وہ رضاکارانہ جذبات اور مسلمانوں کے تعاون سے محروم ہو گئے اور دو ڈھائی سال گزر جانے کے باوجود اب بھی غیر یقینی کیفیت سے دوچار ہیں نہ ان اداروں کے اساتذہ کو مستقل ہونے کے پروانے مل سکے ہیں

نہ واضح طور پر ان کے مشاہروں کا تعین ہو چکا ہے۔ اور ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ تنخواہوں کی حد بندی کا مسئلہ اٹھا بھی تو جو حکومت دینی مدارس کی معاشی حالت بہتر بنانے کی فکر کر رہی ہے۔ اس نے تنخواہوں کے سکیل مجریہ ۸ر جنوری ۱۹۷۵ء میں انگلش وغیرہ عمرانی مضامین کے ان ٹرینڈ اساتذہ کی شرح تو مقرر کر دی گئی ہے۔ لیکن ان ٹرینڈ فاضلین علوم شرقیہ اور اساتذہ دینیات و معلمین قرآن کے کسی سکیل کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ بلکہ ایسے اساتذہ کو ۱۹۷۳ء کے سکیل کے مطابق نقد ۹ روپے دیتے کی ہدایات جاری کر دی گئیں۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سلام کے جذبے کے تحت حکومت کی نظریں بار بار مدارس عربیہ کی طرف اٹھتی رہی ہیں۔ لیکن کیا حکومت خدمت اسلام کی اور تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو چکی ہے۔ ملک کے تمام شعبوں میں اسلام جاری اور ساری ہو چکا ہے، تمدن، تہذیب، سیاست و معاشرت، اخلاق و معاملات کے ہزاروں ایسے شعبے ہیں، جو زبان حال سے حکومت کو پکار پکار کر دعوت اصلاح احوال دے رہی ہیں۔

خدمت اسلام کا میدان عصری نظام تعلیم | مگر یہاں ہم صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کرتے ہیں جس کا تعلق تعلیمی شعبہ ہی سے ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد کیا ہمارے حکمرانوں کا اہم ترین فریضہ نہ تھا کہ ملک کے تمام عصری نظام و نصاب تعلیم کو اسلامی سانچہ میں ڈھال دیا جاتا یہ نہ ہو سکا تو کم از کم یہ تو لازمی تھا کہ عصری تعلیم گاہوں میں اسلامی تعلیمات و اخلاق، قرآن و سنت اور عربی و شرقی علوم پر خصوصی توجہ دے دی جاتی کہ اب ہمیں غلام ہندوستان کے لئے دیسی کلرکوں کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک اسلامی مملکت کے لئے مہذب اور عالم و فاضل شہریوں کی چاہیئے تھا کہ اسلامی تعلیمات کو اہم لازمی مضمون کی حیثیت دے دی جاتی اور ان علوم کے اساتذہ اور طلبہ کو ترجیح نہیں تو کم از کم انگریزی اور دیگر عمرانی علوم کے اساتذہ اور طلبہ جیسا با عزت مقام اور مراعات تو دے دیئے جاتے، مگر یہاں تو ۲۷ سال گزرنے کے بعد بھی اسلامیات

یا علومِ شرقیہ کا جو برائے نام سلسلہ ہے اس کے اساتذہ کی حالتِ زار سے کون بے خبر ہے۔ نہ سرکاری درس گاہوں میں ایسے اساتذہ دینیات کے لئے لازمی آسامیاں ہیں نہ وہ حقوق و مراعات جو انگریزی پڑھانے والوں کے لئے ہیں بعداز خرابیٔ بسیار تعلیم کے سرکاری اداروں میں اسلامیات کو پہلے اختیاری اور پھر لازمی حیثیت دی گئی مگر وہ بھی ثانوی سطح پر۔ مگر اکثر صوبوں میں عملاً تدریس قرآن کا صرف اتنا انتظام ہے کہ محض سطحی اور رسمی طور پر بعض جگہوں میں گویا خانہ پری کر دی گئی ہے۔ اور یہ سطور لکھتے وقت تو یہ افسوسناک اطلاع بھی سامنے آچکی ہے کہ :-

"وفاقی وزارتِ تعلیم کے شعبۂ تدوین نصابات نے سرکلر نمبر HSC–1/74–S–F جنوری ۱۹۷۵ء کے ذریعہ اپنے مجوزہ تعلیمی اسکیم برائے نصاب انٹرمیڈیٹ میں اس نصاب کی فہرست سے اسلامیات کے مضمون کو یکسر خارج کر دیا ہے اور اس کی جگہ فنونِ لطیفہ بالخصوص موسیقی کو مستقل مضامین کی حیثیت دی گئی ہے۔"

ع

چیست یارانِ طریقت بعدازیں تدبیرما

پھر کیا "خدمتِ اسلام کا یہ جذبہ" آگے چل کر مدارس علومِ نبویہ کو بھی رقص و سرود موسیقی، آرٹس اور کلچر کے مراکز میں تبدیل کرنا چاہتا ہے ـــــ ولا فعلها الله الی یوم القیامۃ۔

علومِ شرقی اور برطانوی دور سے بھی بدتر حالت | بہرحال عصری تعلیم گاہوں کے اساتذۂ دینیات اور فضلاء علومِ شرقیہ کی معاشی حالت بہتر بنانے پر کتنی توجہ دی گئی ہے۔ اس کی حقیقت بھی سب کو معلوم ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ فاضل عربی ادیب اور دوسرے اسناد رکھنے والے اساتذہ کو دیگر لازمی مضامین پڑھانے والے ٹیچروں کی مساوی حیثیت میں مشاہرے دیئے جاتے۔ مگر ایسا نہیں بلکہ ۱۷۵، ۵۰۔۱۴۰، ۱۰۰/۴۰۔۱۰، یا بالقطع -/۱۰۰ روپے تنخواہ مقرر کی گئی تنخواہوں کے

گوشواروں کو سامنے رکھ کر آپ پر یہ تفاوت عیاں ہو جائے گی کہ برطانوی دور میں انگریزی اساتذہ اور علوم شرقیہ کے اساتذہ کی تنخواہوں میں اتنا غیر معمولی فرق نہ تھا جو کہ اب ہے یہ تفاوت ۱۹۴۵ء میں پچاس روپے تھی تو پاکستان بننے کے بعد ۱۹۵۲ء میں ۷۰/- روپے ہو گئی۔ ۱۹۷۰ء میں ۱۲۰/- روپے ہو گئی۔ اور اب عوامی دور کے نیشنل پے سکیل میں ۱۸۵/- روپے ہو گئی۔ یعنی انگریزی اور عمرانی پڑھانے والوں سے اسلامی تعلیمات اور عربی کے معلمین کو ۱۸۵/- روپے کم ملتے ہیں۔ یہی تفاوت اسلامیات اور انگریزی نصاب کے پرچوں کے نمبرات میں بھی ہے۔ انگریزی پرچہ کے نمبرات ۷۵ ہیں تو عربی کے سو اور انگریزی پڑھانے کے لئے ہفتہ میں آٹھ پیریڈ ہیں تو عربی کے لئے چار۔ اور یہ واقعہ ہے کہ لازمی اختیاری مضامین میں بھی سائنس کو عربی پر ترجیح دینے کی وجہ سے دیگر طلبہ عربی چھوڑ کر سائنس اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بہر حال اسلامیات اور علماء اسلامیات اور دیگر مضامین اور اس کے اساتذہ کے درمیان تفاوت اور حق تلفی کی داستان بہت طویل ہے۔

مقصد یہاں صرف علماء اور طلباء مدارس عربیہ کی معاشی حالت بہتر بنانے کے "پاکیزہ جذبات" پر کچھ عرض کرنا تھا ـــــ مذکورہ انٹرویوں میں دینی مدارس کی مالی بے قاعدگیوں اور گڑبڑ کا بھی ذکر ہے۔ نصابِ تعلیم کی اصلاح اور علماء کو معاشرے کا مفید (؟) رکن بنانے پر بھی اظہارِ خیال ہے۔ اچھے مدارس کو حکومت کا مالی امداد دینے کی ترغیب بھی ہے۔ ان تمام باتوں پر گفتگو کا میدان وسیع ہے۔ اور یہ سب باتیں علماء حق اور عام مسلمانوں کو دعوتِ فکر دے رہی ہیں۔ (مارچ ۱۹۷۵ء)

قومی ملکیّت کی تلوار

دینی مدارس پر قومی ملکیت کی تلوار | حکومت کی درپردہ بعض سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت قومی ملکیت کی تلوار سے دینی مدارس کو ذبح کر کے دین کے رہے سہے نشانات اور شعائر کو بھی مٹا دینا چاہتی ہے۔ برِصغیر کے مخصوص حالات میں مدارسِ عربیہ کی قدر و قیمت اور ضرورت و اہمیت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ یہ مدارس نہ ہوتے تو آج برِصغیر مسلمانوں کی عظمتوں کا قبرستان بن چکا ہوتا اور یہاں کی حالت سپین اور بخارا و سمرقند سے مختلف نہ ہوتی۔ قیام پاکستان سے لے کر اب تک حکومتی ذرائع سے دین اور اسلامی علوم کے فروغ و اشاعت کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا گیا وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو وہ اسلام یہاں بہت مشکل سے مل سکتا جسے لے کر ہم نے نظریۂ پاکستان کا نعرہ لگایا اور ایک سلطنت حاصل کی۔ مگر حکومت کی نظریں اٹھتی بھی ہیں تو بار بار ان مدارس اور مساجد کی طرف، جب کہ زندگی کے ہزاروں شعبے ابھی اسلامی مملکت کی نظرِکرم کے محتاج ہیں۔ جہاں تک مدارسِ عربیہ کے نصاب، نظام اور خامیوں کی اصلاح کا تعلق ہے، اس کے احساس اور ضرورت سے خود اہلِ علم اور اربابِ مدارس بھی کسی لحظہ غافل نہیں رہے۔ اور نہ حکومت یا کسی بھی حلقے کی کسی مفید اور مخلصانہ مشوروں کو نظر انداز کرنے کا کبھی مظاہرہ کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک سرکاری تحویل میں لینے کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو حکومت صنعتی اداروں، بنکوں اور فیکٹریوں کے پیمانہ پر نہ پرکھے، ایسے اقدامات دینی و علمی حلقوں میں نہ صرف مداخلت فی الدین بلکہ فنا مے دین سمجھے جائیں گے۔ اس لئے ایسے کسی اقدام کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس کی نزاکتوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

عربی لغۃ الاسلام

عالم اسلام کی سب سے قدیم اور عظیم اسلامی یونیورسٹی جامع ازہر کے ریکٹر شیخ محمد محمد الفحام نے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں اپنی تشریف آوری کے موقعہ پر جو خطاب فرمایا اس میں انہوں نے زیادہ تر زور عربی زبان کی اہمیت محسوس کرنے پر دیا اور فرمایا کہ مختلف زبان رکھنے والے مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اخوت قائم رکھنے کے لئے عربی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مسلمان اپنی علاقائی زبانیں چھوڑ دیں۔ خدا نے ہر ملک اور قوم کے لئے الگ الگ زبانیں بنائی ہیں۔ اور اس کی حکمتیں اور شانِ قدرت کا ظہور اس اختلاف کا متقاضی ہے، لیکن جب ایک طرف ہم پشتو اردو فارسی سیکھتے ہیں تو بحیثیت مسلمان ہمیں عربی زبان کا سیکھنا بھی اس لئے ضروری ہے کہ عربی صرف عربوں کی زبان نہیں بلکہ یہ لغۃ الاسلام ہے، قرآن کی زبان ہے اور ہمارے مقتدائے دین و دنیا سرورِ کائنات علیہ السلام کی زبان ہے اور جو اپنے اندر ان کی تعلیمات کو سموئے ہوئے ہے۔ اس لئے اس معاملہ کو تعصب سے نہیں بلکہ اس زاویہ سے دیکھنا چاہیئے، انہوں نے اس سلسلہ میں ایک روایت بھی بیان کی کہ جو اللہ کو چاہے گا، تو لازماً حضورؐ کو بھی، اور جسے نبیؐ عربی سے محبت ہوگی اسے عربوں سے بھی، اور جب عربوں سے ہوگی تو وہ عربی زبان سے بھی محبت رکھے گا۔

ترویج عربی مسلمانوں کی ایک سیاسی ضرورت | مگر اس منطقی اور طبعی محبت کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنے ہاں عربی زبان کی تعلیم و تعلم اور افہام و تفہیم کو اہمیت دیں۔ اس کی ترویج میں بھرپور حصہ لیں انہوں نے بالکل صحیح کہا کہ ایک مسلمان یہ نقصانی گوارا نہیں کر سکتا کہ کسی اسلامی مملکت میں جا کر وہ مسلمانوں کی زبان عربی کے سمجھنے اور سمجھانے والے نہ پائیں، مسلمانوں کے لئے یہ چیز شرم کی بات ہونی چاہیئے۔

عربی کی ترویج کے لئے مدارسِ عربیہ کی کوششوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس موقف کو بھی سراہا کہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور روابط کے لئے عربی یہاں کی سرکاری زبان ہونی چاہیئے۔ شیخ الازہر نے دارالعلوم حقانیہ اور دیگر مدارس میں عربی زبان کی تعلیم و تعلم کے سلسلہ میں بجا طور پر خواہش ظاہر کی کہ اس سلسلہ میں جدید عربی نصاب اور جدید ترین کتابوں سے استفادہ ضروری ہے۔ جب کہ ہر زبان کی طرح عربی ادب میں اندازِ تحریر، طرزِ بیان اور نئے نئے الفاظ و اصطلاحات کی وجہ سے کافی تبدیلی آچکی ہے۔ جب کہ ہمارے مدارس میں عربی کو بحیثیت عربی زبان کی تعلیم و ترویج پر کما حقہٗ توجہ نہیں دی جارہی اور یہ ایک بڑی کمی ہے جو ہمارے ہاں کے علماء اور طلباء اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔

باہمی ربط و اتصال کا ایک لازمی ذریعہ | اس تقریب کے افتتاح میں قائدِ جمعیت مولانا مفتی صاحب[1] نے بھی عربی کی اہمیت پر مؤثر انداز میں روشنی ڈالی اور اسے پاکستان کے لسانی مسائل کا واحد حل قرار دیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہم اپنی آئینی جدوجہد میں اس لئے عربی کو سرکاری زبان قرار دینے پر زور دیتے ہیں کہ ہماری داخلی اور خارجی ضروریات ہمیں مجبور کر رہی ہیں۔ پاکستان مختلف صوبوں اور علاقوں کا مجموعہ ہے۔ اور ہر حصے کی الگ الگ زبان ہے۔ اب اگر ہمیں کسی ایک زبان کے ذریعہ ان حصوں کو مربوط رکھنا ہے تو سوائے عربی کے کوئی بھی جامع زبان ہمیں نہیں مل سکتی، اپنے ازلی دشمن انگریز کی انگریزی سے نجات پانے کی یہی ایک صورت ہے۔ خارجی ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود نے فرمایا کہ چونکہ عربی ہمارے قرآن و رسولؐ ہمارے مذہب اور ہمارے کروڑوں عرب بھائیوں کی زبان ہے اس لئے یہ عالم اسلام کے باہمی ربط و اتصال کے لئے ایک لازمی کڑی ہونی چاہیئے۔

پاکستان کی ذمہ داریاں | اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں عربی کو اس کا صحیح مقام دینے

---

[1] آپ اس وقت سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ در شیخ الازہر کے ساتھ تشریف لائے تھے۔

کی راہ میں کافی مشکلات ہیں، اساتذہ کا مسئلہ ہے، نئی کتابوں کی فراہمی ہے۔ عربی کو لسانیاتی حیثیت سے نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم میں وہ جگہ دینی ہے جو ترقی یافتہ مروجہ عربی ادب کو عرب ممالک میں حاصل ہے۔ مگر ایک اسلامی مملکت جب علاقائی زبانوں کے لئے سب کچھ کر سکتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ملی و ملی بقاء استحکام کی حامل اس ضرورت پر توجہ نہ دی جائے چونکہ اس کا تعلق پورے ملک سے یکساں رہے گا، اس لئے مرکزی حکومت پر بھی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ نئی تعلیمی پالیسیوں میں عربی کی اس ضرورت کا پورا لحاظ رکھا جا سکتا ہے۔ جدید عربی نظامِ تعلیم اور مروجہ نصابوں پر عبور، عالمِ عرب کے تعلیمی اور ادبی اداروں علمی شخصیات سے تبادلۂ خیال اور استفادہ کے لئے عربی سے ذوق رکھنے والے علماء اور طلباء کے وفود کا عرب ممالک سے تبادلہ ہو سکتا ہے۔ عرب ممالک سے اس سلسلہ میں تعاون اور مدد حاصل کی جا سکتی ہے جس کے نتیجہ میں یہاں عربی زبان کی ترویج و تعلیم کے لئے نہایت مفید تجاویز زیرِ عمل لائی جا سکتی ہیں۔ صوبائی حکومتیں اپنی اپنی حد تک مفید اسکیم اور منصوبے بنا کر عربی کے لئے رفتہ رفتہ ایسا میدان تیار کر سکتے ہیں کہ وہ آگے چل کر بغیر کسی دقت کے پاکستان کی سرکاری زبان بن سکے۔ یہ سب کچھ ملک و ملت سے خیر خواہی کے جذبات، عربی سے شغف، علمی ذوق، اور عالمِ اسلام کے مشترکہ مسائل کا احساس و شعور رکھنے کے علاوہ خدائے کریم کی توفیق اور دستگیری پر ہے، دیکھئے پاکستان کی ملتِ اسلامیہ کب ایسی اہم ذمہ داریوں کو نبھانے کی اہل بنتی ہے۔

(فروری ۱۹۷۳ء)

عصری نظام تعلیم اور دین سے بیگانگی

ہمارا سرکاری نظام تعلیم اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ دین اور اسلامی علوم سے کتنی تیزی سے دور ہوتا جا رہا ہے، اس کا کچھ اندازہ ذیل کے ایک جائزہ سے لگائیے جو ایک ثقہ اور فاضل شخص کا فراہم کیا ہوا ہے[۱] اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی نگاہ میں رکھئے کہ ہمارے فکری اور معاشرتی انتشار اور عدم استحکام کے ایک اہم بنیادی سبب نئی پود کی عصری تعلیم گاہوں میں مذہب اسلامی زبان عربی اور اسلامیات سے بے بہرہ ہونا ہے، اس وقت ساری ذمہ داری طبقاتی تفاوت اور معاشی عدم توازن پر ڈالی جا رہی ہے۔ مگر اس ساری بے چینی اور اضطراب کو فقط معدہ اور پیٹ کے پیمانے سے ناپنا اور ملک کی دیگر تمام تعلیمی اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے زوال اور اس کے محرکات سے صرف نظر کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

عربی سے بے اعتنائی کا ایک جائزہ | عربی ہماری اسلامی اقدار اور تعلیمات کی ترجمان ہے اس کے ساتھ حکومت کی بے اعتنائی اور ہماری بے حسی کا نتیجہ کیا ظاہر ہوا۔ اس کا جواب اعداد و شمار کی زبان سے سنیے۔

۱۹۵۲ء میں ۳۶۵۵۸ طلباء و طالبات نے میٹرک کا امتحان دیا ان میں عربی پڑھنے والے ۵۳۴۰ تھے۔ پانچ سال بعد ۱۹۵۷ء میں ۵۸۲۷۰ طلباء و طالبات نے میٹرک کا امتحان دیا ان میں عربی پڑھنے والے ۴۲۱۷ رہ گئے، دس سال بعد ۱۹۶۲ء میں ۵۸۲۷۰ طلباء و طالبات نے میٹرک کا امتحان دیا ان میں عربی پڑھنے والے ۳۲۴۸ رہ گئے۔ پندرہ سال بعد ۱۹۶۷ء میں ۹۹۹۷۶ طلباء و طالبات نے میٹرک کا امتحان دیا ان میں عربی پڑھنے والے ۴۹۹۲ تھے۔

گویا ۱۹۵۲ء میں میٹرک میں عربی پڑھنے والوں کا تناسب ساڑھے چودہ فیصد تھا۔ لیکن پندرہ سال بعد جبکہ طلباء کی مجموعی تعداد میں ۱۷۳ فیصد اضافہ ہو گیا۔ عربی خواں طلباء و طالبات

---

[۱] اور یہ جائزہ بھی ۱۹۵۲ء سے لے کر ۱۹۶۷ء تک کا ہے اس کے بعد حالات تو اور بھی بدتر ہو کر ہم سب کے سامنے نوشتہ دیوار بنے ہوئے ہیں۔

کا تناسب ۵ فیصد سے بھی کم ہوگیا۔ یعنی طلباء کی تعداد ساڑھے چھتیس ہزار سے ایک لاکھ ہوگئی مگر عربی خواں ۵۲۴۰ سے گھٹ کر ۴۹۹۲ رہ گئے ۱۹۵۲ء میں ایف اے میں پرانے نصاب کے اندر بارہ ہزار آٹھ سو اڑتالیس طلباء شریک امتحان ہوئے، ان میں ۵۱۱۱ عربی خواں تھے پندرہ سال بعد طلباء کی تعداد پچپن ہزار سات سو تاسی ہوگئی اور عربی خواں طلباء کی تعداد ۱۱۱۹ گویا پندرہ سال میں طلباء کی تعداد میں ۳۳۳ فیصد اضافہ ہوا لیکن عربی خواں طلباء وطالبات ۴۰٪ سے گھٹ کر صرف دو فیصد رہ گئے ـــــ اسی سے بی اے، ایم اے میں عربی کو تدریس کا اندازہ کر لیجئے۔

اسلامیات کی بے کسی | یہی حال اسلامیات کا ہے میٹرک تک اسے لازمی قرار دینے کے باوجود اب تک اس کے لئے کوئی مستقل اور قابلِ افادیت کتاب مرتب نہیں کرائی گئی۔ ایف اے میں اسلامیات محض اختیاری مضمون ہے وہ بھی صرف آرٹس کے طلباء کے لئے موجودہ قوانین کی رو سے مغربی پاکستان میں ایف ایس سی کا کوئی طالبعلم عربی کسی صورت میں نہیں لے سکتا۔ بی اے کے لئے کراچی اور حیدرآباد یونیورسٹی میں اسلامی تعلیم کا ایک پرچہ لازمی ہے، لیکن پشاور اور پنجاب یونیورسٹیوں میں نہیں فنی اور پیشہ ورانہ اداروں میں یعنی مغربی پاکستان کے کسی میڈیکل کالج، لاء کالج، کامرس کالج، انجنیئرنگ کالج میں اسلامیات کے نام کی کوئی چیز شامل نصاب نہیں ہے، جبکہ ان فنی (TECHNICAL) اور پیشہ ورانہ (PRSFESSIONAL) اداروں کی تعداد مغربی پاکستان میں ۵۸ فیصد ہے۔ گویا ہمارے وکلاء، ڈاکٹروں اور انجنیئروں کو دینی تعلیم سے بے بہرہ رکھنا سرکاری پالیسی ہے۔

مجوزہ نئی تعلیمی پالیسی سے کچھ امید بندھ گئی تھی کہ عصری درسگاہوں میں زیر تعلیم ہماری افرادی قوت کچھ تو دین، اخلاق اور تہذیب و شرافت سے آراستہ ہو جائے گی اور شاید اس طرح قوم کی ڈوبتی نیا کچھ سنبھل جائے گی۔ مگر تازہ اخباری خبروں نے ان امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا جن میں کہا گیا ہے کہ حکومت نئی تعلیمی پالیسی کو غیر حقیقت پسندانہ اور ناقابلِ برداشت اخراجات کی وجہ سے واپس لے رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے حالات میں دین اور دینی علوم کے تحفظ اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ و اشاعت کی صورت کیا ہوگی؟

دینی علوم کے تحفظ کے رہے سہے آثار کو مٹانے کی کوشش | ان حالات میں دینی علوم کا تحفظ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ آزاد عربی مدارسِ دینیہ ہی کا مرہونِ منت ہے جو الحاد اور تجدد کے علمبرداروں کی نگاہوں میں کھٹکتے رہتے ہیں، اور کروڑوں افراد کی فنی و عصری علوم کے لئے تگ و دو کرتے رہنے کے باوجود مدارس عربیہ کے طلباء کی قلیل تعداد کا اپنی زندگی کو دین اور محض علومِ دین کے لئے وقف کرنا ان کے لئے ناقابلِ برداشت مسئلہ بن گیا ہے اور کہا جارہا ہے کہ ان مدارس کی بساط لپیٹ دو، ان کی آزاد تعلیمی روح کو بھی کسی طرح سلب کر لو، انہیں امداد اور گرانٹ کے دامِ زرّیں میں پھنسا لو، ان کے آزاد اور ترجمانِ حق ضمیروں میں بھاری تنخواہوں کے تالے لگا دو، انہیں اوقاف کے شکنجے میں کس دو تاکہ رہی سہی جو صورت دین کی اشاعت کی رہ گئی ہے وہ بھی ختم ہو جائے ___ سوال یہ ہے کہ جب انگریزی، اردو سائنس، ریاضی، جغرافیہ اور ٹیکنیکل علوم کے لئے مخصوص افراد مخصوص مزاج اور مخصوص تربیت کی ضرورت ہے تو اسلامی علوم و فنون کو اس کلیہ سے کیوں خارج کیا جارہا ہے تمہیں ان چند گنے چنے مدارسِ عربیہ کے بوریہ نشینوں کی فکرِ معاش تو ہلکان کئے جارہی ہے مگر کیا آپ نے ملک کی عصری تعلیم گاہوں میں زیرِ تعلیم نوجوانوں کے دین اور علومِ دینیہ سے دن بدن اعراض و اجتناب کا بھی کچھ مداوا سوچا ہے: فاعتبروا یا اولی الابصار - (اکتوبر ۶۹ء)

نصابِ اسلامیات میں نفاق اور بے دینی کا بیج

مرکزی حکومت نے سکولوں اور عصری تعلیم گاہوں کے لئے اسلامیات کے نصاب کی از سرِ نو ترتیب و تدوین کے لئے جو کمیٹی نامزد کی ہے اس کے بارہ میں پچھلے شمارہ میں ہم نے اپنے خدشات کا اشارۃً ذکر کیا تھا۔ یہ مسئلہ عام مسلمانوں بالخصوص اہلِ علم اور دینی جماعتوں کے لئے جتنی توجہ کا مستحق تھا افسوس کہ اب تک اتنی ہی سرد مہری کا شکار رہا۔

ملک کی اکثریت اہلِ سنت سے ناانصافی | یہاں کی اکثریت (MAJORITY) سُنی مسلمانوں کی ہے جن کے عقیدہ کی اساس خلفاء راشدین کے تقدس اور تمام صحابہؓ کی عظمت پر قائم ہے۔ بچوں کے دینی نصاب پر مستقبل میں ان کے عقیدہ، دین اور نظریہ

کا دارومدار ہوتا ہے اگر اس عمر میں بچوں کے دل و دماغ کا نازک اور پاکیزہ آبگینہ کسی غیر اسلامی جارحیت سے مجروح ہو جائے تو عمر بھر اسے جوڑا نہیں جا سکتا ضرورت اس امر کی تھی کہ غیر سنی حضرات کو ان کی جائز نمائندگی دیتے ہوئے بھی اکثریت کی رعایت بہرحال رکھی جاتی اور ایسے لوگ سنی علماء میں سے بورڈ میں شامل کر لئے جاتے جن کا علمی تبحر، دینی حمیت اور ذہنی و فکری پختگی مسلّم اور مسلمانوں میں قابلِ اعتماد ہوتی اور جنہیں اسلامیات کی ترویج اور اشاعت سے والہانہ لگاؤ بھی ہوتا، اور وہ کسی بھی عقیدہ اور مسلمانوں کے کسی بھی قابلِ احترام شخصیت کے بارہ میں امت کی پوری نمائندگی کا حق ادا کر سکتے۔ مگر ہوا یہ کہ چند افراد کی اس کمیٹی میں نصف یا اس سے زائد نمائندگی شیعہ حضرات کو دی گئی اور وہ بھی ان کے مذہب کے پختہ اور ذمہ دار سرکردہ افراد کو، جب کہ آبادی کے تناسب سے شاید انہیں ۵/۱ نمائندگی بمشکل دی جا سکتی۔

مدوّنینِ نصاب کی اہلیت پھر دوسری ناانصافی یہ ہوئی کہ دو ایک افراد کو چھوڑ کر باقی سنی حضرات ایسے لئے گئے جنہیں نہ تو مسلمانوں کے جذبات اور معتقدات کے تحفظ سے گہرا اور جذباتی تعلق ہے نہ اسلامی علوم میں مناسب رسوخ اور گہرائی اور نہ انہیں عامۃ المسلمین کا اعتماد حاصل ہے۔ ایسے حالات میں ہمیں بجا طور پر خطرہ ہے اور اس کے بعض شواہد بھی سامنے آ چکے ہیں کہ ایسی کمیٹی جو نصاب تیار کرے گی اس میں نہ تو اکثریت کے جذبات کی پوری رعایت رکھی جا سکے گی اور نہ ابوبکر و عمر اور عثمان و معاویہ رضی اللہ عنہم کو ان کا صحیح مقام دیا جا سکے گا، نہ صحابہ کرامؓ کے باہمی اختلافات اور اسلام کی اولین تاریخ کو صحیح شکل میں پیش کیا جا سکے گا بلکہ "اختلافی مسائل" کے نام پر ان تمام باتوں کو نشانہ ستم بنایا جا سکے گا، ہمیں کسی فرقہ اور طبقہ سے کد نہیں، شیعہ تو کیا دیگر اقلیتی طبقوں کو بھی ان کے دین اور مذہب کے تحفظ کی ضمانت حاصل ہے۔ ہمیں ملکی یکجہتی اور ملی اتحاد بہرحال عزیز ہے۔ سنی مسلمانوں کے لئے تمام صحابہ کرامؓ واجب التعظیم ہیں کسی خلیفہ راشد اور صحابی کی عظمت سے انہیں اختلاف نہیں، سب

کو احترام اور محبت کی نظروں سے دیکھنا ان کا جزو ایمان ہے۔ لیکن اگر معمولی سی تعداد رکھنے والی شیعہ ذہنیت کو ان باتوں سے اتفاق نہیں اور وہ خواہ مخواہ دھڑے بازی اور عصبیت کی بناء پر ہماری ملی یکجہتی کو حق و ناحق اور ظالم و غیر ظالم کی تقسیم سے پارہ پارہ کرنا چاہتی ہے تو یہاں کی ایسے کسی بھی ارادہ اور سازش کو کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ جس سے مسلمان بچوں کا مستقبل مخدوش اور ان کا دینی ذہن مجروح ہو سکتا ہو اور نتیجۃً اس سے ہماری قومی یکجہتی بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ اس لئے لازمی ہے کہ ایسے کسی نصاب کمیٹی میں اقلیتی طبقوں کو ان کی شرح آبادی سے زیادہ نمائندگی نہ دی جائے پھر سُنّی مسلمانوں کی طرف سے بھی ایسے راسخ العقیدہ علماء لئے جائیں جن کا علم و عمل دینی تصلب، اسلامی حمیت مسلّم ہو، مسلمانوں کا ان پر اعتماد ہو اور تعلیم و تربیت سے متعلق امور میں بھی انہیں پورا تجربہ حاصل ہو۔ چند نام نہاد "ماہرین تعلیم" کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ملک کے سوادِ اعظم کے جذبات اور معتقدات کو اس طرح خطرہ میں ڈال کر خدشات اور بے چینی کی فضا پیدا کریں اگر حکومت نے بھی خدانخواستہ ایسے کسی نصاب کو جلدی میں منظور کر وا کر نافذ کرنے کی کوشش کی تو قوم دل اور ضمیر ایمان و یقین احساس اور شعور اسی طرح اسے ٹھکرا دے گی۔ جیسا کہ وہ عائلی قوانین اور اس طرح کے دیگر غیر اسلامی منصوبے بڑی حقارت سے ٹھکرا چکی ہے۔ اس لئے کہ مسلمان اپنے جگر گوشوں اور نونہالوں کو ابوبکرؓ کے دامنِ شفقت اور عمرؓ کے سایۂ عافیت سے نکال دینے کو اتنی آسانی سے برداشت نہیں کر سکیں گے۔ مئی ۱۹۷۰ء

نظامِ تعلیم کی نئی پالیسی کیا ہونی چاہئے

زندگی کے مختلف شعبوں میں اہم تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہونے والی حکومتیں عصری نظام و نصاب تعلیم کے بارہ میں بھی اپنی نئی پالیسیوں کا اعلان کرتی رہتی ہیں۔ ایسی کسی نئی تعلیمی پالیسی کے بارہ میں اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایسے نام نہاد اصلاحی اقدامات سے وہ توقعات پوری نہیں ہو سکیں جو ملک و ملت

کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لحاظ سے نظامِ تعلیم اور تعلیم سے وابستہ کی جا جا سکتی ہیں۔ ہر چند کہ موجودہ صدرِ محترم[1] کا ارشاد ہے کہ ہم دینِ اسلام کی روح اور دینی اقدار کو تعلیمی نظام میں سمو دینا چاہتے ہیں۔ مگر اس کی روشنی میں ہم جب ان کی نئی طویل الذیل تعلیمی پالیسی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہو جاتی ہے نہ صرف بحیثیت مسلم قوم بلکہ حالیہ ذلیل ترین شکست کے بعد ایک شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے ہمیں تعلیمی پالیسی اس بنیاد پر بنانی تھی کہ پورا تعلیمی نظام فرد اور معاشرہ کی اخلاقی اور ایمانی تربیت کا ذریعہ بن جاتا، وہ مایوسی کی بجائے ولولہ، شک اور اضطراب کی بجائے ایمان و یقین، خود فراموشی کی بجائے ضبطِ نفس کا موجب بنتا جو ایک بلند و برتر پاکیزہ اجتماعی مقصد اور اس کے لئے والہانہ جوش اور ولولہ سے سرشار کر کے قومی یکجہتی، اتحاد اور یگانگت کا ذریعہ بن سکتا اور وہ واضح حسین اور شفاف تصورِ حیات قوم کے منتشر شیرازہ کو ایک لڑی میں پرو دیتا اور جو اندر سے ایمان و یقین اور اخلاقی اقدار کی لہریں ابھار کر ہماری تمام اخلاقی و معاشرتی اور طبقاتی ناہمواریوں کا مداوا بن جاتا اور یہ سب کچھ تب ہوتا کہ ہم ایمان و یقین، خدا، رسولؐ، اسلام اور شریعت کو پوری تعلیم کا محور بنا دیتے۔ طبعیات، حیاتیات اور نفسیات کی کتابوں کو خدا کے تصور کے دائرہ میں لے آتے سائنس کو مذہب کا خادم بنا کر پیش کرتے، مادیات کو آخرت کا وسیلہ قرار دیتے، طالب العلمانہ دور کو نہ صرف تعلیم بلکہ ایک مہذب مسلمان شہری کی تربیت کے لئے غنیمت سمجھ لیتے۔ اس طرح ملک کی تعمیر ہو سکتی۔ انارکی اور جنسی و مادی طغیانیوں میں ڈوبتا ہوا معاشرہ ساحلِ مراد سے ہمکنار ہو جاتا تعلیمی پالیسی بامقصد ہونے کی صورت میں اخلاقی تربیت، تہذیبِ نفس کا ذریعہ بنتی اور پوری قوم کو متحد بنا کر اسے اجتماعی عمل اور جد و جہد پر اکساتی اور صحیح معنوں میں ایک اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا۔ اپریل ۱۹۷۲ء

---

[1] جناب ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت صدر تھے۔

شیخ الحدیث حضرت العلاّمہ مولانا مفتی محمّد فرید صاحب مدظلہ

نَحمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُولِہِ الکَرِیمِ اَمَّا بَعد!

چونکہ فقیر کو سوالنامہ متعلقہ کی تمام شقوں کے جوابات لکھنے کی نہ فرصت ہے اور نہ ہمت ہے۔ لہٰذا بعض سوالات کے جوابات لکھنے پر اکتفاء کرتا ہے:-

(۱) فقیر ائمہ اربعہ اور ان کے تلامذہ اور ہر مذہب کے فقہاء سے اور ان کی کتب سے متاثر ہوا ہے۔ اور ان کے علاوہ دیگر علماء اور ان کی کتب سے چنداں متاثر نہیں ہوا بلکہ جدید آراء کے قبول کرنے میں عجلت کرنے سے متنفر ہوتا ہے۔

(۲) ان سابق کتب اور ان کے مصنفین کی خصوصیات اتباعِ وحی، اعتماد علی السلف، اور مخلوق پر شفقت اور اتباعِ ھوٰی سے اجتناب ہیں۔

(۳) مجھے جرائد اور مجلات پڑھنے کی عادت نہیں۔ البتہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے مضامین کو پسند کرتا ہوں۔

(۴) فقیر جن اساتذہ اور مشائخ سے متاثر ہوا ہے اُن کے اسماء مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) میرے والد صاحب حضرت العلاّمہ مولانا حبیب اللہ صاحبؒ (م ۱۳۶۸ھ) فقیر اُن کے دقیق علم، سادگی اور مغلق مقامات کو مختصر الفاظ میں عام فہم کرنے سے متاثر ہوا ہے۔ (۲) حضرت العلاّمہ مولانا خان بہادر صاحبؒ مارتونگی (م ۱۳۹۶ھ)

فقیر ان کی ذکاوت اور دقتِ علم سے متاثر ہوا ہے۔ (۳) حضرت العلامہ مولانا محمد نذیر صاحبؒ جکیسری (م ۱۳۹۱ھ) فقیر ان کی قوتِ حافظہ اور شفقت سے متاثر ہوا ہے۔
(۴) حضرت العلامہ مولانا عبدالرازق صاحب شاہ منصوریؒ (م ۱۳۹۷ھ) اُن
رقتِ قلبی اور خوفِ خدا میں بے نظیر تھے (۵) شیخ الطریقت حضرت العلامہ مولانا خواجہ محمد عبدالمالک صدیقیؒ (م ۱۳۹۳ھ) فقیر اُن کے اخلاص، زُہد، توجہات سے متاثر ہوا ہے۔ (۶) شیخ الحدیث حضرت العلامہ مولانا نصیر الدین غورغشتویؒ (م ۱۳۸۸ھ) فقیر ان کے پختہ علم، توکل، کم گوئی اور انابت الی اللہ سے متاثر ہوا ہے۔ (۷) شیخ الحدیث حضرت العلامہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب کیمبل پوریؒ (م ۱۳۸۵ھ) فقیر ان کے پختگیٔ علم، کم گوئی سے متاثر ہوا ہے۔ (۸) شیخ الحدیث حضرت العلامہ مولانا عبدالحق صاحبؒ اکوڑوی (م ۱۴۰۹ھ) فقیر ان کے وسعتِ علم اور حسنِ تدبیر سے متاثر ہوا ہے۔

(۵) فقہ قدیم مثلاً مبسوط، بدائع، ھدایہ میں جدید مسائل کے مآخذ صراحۃً یا اشارۃً موجود ہیں اور قدیم علم کلام مثلاً شرح مواقف، شرح مقاصد، شرح عقائد میں جدید اعتراضات کے صراحۃً یا اشارۃً بیخ کن جوابات موجود ہیں۔

(۸) جب تک اسلامی اقتدار یا اہلِ علم کی تنظیم موجود نہ ہو تو اس مروجہ نصاب میں تبدیلیاں مضر ہیں، قدیم کی اہمیت ختم ہو جائے گی اور جدید حاوی نہ ہو سکے گا اور جب اسلامی اقتدار یا اہلِ علم کی مؤثر اور فعال تنظیم موجود ہو تو اس نصاب میں تبدیلیاں ضروری ہیں۔ عربیت کے فنون سے دلائل اور نکات بعد الوقوع کا خارج کرنا اور قرآن اور احادیث کے لغات اور محاورات ذکر کرنے والی کُتب کو داخل کرنا، اور حکمتِ قدیم اور ہیئتِ قدیم کی جگہ جدید حکمت اور ہیئت رائج کرنا اور جدید علم کلام کی کتب کی زیادت کرنا بہت اہم امور ہیں۔

محمد فرید عفی عنہ

حضرت مولانا محمد اشرف صاحب

صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ حسب وعدہ (گو بہت تاخیر سے) مطلوبہ مضمون میری مطالعاتی زندگی "حدیثِ ناگفتنی" کے عنوان سے بھیج رہا ہوں کہ جو بات سراپا حتا و سر اپنے تک محدود ہونی چاہیئے تھی اس کے اظہار اعلان سے اپنی کم سوادی کو رسوائے عام کر رہا ہوں۔ بہت سی باتوں سے شاید آپ کا اتفاق نہ ہو لیکن ع فیما یعشقون الناس مذاہب اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور اس ریا و نمائش سے درگذر فرمائے اور اس سیاہ کار کی اس سخن طرازی دہرزہ سرائی کو معاف فرمائے آمین کہ حقیقتاً ہر لحاظ سے صفر ہوں۔ اور دعا کا محتاج ہوں۔ (محمد اشرف ۹۲/۳/۱۵)

اللہ تبارک تعالیٰ کے فقیر پر جو بے شمار احسانات ہیں ان میں ایک بڑا احسان یہ ہے کہ علم و عمل کی جملہ کوتاہیوں کے باوجود اُس کے بہت سے نیک بندے اس بے مایہ سے حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ اس نیک گمانی کا کرشمہ ہے کہ اس شکستہ قلم ابجد ناشناس سے جواں سال و بزرگ خصال صاحب الحق (مولانا سمیع الحق صاحب سلمہ) مدیر ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک نے وہ چند سوال کر ڈالے جن کا مخاطب یہ نااہل کسی صورت میں نہیں۔ اپنی

مطالعاتی زندگی کی داستان سرائی پر صرف اس وجہ سے قلم اٹھا رہا ہوں کہ شاید اس تباہ حال کی یہ درازنفسی و پریشان حالی کسی کے لیے سببِ عبرت و سرمہ بصیرت بن جائے کہ اپنی بے ربط و بے انضباط زندگی اس لحاظ سے ایک المیہ ہے کہ استفادہ و افادہ کی جن راہوں کو کھولا جا سکتا تھا۔ وہ ناکشودہ رہ گئیں

ناکامی حیات نہ بودے دو روز بیش
آں ہم کلیم با تو چہ گویم چساں گزشت

تاہم ؎

میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

ابتدائی زندگی انسان ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ ماں کی گود، گھر، مکتب و معاشرہ انسان کو بناتا یا بگاڑ دیتا ہے۔ یہی وہ حقیقت کبریٰ ہے، جس کی طرف اشارہ حقائق کے سب سے بڑے نقاب کشا نبی الانبیاء حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

ما من مولود الا یولد علی الفطرة فابواه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه۔ (بخاری تفسیر سورہ روم)	کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت (دین توحید) پر پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ماں باپ اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔

فقیر نے بحمد اللہ تعالیٰ ہوش کی آنکھیں ایک دیندار گھرانے میں کھولیں۔ والد مرحوم[1]

---

[1] محمد اکبر خان ابن سکندر علی ابن سعادت خان ابن نور خان المتوفی ۲۱/ اکتوبر ۱۹۴۱ء مطابق ۲۹ رمضان ۱۳۹۰ھ نسلاً پٹھان تھے، پشاور وطن تھا۔ تجارتی کاروبار کافی وسیع تھا۔ (بقیہ صفحہ ۱۴۷ پر)

باوجود ایک بڑے تجارتی کاروبار کے صوم وصلوٰۃ کے پابند، متشرع اور اسلامی شعار واقدار کے گرویدہ تھے گو عالم نہ تھے، لیکن علمائے اہل حق سے قریبی روابط تھے، فارسی اور اردو کی دینی کتابوں کا اچھا مطالعہ اور فارسی ادب کا ذوق تھا۔ کیمیائے سعادت ہمیشہ مطالعہ میں رہتی تھی، فقیر منش اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ والدہ محترمہ دام ظلہا اچھی خاصی دینی معلومات کی حامل، نیکی وپارسائی کا نمونہ، ذکرواشغال وتلاوت کی پابند اور سخی وغریب پرور رہیں۔ والدہ محترمہ نے ترجمہ قرآنی اور اردو وفارسی میں اکثر متداول تفاسیر اور احادیث وفقہ وسیر کی متعدد کتابیں ہمارے تایا اور اپنے خالہ زاد بھائی مولوی حکیم غلام سرور صاحب سے پڑھی تھیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں وہ ہمیں کہانیوں کی بجائے انبیاء علیہم السلام کے قصّے اور واقعات ہر رات سناتی تھیں۔ بندہ نے قرآن کریم اپنی والدہ محترمہ سے پڑھا ہے اور ابتدائی فارسی والد مرحوم سے۔

والدہ محترمہ علمی وادبی ذوق پر آج حیران ہوتی ہیں۔ ان کے کتب خانہ میں اردو فارسی دینی کتب کے علاوہ مخزن لاہور، الہلال کلکتہ، تہذیب نسواں لاہور، پیشوا دہلی مولوی دہلی، عصمت دہلی، ساقی دہلی، ہزار داستان لاہور، نیرنگِ خیال، ہمایوں اور دیگر بیشتر ادبی اور دینی رسائل کے پرانے فائل کچھ عرصہ پیشتر تک موجود تھے، جن کا کثیر حصہ شملہ میں تقسیم کی نظر ہوگیا۔ اور کچھ ہماری نقلِ مکانی وغیرہ سے ضائع ہوگئے۔ بہرحال اس درازنفسی کا مطلب یہ ہے کہ بندہ نے گھر میں علمی ودینی وادبی فضا پائی۔ جس کی وجہ سے آٹھ نو سال کی عمر تک، توبۃ النصوح، مرأۃ العروس، بنات النعش، مسدس حالی جیسی کتابیں پڑھ چکا تھا اور اردو کا مطالعہ اچھا خاصا ہوگیا تھا۔ خیر یہ تو ضمنی بات

(بقیہ صفحہ ۱۴۶ سے) شملہ، دہلی، کلکتہ، دارجلنگ وغیرہ میں دکانیں تھیں اس سلسلہ میں اکثر وقت دہلی وشملہ میں گذرتا تھا۔ ۱۹۰۱ء سے شملہ جانے کا دستور تھا۔ وہیں جائداد بنائی اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

تھی، جس کا اظہار اپنے بچپن کے ماحول کے اظہار کے لیے ضروری تھا۔

بندہ کی کم نصیبی ہے کہ کسی دینی مدرسہ یا دارالعلوم میں ابجد خوانی کا شرف حاصل نہ ہو سکا بلکہ جو شُد بُد نصیب ہوئی وہ اصلاً والدین کی برکت، مسجد کا فیض اور ثانوی و ادنیٰ درجہ میں سکول و یونیورسٹی کی تعلیم کا نتیجہ ہے

بندہ کو سب سے پہلے جس کتاب نے متاثر کیا۔ وہ پہلی جماعت کی کتاب "اسلام کی پہلی کتاب[1]"، (شائع کردہ انجمن حمایت اسلام لاہور) تھی۔ جس کے الفاظ مدت گذر جانے کے بعد بھی کچھ کچھ یاد آتے ہیں۔

"اللہ ایک ہے، پاک اور بے عیب ہے، اس جیسا کوئی نہیں۔ اس نے سب کو پیدا کیا، وہ سب کا پالنے والا ہے[2]"

---

[1] - انجمن حمایت اسلام لاہور کی دینی خدمات میں اس کی اسلام کی پہلی کتاب سے چودہویں کتاب تک کا قدیم سلسلہ جو مولوی اسمٰعیل میرٹھی اور مولانا عبدالرحیم صاحب کا تیار کردہ تھا بہت کارآمد و مفید تھا۔ اس سلسلہ کا خاص امتیاز اردو کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مفید معلومات تاریخ اسلام اور دینی علوم کا تعارف تھا۔ سیرۃ النبیؐ کے علاوہ مسنون دعائیں ترغیب و ترہیب منذری کا آسان زبان میں خلاصہ پانچویں سے نویں کتاب تک آگیا تھا۔ احادیث ترغیب و ترہیب کا اثر اخلاق سازی میں بیّن و ظاہری ہے۔ دسویں جلد تاریخ پر تھی وقس علی ھذا۔ بحمد للہ بندہ نے چوتھی جماعت تک یہ پورا سلسلہ پڑھ ڈالا تھا۔

[2] ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک ایسی کتابیں کہیں کہیں مدارس میں رائج تھیں، ہماری تعلیمی تاریخ کا یہ بھی المیہ ہے کہ پھر جو کتابیں آئیں انکے ابتدائی فقرے توحید باری کی بجائے یہ تھے: "ابا بیٹھا حقہ پی رہا ہے" اماں چرخہ کات رہی ہے"، پھر مزید ترقی ہوئی تو یہ الفاظ آئے "بلی آئی چوہا دوڑا"، اب MUMMY SNGS, FATHER DANCES یعنی ماں گاتی ہے، باپ ناچتا ہے۔ انا للہ

توحید کا جو نقش ان سیدھے سادے الفاظ میں دل پر مرقسم ہوا۔ بحمد للہ تعالیٰ اعمال کی بے شمار کوتاہیوں کے باوجود شرک و بدعات سے نفرت کا سبب بن گیا اور پھر چند سال بعد جب مسدس حالی پڑھی تو اس کے یہ الفاظ رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے۔

یہ سنتے ہی تھرا گیا گلہ سارا ۔۔۔ یہ راعی نے للکار کر جب پکارا
کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق ۔۔۔ زبان اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق ۔۔۔ اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ ۔۔۔ جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

بچپن اور مطالعہ گھر کے ماحول کی وجہ سے بچپن میں شوق مطالعہ اس قدر جوان تھا کہ سکول کی لائبریری کے علاوہ جو کتاب، رسالہ یا اخبار مل جاتا تھا۔ پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس سلسلے میں دس بارہ سال کی عمر تک رطب ویابس کے ڈھیر پڑھ ڈالے۔ چوتھی جماعت میں ایک ہندو استاد نے "تسہیل الاملا" نامی ایک کتاب کا پتہ دیا۔ یہ "تسہیل" عربی، فارسی اور اردو کے مشکل و ثقیل الفاظ کا اچھا خاصا مجموعہ تھا۔ بندہ نے نہ صرف اس سے "املا" کے لیے استفادہ کیا بلکہ ان کے الفاظ و معانی کو یاد کر لیا جس کا آئندہ اردو کتابیں کے پڑھنے میں بہت فائدہ ہوا۔

اسلامی تاریخ کا شوق والدہ محترمہ مدظلہا کے بیان کردہ تاریخی قصوں سے پیدا ہو چکا تھا۔ ان دنوں گرمی ہم شملہ میں گزارا کرتے تھے۔ وہاں ہمارے مکان کے قریب ایک لائبریری تھی جہاں کتابیں کرایہ پر پڑھنے کے لیے ملتی تھیں۔ تیسری جماعت میں تھا سکول سے آتے ہوئے ایک تاریخی ناول "فتح یرموک" مصنفہ صادق صدیقی سردھنوی کرایہ پر لیا۔ اور چونکہ والد مرحوم ناول پڑھنے سے منع کرتے تھے اس لیے بستہ میں چھپا کر لایا اور گھر والوں کی نظر بچا کر بستر میں کتاب پڑھنا شروع کی۔ میری ہیئت کذائی نے غمازی کی اور بڑے بھائی محمد اکرم صاحب نے بھانپ لیا، کمبل ہٹایا، دیکھا تو ناول

تھا جس کے پہلے باب کا عنوان تھا "تیر نظر"۔ بندش نے شوق کو مہمیز کیا چپکے چپکے پہلے صادق صدیقی اور پھر مولانا عبد الحلیم شرر کے تقریباً سب تاریخی ناول پڑھ ڈالے۔ صدیقی کی فتح الطائیکہ اور شرر کے ماہ ملک عبد العزیز ورجینا۔ اور فلورا فلورنڈا وغیرہ سے طبیعت تے اثر لیا۔ اسی پانچ سات سال کے عرصہ میں پرانی طرز کے قصّوں کی کتابیں گل بکاولی قصہ چہار درویش، قصّہ ممتاز، حاتم طائی، طلسم ہوشربا، فسانہ آزاد وغیرہ نظر سے گذریں۔ (آہ! زندگی کے قیمتی لمحات کہاں صرف ہوئے)

مطالعہ کا ایک پوشیدہ رخ یہ تھا۔ دوسری طرف گھر میں اردو میں جو دینی ذخیرہ کتب موجود تھا۔ اس کا کثیر حصہ بھی مطالعہ کی زد سے باہر نہ رہا۔ تفسیر حقانی۔ احسن التفاسیر، موضح القرآن۔ ترجمہ حضرت تھانوی۔ ترجمہ تجرید بخاری، بہشتی زیور وغیرہ اسی زمانہ میں نظر سے گذریں۔ ابن تیمیہ کی کچھ کتابوں کے تراجم۔ اکسیر ہدایت ترجمہ کیمیائے سعادت۔ درۃ الناصحین۔ کچھ تاریخی کتب بھی اسی دور میں پڑھیں۔ مزید برآں نئے اور پرانے رسائل و اخبارات کا مطالعہ بھی جاری رہا۔ آج تک الہلال کے وہ فائل آنکھوں کے سامنے ہیں جو بڑی تقطیع اور چکنے کاغذ پر ٹائپ میں چھپے ہوتے تھے۔ اور جن میں ابوالکلام مرحوم کی پہلے دور کی الہلالی اردو جو اپنی برنائی و روانی شان و شوکت اور تحدیانہ اسلوب میں اپنی خاتم آپ تھی اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ مخزن کے پرانے فائل، الہلال جدید ہزار داستان، نیرنگ خیال، ہمایوں، زمانہ، تہذیب نسواں، رومان وغیرہ کونسے رسالے تھے جو مطالعہ میں نہ آتے ہوں۔ راتیں بیت جاتی تھیں لیکن مطالعہ کا شوق ختم نہیں ہوتا تھا۔ یہاں مولانا ظفر علی خاں کے زمیندار کے اداریوں کا تذکرہ بھی بیجا نہ ہوگا جو مسلمانوں کی شریفانہ اور غیر تمندانہ صحافت کا نقیب اور ادب کی ایک خاص صنف کا نمونہ تھا۔

صاف ظاہر ہے کہ اس رطب و یابس کا مطالعہ ہر صورت مفید نہیں ہوسکتا اور

اپنی ادبیت کے باوجود عمر عیار[1] کی عیاریاں خوجی کی قرولی[2]، کوہ ندا کی صدائیں سب افسانہ فسوں اور بے فکر و آزاد اذہان کی پیداوار اور مسلمانوں کے دورِ زوال کی یادگار ہیں۔

سکول کے زمانہ میں جن شعراء نے زیادہ متاثر کیا وہ حالی، اقبال اور حفیظ جالندھری تھے۔ مسدس حالی، بانگِ درا اور شاہنامہ اسلام کے صفحات ازبر تھے اور ان سے گونہ ایمانی قوت و ملی حمیت پاتا تھا۔ بارہا اقبال کی بعض نظموں نے اشکبار کیا۔ مسدس حالی کی نعت میں اشعار سہل، ممتنع اور اپنا جواب آپ ہیں۔ آج بھی ان کی تازگی و حلاوت میں فرق نہیں آیا۔ حفیظ کا سلام، صحرا کی دعا، بدر و اُحد کے معرکے اردو نظم میں خاصہ کی چیزیں ہیں۔ سکول کے زمانہ میں تعلیم دینی کتب میں سے سب سے زیادہ اثر اکسیر ہدایت ترجمہ کیمیائے سعادت کا رہا۔

کیمیائے سعادت امام غزالیؒ کی آخر عمر کی تصانیف میں سے ہے۔ ان کی زندگی کے تجارب کا نچوڑ اور احیاء العلوم کے مبہم مباحث کا خلاصہ ہے۔ ترجمہ کیمیائے سعادت سے احیائے علوم کے ترجمہ مذاق العارفین کا شوق پیدا ہوا۔ احیاء کی وہ تاثیر آج بھی یاد ہے کہ چند سطریں پڑھ کر دل بیٹھتا معلوم ہوتا تھا جس کی وجہ سے کئی مرتبہ کتاب کا مطالعہ رک جاتا تھا۔ غزالیؒ نے جس حال و کیفیت میں احیاء کو لکھا ہے۔ اس کا کیف ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے اور ان کے دل کی دھڑکن ہر لفظ سے سنی جا سکتی ہے

عربی کتب کا مطالعہ | میری علمی زندگی میں ۱۹۴۰ء، ۱۹۴۱ء خاص اہمیت کے سال ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں بندہ نے اپنی عمر کے پندرہویں سال میں میٹرک پاس کیا۔ امتحان کے بعد حضرت الاستاذ[4] مولانا نورالاعظم ابن منصور علی باجوڑی رحمۃ اللہ علیہ کی عنایت و توجہ سے

---

[1]، [2]، [3] بالترتیب طلسم ہوشربا، فسانہ آزاد، حاتم طائی کے قصوں کی طرف اشارہ ہے۔

[4] حضرت الاستاذ مولانا قاضی نورالاعظم صدیقی باجوڑی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے قدیم مساجد کے طرز تعلیم کی ایک عمدہ یادگار تھے۔ حدیث شریف میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ فقہ حنفی (بقیہ ص ۱۵۲ پر)

(عربی میں) حدیث شریف کے باقاعدہ مطالعہ کی ابتدا ہوئی اور اس ہیچمدان کی عربی ابجد خوانی کی داغ بیل پڑ گئی۔

(بقیہ ص۱۵۱ سے) پر گہری اور وسیع نظر تھی۔ فقہی مسائل کا خصوصاً فقہ حنفیہ کا استحضار خوب خوب تھا۔ تاہم فقہی مسلک میں وسیع المشرب تھے۔ متداول علوم عربیہ میں مہارت تھی۔ آپ کا سلسلہ حدیث دو واسطوں۔ (۱) حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب دربھنگوی مدظلہ۔ ۲. مولانا شاہ رسول صاحب بالاگر ڈھوی سرحدی ؒ سے قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبدالرشید صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہ سے منسلک تھا۔ بیعت طریقت مجاہد کبیر حضرت حاجی فضل احمد صاحب ترنگزئی نور اللہ مرقدہ (المتوفی ۱۴ دسمبر ۱۹۳۷) سے تھی۔ (حاجی صاحب ترنگزئی قادریہ سلسلہ میں حضرت نجم الدین اخوندزادہ معروف بہ ہڈے ملا صاحب سے بیعت تھے۔ حضرت حاجی صاحب کی تمام عمر انگریزوں سے جہاد میں گذری۔)

استاذ مرحوم کا نسب سیدنا ابوبکر صدیق ؓ سے جا ملتا ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد اسلام کی ابتدائی صدیوں میں پہلے مشہد آئے پھر افغانستان منتقل ہوئے۔ ان بزرگوں کا مشغلہ تعلیم و تعلم تھا۔ اس لیے مدتوں افغانستان میں قضا کا عہدہ ان کے خاندان میں رہا۔ آخر ش بعض نامساعد حالات کے پیش نظر کنڑ ہوتے ہوئے حضرت الاستاذ کے مورث اعلیٰ آزاد قبائل کے علاقہ باجوڑ میں متوطن ہو گئے۔ اس علاقہ میں بھی قضاۃ عہدہ انہیں کے خاندان میں رہا۔ استاذ مرحوم کے پردادا عثمان علی بڑے جید عالم تھے اور علاقہ میں ان کا بڑا اثر تھا۔ عثمان علی کے بیٹے حضرت علی بھی عالم تھے۔ ان کے بیٹے استاذ مرحوم کے والد منصور علی گو عالم نہ تھے۔ تاہم علم طب میں مہارت تھی، طبابت کا کام کرتے تھے علاقہ انبار میں کچھ مدت فروکش رہے اور وہاں بمقام خوگہ ۱۹۰۰ء میں استاذ مرحوم (بقیہ ص۱۵۳ پر)

برصغیر پاک و ہند میں مدارس کے اجراء و شیوع سے پیشتر مساجد میں علماء کے

(بقیہ ۱۵۱) سے اکی پیدائش ہوئی۔ استاذ مرحوم کا بچپن انبار میں گذرا۔ پھر والد اپنے علاقہ باجوڑ (سلارزئی) چلے گئے۔ ابتدائی کتابیں اپنے علاقہ کے علماء سے پڑھیں۔ پھر صرنگ مروزئی (تحصیل چارسدہ) میں تحصیل علم کے لیے مقیم ہوئے اور صرنگ کے صاحب الحق صاحب سے فلسفہ اور منطق کا درس لیا۔ ۱۹۲۷ء میں پشاور آئے اور یہاں مختلف علماء سے فقہ اور دیگر متداول علوم حاصل کیے۔ پھر اہل حدیث پشاور کے مدرسہ میں داخل ہو کر حدیث وغیرہ سے باقاعدہ فراغت حاصل کی۔ اور پھر درس و تدریس میں آخر وقت تک مصروف رہے۔

حضرت الاستاد زہد و ورع اور تقویٰ کا نمونہ تھے۔ تقویٰ کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بندہ فجر کے بعد اور پھر مغرب کے بعد حضرت سے حدیث کا درس پڑھتا تھا۔ کمرہ میں روشنی کی ضرورت پڑھتی تھی بجلی موجود تھی لیکن فرماتے تھے کہ واقف کی نیت کے دوران میں بجلی کے استعمال کی اجازت ہے۔ اس لیے ہم اپنے لیے نہیں جلا سکتے تھے۔ چنانچہ بندہ کو چراغ کی روشنی میں اکثر کتابیں پڑھائیں۔ طلبہ کو لوجہ اللہ پڑھاتے تھے۔ بندہ تقریباً بارہ سال ان سے پڑھتا رہا لیکن بندہ سے کبھی ایک حبہ تک قبول نہیں فرمایا۔ طبیعت عزلت نشینی کی طرف مائل اور نام و نمود شہرت سے نفور تھی۔ صلہ رحمی اور اقرباپروری کا جذبہ غالب تھا۔ شفقت و رأفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تلامذہ کے ساتھ پدرانہ محبت سے پیش آتے تھے۔ عمر بھر تجرد کی زندگی گزار دی۔ آپکے مختلف کتابوں کے اسباق مختلف طلبہ کے ساتھ فجر کی اذان سے شروع ہوتے اور عشاء کے بعد تک جاری رہتے تھے۔ درمیان میں وقفہ صرف حوائج بشریہ اور عصر کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی غرض سے ہوتا تھا۔ معاشی ضرورتوں کے لیے طب کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ جو مریض آجاتا اسے نسخہ لکھ دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ میں شفا دی تھی چاہتے تو بہت کچھ کما لیتے لیکن اس میں بھی رزق کفاف پر قناعت تھی۔ تقریباً باسٹھ

(باقی ۱۵۴)

اپنے "درس" ہوتے تھے۔ استاذ مختلف طلباء کو فرداً فرداً اسباق پڑھاتا تھا۔ اور جب انکی ایک کتاب ختم ہو جاتی تو دوسری کتاب شروع کرا دیتا تھا۔ اس قدیم[1] طرز پر ہمارے

(بقیہ صـ۱۵۳ سے) تقریباً باسٹھ سال کی عمر میں حج کے موقع پر عرفات سے مزدلفہ کی واپسی پر اچانک طبیعت بگڑی اور ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ کو جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور وہیں مدفون ہوئے۔

(بقیہ صـ) ۱۔ احادیث کی امہات الکتب کا نرا ترجمہ محض اردو میں پڑھ لینا متعدد قباحتوں کا مورث و سبب بن سکتا ہے۔ فقیر کے نزدیک چکڑالویت و پرویزیت کے برگ و بار نرا اردو میں احادیث کے پڑھنے سے پیدا ہو جاتے ہیں، خصوصاً جبکہ استاد کی راہنمائی یا کسی اچھے محشی و شارح کے حواشی بھی نہ ہوں۔ علوم عربیہ فنون تفسیر و حدیث و فقہ سے ناواقفیت حدیث کے منشاء اور صحیح مطلب کے سمجھنے میں رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے اور آخر ش انکارِ حدیث کی راہ کھل جاتی ہے۔ تاہم جو کتب محقق علماء نے عصر حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر لکھی ہیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

۱۔ اس طرزِ تعلیم کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہر طالب علم فرداً فرداً استاذ کی پوری توجہ سے مستفید ہو سکتا تھا اور استاذ شاگرد کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر اس کی استعداد کے بقدر اسے اپنے علوم سے بہرہ مند کرتا تھا۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہر طالب علم استاذ کی نگرانی میں پوری کتاب پڑھتا تھا اور چونکہ روزانہ استاذ سے بالمشافہ درس لینا اور سبق سنانا پڑتا تھا۔ اس لیے ہر طالب علم تیار ہو کر جاتا تھا۔ اور سبق کے دوران میں پورے تیقظ و دھیان سے استاذ کی تقریر سنتا، سمجھتا اور اسے ہضم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اچھے اساتذہ اپنے تلامذہ کی جانچ و امتحان کے ساتھ ان کی صلاحیتوں کو اجاگر اور بارآور کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اس درس میں استاذ کا تعلق محض تعلیم و تدریس کا نہیں ہوتا تھا بلکہ استاذ ایک شفیق مربی و اتالیق بھی ہوتا تھا۔

آبائی محلہ (محلہ مقرب خان پشاور) کی مسجد میں حضرت الاستاذ مرحوم کے "درسوں" کا سلسلہ قائم تھا۔ مختلف طلبہ کے اسباق ترجمۃ القرآن[1] سے لے کر جلالین و بیضاوی تک منیۃ المصلی سے ہدایہ تک مشکوٰۃ سے لے کر صحیح بخاری تک بشرط گنجائش وقت جاری رہتے تھے۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ سے ہیچمدان نے حرفاً حرفاً مشکوٰۃ شریف، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، جامع ترمذی و نسائی پڑھی۔ اور ابن ماجہ اور دیگر کتب کا ان کی نگرانی میں خود مطالعہ کیا صحیح بخاری کا حاشیہ سہارنپوری (حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری) بھی استاذ مرحوم نے سبقاً پڑھایا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ شروحِ حدیث سے ایک گونہ مناسبت ہوگئی۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری کا حاشیہ صحیح بخاری کی مختصر شروح میں خاصہ کی چیز ہے۔ فقیر کی محسن کتابوں میں اس حاشیہ کو ایک اونچا مقام

---

[1] حضرت الاستاذ کے ہاں فقہ میں (اصول فقہ کی کتابوں کے علاوہ) ترتیب یہ تھی۔ منیۃ المصلی قدوری، کنز، مستخلص، شرح وقایہ، ہدایہ ہدایہ کے اسباق کی تیاری میں استاذ مرحوم کے اپنے مطالعہ میں مولانا عبدالحئی فرنگی محل کے حواشی کے علاوہ فتح القدیر و کفایہ وغیرہ رہتی تھی۔ سبق میں حنفی مسلک کو احادیث سے خوب مدلل کرتے تھے۔ حدیث شریف میں ترتیب یہ تھی۔ مشکوٰۃ، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، جامع ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ موطا امام مالک۔ موطا امام محمد ان کے اپنے مطالعہ میں حواشی کے علاوہ بعض متداول شروح ہوتی تھیں۔ فارسی کا نصاب یہ تھا۔ پنج گنج۔ بوستان، گلستان، انوار سہیلی، یوسف زلیخا۔ سکندر نامہ (بعض اوقات دیوانِ حافظ بھی پڑھا دیتے تھے)۔

حاصل ہے۔ محدث سہارنپوری نے مطول شروح کا عطر کھینچ لیا ہے۔ ایک مبتدی طالب علم کو مختصر و موجز شروح و حواشی بخاری میں اس سے بہتر رہنما کم ہی ملے گا۔ صحیح بخاری کی مطول شروح میں جیسے فتح الباری وسعت، دقیقہ سنجی اور علوم کی فراوان میں اور عمدۃ القاری عمق اور حنفی نقطہ نظر کی ترجمانی میں بے مثل ہیں۔ اس طرح یہ مختصر حاشیہ ایجاز احتوا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ متوسط شروح میں قسطلانی (ارشاد الساری) خوب ہے۔ جدید شروح بخاری میں فیض الباری علامہ حافظ سید انور شاہ صاحب الکشمیریؒ کے علوم عمیقہ طرز انیقہ معارف تنبکرہ کا خزینہ اوران کی وسعتِ فکر و نظر کی ترجمان اور گوناگوں خصائص و مزایا کی حامل ہے۔ (کاش معارفِ انوریہ کا یہ خزینہ کلکِ[۱] یوسفی سے مزید گراں بار ہو پاتا)

شیخ الحدیث مسند الوقت حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری مدظلہ کی جدید تصنیف لامع الداری علی جامع البخاری خصوصاً اس کا مقدمہ حضرت شیخ کے متبحرو تدقیق مہارت فن و تحقیق کا شاہکار ہے۔ ایسے تو تمام مباحث ہی قابلِ دید اور حرزِ جاں بنانے کے لائق ہیں۔ لیکن اصول تراجم بخاری کو جس شرح و بسط سے کھولا ہے۔ تراجم بخاری پر جس دقیقہ رس اور نکتہ سنجی سے کلام فرمایا ہے اور تراجم کے متعلق ابواب کی جو ستر مفاتیح مہیا فرمادی ہیں وہ حضرت شیخ ہی کا حصہ ہے[۲]۔

---

[۱] - حضرت علامہ سید محمد یوسف البنوری مدظلہ

[۲] - علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں اپنے بعض شیوخ سے نقل کیا ہے کہ بخاری کی شرح کا قرض امت پر ہے۔ (کہ اس وقفہ وقت تک علماء امت میں سے کسی نے بھی بخاری کی شایان شان شرح نہیں لکھی تھی) حافظ ابن حجر کے شاگرد حافظ شمس الدین سخاوی نے الضوء اللامع میں لکھا ہے کہ "قرض" علامہ ابن حجر نے فتح الباری لکھ کر پورا (بقیہ صفحہ ۱۵۸ پر)

صحیح بخاری | حضرت الاستاذؒ کا فیض و برکت۔ امام بخاری کا اخلاص۔ الجامع الصحیح کی نورانیت ندرت و البیلا پن تھا کہ بحمد اللہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ دل و دماغ پر چھا گئی۔ اور ایک عرصہ تک اس کی تلاوت قرآن کریم کی طرح روزانہ کرتا رہا۔ کتب حدیث میں سب سے زیادہ تأثر اس عظیم کتاب کا رہا۔ بخاری شریف صرف صحیح روایات حدیث کا ہی گنجینہ نہیں بلکہ بخاری کے وفور علمی ذہانت و نقاہت نے اسے خزینہ علوم بنا دیا ہے اگر کسی طالب علم پر بخاری شریف اپنے مالہ و ما علیہ کے ساتھ کھل جائے تو یقیناً علوم حدیث کا دروازہ اس پر وا ہو جاتا ہے۔ ایسے بھی "صحاح" میں اصل محنت ایک کتاب پر ہی ہوتی ہے۔ وہی "متن" بن کر باقی کتب کو اپنا حاشیہ و شرح بنا لیتی ہے۔ احاطہ احادیث اثر پذیری اور دیگر فوائد مہمہ کے لیے کتب صحاح و دوسری کتب احادیث و اسفار سنن کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ تاہم اگر طالب علم ایک کتاب پر پوری محنت کرے تو دیگر کتب احادیث سے استفادہ آسان و ممکن ہو جاتا ہے اور دیگر علوم میں بھی امہات الکتب کا یہی حال ہے کہ ایک میں مہارت دوسری کتابوں کی اکثر گرہ کشا ہو جاتی ہے حضرۃ الاستاذؒ فرماتے تھے کہ "اس کتاب (بخاری شریف) کی ایسی برکت ہے کہ اگر اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لیا تو انشاء اللہ کہیں رکاوٹ نہیں ہو گی"۔ اصلاحِ باطن کے لیے صحیح بخاری

(بقیہ ص۱۵۶ سے) کر دیا ہے۔ حضرت الاستاذ علامہ یوسف البنوری نے تحفۃ العنبر ص۱۰ میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کا قول مجھ تک پہنچا ہے کہ حافظ ابن حجر سے تراجم صحیح بخاری کا حق پورا نہ ہو سکا۔ حضرت علامہ بنوری فرماتے ہیں کہ "شیخ الہندؒ نے جو صحیح بخاری کے ابواب کی شرح لکھنی شروع فرمائی تھی اگر مکمل ہو جاتی۔ تو انشاء اللہ تراجم کا حق بھی ادا ہو جاتا۔ لیکن افسوس وہ کام مکمل نہ کر سکے تاہم جو حصہ انہوں نے تالیف فرمایا اور شائع ہوا وہ مستفدین کیلئے چراغ و معیار ہے۔ ہیچمدان راقم کم مائیگی کا معترف ہے۔ تاہم خیال آتا ہے کہ حضرت الشیخ مدظلہ کے مقدمہ لامع الدراری سے شاید یہ قرض ادا ہو گیا۔ (واللہ اعلم)

کی کتاب الرقاق اور جامع ترمذی کے ابواب الزہد والرقاق کا بار بار مطالعہ بہت مفید رہا۔

کتب صحاح اور انکی شروح | صحیح مسلم کی شروح میں امام نووی کی شرح عام و متداول ہے اور سہولت و اختصار کے لحاظ سے طلبہ کے لیے بہت مفید ہے۔ فتح الملہم گو مکمل نہ ہو سکی۔ تاہم شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا قابل فخر کارنامہ ہے۔ ابوداؤد کے قاری کے لیے بذل المجہود سے مفر نہیں۔ جامع ترمذی کی شرح میں مخدومی الاستاذ علامہ محمد یوسف[1] صاحب البنوری کی مبسوط شرح معارف السنن اسم بامسمی مصنف کے وفور علمی وسعت و دقت نظر حذاقت و مہارت فن پر شاہد اور عمق و تحقیق کا نمونہ ہے مباحث فاضلہ، دقائق فائقہ، حقائق رائقہ، معلومات واسعہ، معارف عالیہ و رموز عجیبہ پر مشتمل ہے۔ علامہ موصوف نے اس کتاب میں نہ صرف اپنے یگانہ روزگار استاد علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کے علوم و تحقیقات کو یکجا کر دیا ہے بلکہ محول محدثین

---

[1] یوسف اقلیم فضل وکمال مخدومی الاستاذ العلامہ السید محمد یوسف صاحب البنوری المشاوری مدظلہ حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کشمیری کے جانشین و عاشق ان کے علوم کے راویہ اپنی ذات میں اسلامی علوم کا چلتا پھرتا جامعہ حدیث و فقہ و تفسیر کے متبحر ناقد عالم عظیم ادیب اور بحر العلوم ہیں۔ حسن اخلاق، جود و سخا، تقویٰ و ورع، خشیت و رقیق القلبی، شیریں کلام و حسن و بیان میں نمونہ۔ دقت نظر۔ وسعت معلومات۔ کثرت مطالعہ میں اپنی نظیر آپ اور حافظہ اور استحضار علوم کے بادشاہ ہیں۔

ع بسیار شیوہ ہا است بتاں راکہ نام نیست

فقیر کو بھی حضرت علامہ مدظلہ سے حدیث شریف کی سند و اجازت سے سعادت حاصل ہے۔

اور ائمہ اعلام کے نوادرات علمی کا مفید و جامع ملخص پیش کر دیا ہے۔ مسلک حنفیہ کو احادیث مبارکہ کی روشنی میں جس عدل و فراخدلی اور وضاحت و خوبی سے منقح و مبرہن فرمایا ہے۔ قابل داد اور حیرت انگیز ہے[۱]۔

اہمیت احادیث نبوی کتب حدیث کے بحر ذخار کی شناوری مجھ جیسے بے مایہ کی بساط نہیں۔ علوم و ملفوظات نبویہ کا یہ خزینہ سید الانبیاء حبیب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انوارات کا حامل ہدایت ربانی کا سرچشمہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی کا کرشمہ انی اوتیت جوامع الکلم کی تفسیر منشاءِ رسالت کا محافظ اور قرآن کا علمی و حقیقی بیان و ترجمان ہے۔ کتب حدیث کا دائمی مطالعہ و ممارست صحبتِ نبوت کے انوارات و فیوض و برکات سے ایک گونہ بہرہ مند کر دیتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے اھل الحدیث ھمو اھل النبی و ان لم یصحبوا نفسہ انفاسہ صحبوا۔ اثر پذیری کے لیے حدیث شریف کے مختلف مجموعے مطالعہ میں رکھے جا سکتے ہیں: جمع الفوائد، کنز العمال[۲]، مجمع الزوائد، فیض القدیر، مشکوٰۃ وغیرہ "تجویدی" مطالعہ کے لیے مفید ہیں۔ حسنِ عمل اور اعمال میں "ایمانی و احتسابی" کیفیت پیدا کرنے کے لیے ترغیب و ترہیب و فضائل اعمال کی احادیث کا مطالعہ ناگزیر ہے[۳]

۱۔ اس وقیع کتاب کی چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ انشاء اللہ دس جلدوں میں (مع مقدمہ کے) مکمل ہو گی۔

۲۔ اپنی تشنہ تکمیل کتاب "نظام ہدایت" کے صلسلہ میں کنز العمال کے بالاستیعاب مطالعہ سے بہت فائدہ پہنچا۔

۳۔ اس سلسلہ میں عربی میں ترغیب و ترہیب منذری۔ ریاض الصالحین و کتاب الاذکار نووی اور اردو میں معارف الحدیث مولانا منظور احمد نعمانی مدظلہ شیخ الحدیث (بقیہ صفحہ ۱۶۰ پر)

فن علوم حدیث نوع در نوع علوم کا مجموعہ ہے۔ مہارتِ فن و مناسبت ان علوم کی بہم تحصیل ہی سے ممکن ہے ورنہ ہر گام پر لغزشِ پا کا اندیشہ ہے۔

بات لمبی ہو گئی۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ حضرت الاستاذ مولانا نور اعظم ابا جوڑی کی شفقت نے حدیث مبارکہ کے کوچہ تک پہنچا دیا۔ ان کا یہ احسان اتنا عظیم ہے کہ اس سے سبکدوشی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ گو اپنی نااہلی سے استاذ مرحوم یا اس فن شریف کا حق تو ادا نہ کر سکا "تاہم" نفساتِ نبوت"، کی نسیم جانفزا کا ایک جھونکا بھی مایہ سعادت ہے ورنہ

ان کی حریمِ ناز کہاں اور ہم کہاں نقش و نگار پردہ در دیکھتے رہے

اردو تراجم قرآن و تفاسیر | اردو کے تفسیری لٹریچر میں حضرت اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کے بیان القرآن، علامہ شبیر احمد عثمانی کے حواشی، تفسیر ماجدی اور احسن التفاسیر سے فقیر نے بھر پور استفادہ کیا۔ بیان القرآن (تھانوی) اردو کی احسن التفاسیر ہے مصنف کے محتاط قلم نے اس تفسیر میں اپنے خداداد علوم معارف کے ساتھ تفاسیر ماقبل کا خلاصہ، روح المعانی کا عطر اور اقوالِ مفسرین میں راجح قول کو کمال حسن کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ تفسیری باریکیاں، علمی نکات کا بیان اور ذہنی اشکالات کا حل اس انمول تفسیر کا خاصہ ہے۔ عربی بلاغت و معانی و لغت کی مشکلات "حل اللغات" کے مستقل عنوان سے واضح فرمائی ہیں[۲]۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے حواشی قرآنی باوجود ایجاز و اختصار

(بقیہ ۱۵۹ سے) حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کا مجموعہ فضائل اور چھوٹے بچوں کے لیے جنت کی کنجی اور دوزخ کا کھٹکا (مولانا احمد سعید دہلوی) مفید ہیں۔ لہ۔ محمد علی ایم۔ اے لاہوری قادیانی نے بھی اسی نام سے ایک تفسیر لکھی ہے۔ نام کے التباس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔

۲ ۔ افسوس ہے کہ تاج کمپنی (لاہور۔ کراچی) کے تاجداروں نے اپنے تجارتی مفاد کی بنا پر اس اہم اور مفید حصہ کو جو تفسیر کے حجم میں ایک چوتھائی حصہ ہے۔ اپنے مطبوعہ ایڈیشن میں شائع نہیں کیا۔ انا للہ

کے مولانا کا تفسیری اعجاز اور علوم نادرہ کا خزینہ ہیں۔ موثر و دلنشین بلیغ اردو میں خود بخود تفسیری گتھیاں سلجھتی جاتی ہیں اور جدید اشکالات کے جوابات ملتے جاتے ہیں تفسیر ماجدی (اردو) بیک وقت قدیم و جدید عالم و عامی کی تسلی کا سامان ہے۔ تفسیر ما قبل سے "مغز سخن" کا موجز انتخاب "قلم ماجدی" کا کمال ہے۔ عربی کے منتخب مختصر جملوں میں طویل و مبسوط تفاسیر سے مقصد کی بات اور روح کلام کا چھانٹ لینا ہنرمند کلک ماجدی کا وہ کارنامہ ہے جس سے بڑی بڑی تفاسیر خالی ہیں۔ ان "جان مطالب" جملوں کا مفہوم اردو میں دلکش انشائے ماجدی میں پیش کر دیا گیا ہے مستشرقین کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں ابلہ فریبیوں کے جوابات، مذاہب کا تقابلی جائزہ اور عصری سوالات و اشکالات کا حل بھی آ گیا ہے۔ تفسیر حقانی کو سرسید کی اغلاط تفسیری اور نیچریت کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ تاہم مفید معلومات کا مجموعہ ہے اور ملاحدہ و دیگر مذاہب کے جوابات اور متشکک اذہان کے لیے اسکا مطالعہ مفید ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہ کی جدید تفسیر معارف القرآن شگفتہ اور آسان زبان میں قرآنی معارف و مسائل کا بیش بہا خزانہ ہے۔ ہر جدید و قدیم شخص کے مطالعہ کے لائق ہے۔ انگریزی تفاسیر میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی تفسیر و ترجمہ مولانا کے قلم کا شاہکار ہے۔ دیگر خوبیوں کے علاوہ مولانا نے جس تفحص و استیعاب کے ساتھ بائبل و کتب ما قبل سے قرآنی آیات کے شواہد جمع فرما دیئے ہیں۔ اس سے قرآن کا پہلی کتابوں پر مہیمن ہونا اظہر من الشمس ہو گیا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے کیلئے اس سے بہتر تفسیر انگریزی میں شاید ہی مل سکے۔ علامہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ قرآن و تفسیری حواشی بھی مفید ہیں اور پکتھال کا ترجمہ انگریزی بھی اچھا ہے۔

قرآن کریم کے اردو تراجم میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب محدث دہلوی کا بامحاورہ ترجمہ، شاہ رفیع الدین صاحب کا تحت اللفظ ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا

محمود الحسن صاحب حضرت تھانوی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے تراجم خوب و مستند ہیں۔ اردو خوان طبقہ کو انہیں پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ اردو میں لغت قرآن پر جو کام کیا گیا ہے۔ اس میں مولانا عبدالرشید نعمانی اور مولانا دائم جلالی کی لغات القرآن[1] اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اردو دان طبقہ کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ پچھلی دو جلدوں میں گو نسبتاً اختصار ہے تاہم غنیمت ہیں۔

عربی تفاسیر | مختلف متداول عربی تفاسیر زیر نظر رہیں۔ لغات کی تحقیق میں مفردات راغب اصفہانی سے فائدہ اٹھایا۔ جاراللہ زمخشری کی تفسیر کشاف ادب و بلاغت قرآنی کی کاشف اور لغت و نحو کے مباحث میں بلند مقام رکھتی ہے۔ قرآن کریم کا کوئی طالب علم اس کی تحقیقات سے مستغنی نہیں رہ سکتا۔ زمخشری معتزلی ہے۔ اس لیے دوران مطالعہ میں اس کے "اعتزالی نظریات" سے احتیاط ضروری ہے۔ قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر میں زمخشری سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اور تفسیر اسرار التنزیل میں بعض سورتوں کے ذیل میں زمخشری کی عبارات لفظ بلفظ نقل کر دی ہیں۔

منقولی تفاسیر میں تفسیر ابن جریر طبری ام التفاسیر ہے جس میں لغت، نحو، بلاغت احادیث و آثار اور اقوال سلف کو اکٹھا کر دیا ہے۔ گو بعض ضعیف روایات بھی نقل کر دی گئی ہیں۔ تاہم ان سے تفسیر کی عمومی ثقاہت پر اثر نہیں پڑتا۔ فوائد غریبہ اور علوم نافعہ کا خزانہ ہے جس سے بعد کے آنے والے ہر مفسر نے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ علامہ

---

[1] منکر حدیث غلام احمد پرویز صاحب نے لغات القرآن کے نام سے جو کتاب شائع کی ہے وہ تحریف و تاویل فاسد کا پلندہ۔ لغت نویسی سے مذاق اور تلبیع و دجل کا مرقع اور پرویزی حیلہ گری کا نمونہ ہے جو ان کے ذہن کی عکاسی ہے۔ اگر لغت نویسی یہی ہے تو لغت پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

ابن کثیر دمشقی اپنی تفسیر میں صحیح روایات کے اہتمام کے ساتھ ابن جریر کی بیشتر خوبیوں کو اپنے میں سمو لیا ہے اور اسے علوم قرآنی کا ذخیرہ بنا دیا ہے۔ گو تفسیر ابن کثیر ایک متوسط تفسیر ہے تاہم اپنے افادات کثیرہ، حسن ترتیب اور فنی کمالات کی بنا پر ہر دور اس ہر دلعزیز و مقبول رہی ہے۔ امام فراء البغوی کی معالم التنزیل اور اس کا ملخص تفسیر خازن منقولی تفاسیر میں اچھی ہیں۔

الجامع الاحکام القرآن یا تفسیر قرطبی اور بحر المحیط (مرتبہ اثیر الدین ابو حیان الغرناطی) اس مرحوم کے علمی سمندر کے دو انمول موتی ہیں جن کا شمار اول درجہ کی تفاسیر میں ہے۔ دیگر کمالات کے علاوہ محقق اقوال کی نقل میں قرطبی اور نحوی گرہ کشائیوں میں بحر المحیط خوب ہے۔

بندہ احکام القرآن خصاص رازی سے بہت زیادہ مستفید و متاثر ہوا حنفیہ کی قدیم تفاسیر میں یہ کتاب خاصہ کی چیز ہے اور باوجود اختصار کے بعض مطول تفاسیر پر سبقت لے گئی ہے۔

امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر حکمت قرآنی اور استدلال عقلی کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ رازی قرآن کے اندر ڈوب کر اپنی عمیق اور خداداد ذہانت سے پوشیدہ جواہر قرآنی کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے جاتے تھے۔ ان کی نکتہ سنجیاں کشادِ فکر کا سبب ہیں

علامہ آلوسی بغدادی کی روح المعانی اسم بامسمّی اور متاخرین کے لیے سرمایہ نازش ہے۔ ادب و بلاغت کی گرہ کشائیاں تفاسیر ماقبل کا ماحصل، حنفی نکتہ نظر سے فقہی استدلال اپنی محققانہ رائے کے ساتھ مستقلاً سلوک و معرفت کے نکات ؂

از سر تا بقدم ہر کجا می نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

تفسیر ابی السعود گو مختصر ہے مگر مفید اور حنفی نکتہ نظر کی ترجمان ہے

علامہ سیوطی کی در منثور تفسیری احادیث کا قابلِ قدر مجموعہ ہے اور اس

بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ کہ قرآن احادیث کا منبع بھی ہے اور اعمال و اقوال محمدیہ کا مؤید بھی۔ احادیث نبویہ قرآن پاک کی تشریح و بیان بھی ہیں۔ نزول قرآنی کے مواقع و ماحول، منظر و پس منظر، عموم و خصوص وغیرہ کی بتلانے والی بھی۔ قرآن و حدیث دونوں باہم لازم و ملزوم، متن و شرح، اجمال و تفصیل، دعویٰ و دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پرتو ہیں ایک ہی نور مبین کی شعاعیں ہیں۔
احادیث کے بغیر قرآن نہیں سمجھا جا سکتا اور احادیث کی حقیقت قرآنی روشنی ہی میں کھلتی ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کی تفسیر فتح العزیز خاندان ولی اللہی کے علوم قرآنی کی خازن، امین اور حقائق نگاری میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اس رنگ میں فقیر کی نگاہ سے کوئی تفسیر نہیں گذری کاش مکمل ہو جاتی۔ تو تفسیری خزانہ عامرہ کا بے بہا ہوئی ہوتی۔ تاہم حضرت شاہ صاحب کے علمی و عرفانی مقام کا اندازہ اس نامکمل تفسیر سے ہی ہو جاتا ہے[1]۔

جلالین اس قدر مختصر ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ سے اس کے الفاظ کچھ ہی زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود سلیم الطبع عربی دان کے لیے ایک حد تک مطالب قرآنی کا حل ہے۔

اعجاز قرآن | قرآن کریم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ ہے، جس کی وجوہ اعجاز بیشمار ہیں اور اس کا کلی ادراک ایک انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کا

---

[1] حضرت علامہ بنوری مدظلہٗ حضرت علامہ کشمیری نوراللہ مرقدہٗ کا قول نقل فرماتے ہیں۔ کہ "قرآن کی تفسیر کا حق ادا کرنے سے مخلوق قاصر ہے تاہم اگر تفسیر فتح العزیز مکمل ہو جاتی تو شائد بشری حد تک تفسیر قرآن کا ایک گونہ حق ادا ہو جاتا (بندہ نے جو مفہوم خیال میں ہے لکھا ہے۔ الفاظ میں فرق ہو سکتا ہے)"

اعجاز حروف وصوت نشست الفاظ انتخاب کلمات اور تقاطیع اصوات ترتیب و ترکیب کلام سلاست و روانی ترتیل وسہولت ادائیگی فصاحت و بلاغت و اسلوب بیان میں نمایاں۔ اس کے مطالب و معانی۔ پیام و احکام، مقاصد و حقائق اخبار غیب و قصص غرض جزو کل میں جاری وساری اور ظاہر و باہر ہے[1]

اعجاز قرآنی پر ہر دور میں علمائے امت نے کام کیا۔ اور ہر ایک نے اپنی بساط کے بقدر اس عمیق فن کے مختلف پہلوؤں کو کھولنے کی کوشش کی۔ جاحظ و زمخشری سے لے کر اس وقت تک علمائے محققین اپنی کاوشوں کے ثمرات کو امت کے سامنے پیش کرتے رہے۔ تاہم احقر کے نزدیک اعجاز قرآنی پر مفید اور اہم کتابیں دلائل الاعجاز (امام عبدالقاہر جرجانی) اعجاز القرآن (علامہ الباقلانی) اعجاز القرآن یتیمۃ۔ المثل السائر (ابوالفتح ضیاء الدین المعروف ابن الاثیرالوصلی) للیرافی البیان مقدمہ مشکلات القرآن (علامہ محمد یوسف البنوری) ہیں، جن سے فقیر نے اپنی بساط کے بقدر فائدہ اٹھایا ہے۔ فقیر نے دلائل الاعجاز للجرجانی اور اعجاز القرآن الباقلانی اپنے مصری استاذ حسین الکاتب سے پڑھیں۔

رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ میں حضرت علامہ سید محمد یوسف صاحب البنوری مدظلہ، نے اپنے مدرسہ میں اعجاز القرآن پر خصوصی درس دیے تھے۔ بندہ کو ان میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی اور حضرت ممدوح کی اعجاز کے بارے میں توضیحات

---

[1] ۔ اردو میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا رسالہ اعجاز القرآن اور حضرت سید الملۃ علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہ کا اعجاز القرآن پر مضمون سیرت النبی (جلد ثالث) خوب ہیں۔

[2] ۔ وجوہ اعجاز کی ان جملہ صورتوں میں ہر صورت و وجہ مستقل تشریح و مضمون کی طالب ہے جس کا متحمل ہمارا یہ عجالہ نہیں ہو سکتا۔

اور علامہ کشمیری[1] کے نظریہ اعجاز القرآن کی تفصیلات سننے اور ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ علامہ بنوری مدظلہ نے دیگر وجوہ اعجاز کے علاوہ اس بات کو خوب واضح و مدلل فرمایا کہ: "قرآن کریم نہ صرف اسلوب بیان و ترکیب کلام میں معجزہ ہے (جیسا کہ امام جرجانی وغیرہ کا قول ہے) بلکہ قرآن باعتبار مفردات و مرکبات کے بھی معجزہ ہے۔

عربی ادب ادب عربی کے کوچہ سے ادنیٰ شناسائی اپنے استاذ الدکتور محسن الحسینی الاسکندری المصری (سابق صدر شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی) کے مشرف تلمذ کا صدقہ ہے۔ خاکسار نے ان سے عربی نحو و بلاغت میں بعض کتب۔ نقد النثر۔ نقد الشعراء الوساطہ بین المتنبی وخصوماتہ الموازنہ بین ابی تمام والبحتری کاملاً اور الذخیرہ فی محاسن اہل الجزیرہ کتاب البخلاء للجاحظ اور دیوان متنبی کا کچھ حصہ اور جدید ادب کی بعض کتابیں پڑھیں۔ استاذی الحسینی صاحب کا ادب کا ذوق بہت پختہ تھا۔ "نقد" کی کتابیں خوب شوق سے پڑھاتے تھے۔ ان کی شاگردی کی برکت تھی کہ جامعہ پشاور میں نقد کی کتابیں کئی سال تک پڑھاتا رہا۔ استاذ مرحوم

---

[1]۔ علامہ انور شاہ کشمیری دیگر علوم کے علاوہ بلاغت و وجوہ اعجاز کی معرفت میں بھی مجتہد و امام تھے۔ چنانچہ مشہور قول لم یدر اعجاز القرآن الا عرجان نقل کرنے کے بعد فرماتے تھے احدھما ز مخشر والآخر من جرجان وانا ثالثھما علامہ بنوری مدظلہ علامہ موصوف کا ارشاد بیان فرماتے ہیں کہ" بلاغت پر میرا بیان و تقریر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جو مطول جیسی کتاب لکھ سکتا ہو اور جسے شعراء جاہلیہ کے دس بارہ ہزار اشعار یاد ہوں"

[2]۔ اعجاز القرآن عمیق و گہرا فن ہے اس کے ماہر ہر دور میں محدود و شاذ ہوئے ہیں۔ حضرت بنوری کا ارشاد ہے" علوم کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو کچے تھے پک گئے۔ کچھ علوم ایسے ہیں کہ پک کر جل گئے اور کچھ علوم ایسے ہیں جو کچے کے کچے رہ گئے اور ابھی تک نہیں پکے اور یہ علوم ہیں قرآن کریم کے وجوہ اعجاز اور علم بلاغت"

زیر درس کتابوں کے علاوہ اس فن کی دیگر کتابوں کی نشان دہی اور ان کا مطالعہ بھی طلبہ سے کراتے رہتے تھے۔ جاحظ کی کتابوں میں البخلاء کے علاوہ کتاب البیان والتبیین (جو بقول شبلی نثر کا حماسہ ہے) سے استفادہ کیا۔ ابن الاثیر کی المثل السائر۔ ابن رشیق کی کتاب العمدہ۔ ابن مقفع کی الکلیلۃ والدمنہ، الجرجانی کی اسرار البلاغت مختارات اول و دوم (ابوالحسن علی الندوی) فقیر کی محسن کتابوں میں سے ہیں۔ الاغانی کے کچھ حصے۔ النثر الفنی۔ الشعر الفنی۔ الادب الفنی فی القرآن الرابع، مقامات الحریری و مقامات بدیع الزمان ہمدانی اور دیگر کئی کتابوں سے فائدہ اٹھایا۔ طٰہٰ حسین کے ذہن میں گو الحاد ہے تاہم اپنے اسلوب میں سلاست و اطناب کا بادشاہ ہے۔ اس کی کئی کتابیں پڑھیں۔ امیر شکیب ارسلان۔ مخدومی ابوالحسن علی الندوی۔ الطنطاوی وغیرہ کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ تاریخ ادب میں جرجی زیدان کی الاداب اللغۃ العربیہ (چار جلدیں) اسکندرانی کی الوسیط۔ حسن الزیات کی تاریخ ادب العربی اور حنا الفاخوری وغیرہ کی کتابیں مطالعہ سے گذریں۔ ادبی تاریخ کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو ہر دور کے ادیبوں اور شاعروں سے ایک گونہ واقفیت ان کے زمانہ کے رنگ و مزاج اور ادبی تغیرات کا پتہ چل جاتا ہے۔ عیسائی اور مستشرق ادب میں بھی اپنے ذیلی اور مقصودہ مفادات کی رعایت سے باز نہیں آتے۔ چنانچہ جرجی زیدان اور حنا الفاخوری نکلسن وغیرہ کی کتابیں اس پر شاہد ہیں۔ دینی لٹریچر کے بارے میں عموماً ان کی آراء جانبدارانہ اور مسموم ہوتی ہیں۔ اس لیے دینی ادب اور علوم کے بارے میں اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم پختہ اذہان کے لیے ان کا محتاط مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔

نظم میں مختلف شعراء کے دواوین کے علاوہ الجمہرۃ الاشعار العرب۔ المعلقات السبع الحماسہ لابی تمام دیوان المتنبی وغیرہ میرے شعری مطالعہ کا اثاثہ رہا۔ دیوان المتنبی پر

گو العکبری کی شرح مستند عمیق اور عمدہ ہے تاہم البرقوقی کی جدید شرح حواشی طلبہ کے لیے زیادہ مفید و سہل ہے۔ دیوان ابی تمام میں بعض مقامات پر گو تعقید و غموض ہے لیکن غریب لغات و مشکل و ثقیل الفاظ کی معرفت اس سے اچھی ہو جاتی ہے۔

اردو ادب | گذر چکا ہے کہ ۱۹۴۱ء میری علمی زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسی سال اردو ادب کے اساطین کی کتابوں کی ابتدا ہوئی اور رفتہ رفتہ اردو کی "کتب قیمہ" کا ایک اچھا ذخیرہ نگاہوں سے گذر گیا۔ مکتوبات غالب کی "عود ہندی"[۱] میں بسی ہوئی "اردوئے معلیٰ"[۲] کی شیریں و پاکیزہ روزمرہ میں سہل ممتنع کا حکم رکھتی ہے۔

حالی کی کتابیں سنجیدہ و معیاری، شریفانہ ادب اور پر اثر سادہ انشاء کا نمونہ ہے۔ حیاتِ سعدی یادگارِ غالب اور مقدمہ شعر و شاعری و حیاتِ جاوید لفظ لفظ پڑھیں حالی کی ادبی تنقید۔ سوانح نگاری اور اپنے ہیرو سے "وفاداری" کا نقش ذہن نے قبول کیا۔

سرسید مرحوم کی آثار الصنادید۔ مضامین اور تفسیر القرآن کے بعض اجزاء نظر سے گذرے۔ آثار الصنادید مفید کتاب ہے۔ سرسید کے مذہبی نظریات بحمد اللہ متاثر نہ کر سکے۔ نیچریت و حقیقت سے بعید تر تاویلات (جن کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں) اور مغرب کی ذہنی مرعوبیت سے طبیعت نفور رہی[۳]

---

[۱]، [۲]۔ غالب کے مکتوبات ان دو ناموں سے بھی شائع ہوئے ہیں۔

[۳]۔ سرسید مرحوم (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے) مسلمانوں کی محبت و قومی درد و خلوص کے باوجود امت کے صحیح مرض و علاج کی تشخیص و تجویز نہ کر سکے اور ان کی مساعی کی وجہ سے اسلامیانِ پاک و ہند نے ایک ایسے نظامِ تعلیم کو قبول کر لیا جس سے کسی حد تک گو وقتی معاشی مفادات وابستہ تھے لیکن حقیقتاً وہ مزاجِ امت کے منافی تھا (بقیہ صفحہ ۱۶۹ پر)

سحر بیان محمد حسین آزاد کے دربار اکبری کی افسوں نگاری نیرنگِ خیال کی نیرنگیاں قصص الہند کی افسانہ گوئی اور سخن دان فارس کی سخن طرازیاں دیدہ و گوش کو مسحور کرتی رہیں۔ لیکن سب سے بڑھ کر آبِ حیات کی ساحرانہ ترادش نے ان کے طرز نگارش کا قائل کر دیا۔ آبِ حیات نثر میں شعر اور الفاظ میں سحر ہے اور اردو ادب عالیہ میں لافانی مقام رکھتی ہے کاش اس کی تاریخیت مخدوش نہ ہوتی۔ اور شعراء کے تذکروں و تاریخ میں گل رعناء (حکیم مولانا عبدالحئیؒ) کا ایک خاص مقام ہے۔ زبان کی شیرینی و سلاست

(بقیہ ص۱۶۸ سے) اور اس میں امراض امت کا مداوا نہ تھا۔ اقبال نے اس حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے ؎

رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
لیکن نگاہ نکتہ بین دیکھے زبوں بختی مری

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

کیا قیامت ہے کہ ایک چوتھائی صدی گذر جانے پر بھی پاکستان اس فرسودہ نظامِ تعلیم اور تقویمِ پارینہ سے اپنا دامن چھڑا سکا۔ اور اس قدیم صد چاک "قبا" پر پیوند لگا رہا ہے۔

لہ۔ مولانا حکیم عبدالحئیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) بقول حضرت سید سلیمان ندوی ہندوستان کے ابن خلکان و ابن ندیم تھے۔ ان کی آٹھ مجلدات میں ضخیم تصنیف نزہتہ الخواطر برہندوپاک کے اعیان و فضلاء کا بےمثل و نادر (عربی میں) تذکرہ ہے۔ یہ کتاب اور ثقافتہ الہند، الہند فی عہد الاسلامی یاد ایام اور دیگر تصنیفات ان کی فضیلت پر شاہد عدل ہیں۔ ان کا مبسوط تذکرہ "تذکرہ عبدالحئیؒ" کے نام سے ان کے مایہ ناز فرزند رشید مخدومی مولانا ابوالحسن علی الندوی مدظلہٗ نے لکھا ہے۔ ان کا خاندان "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کا مصداق ہے۔

سنجیدگی اور ثقاہت کے ساتھ تاریخی استناد و معتدل انتقاد اور منصفانہ تقریظات نے کتاب کو ادب اردو میں ایک اونچی جگہ بخش دی ہے۔ گلِ رعناء کے مطالعہ سے آبِ حیات کی تاریخی حیثیت گو مجروح ہو گئی تاہم اس کی ادبی قدر و منزلت سالم و باقی رہی۔

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں شعر الہند (عبدالسلام ندوی) اردو اصناف شاعری اور اس کے مختلف ادوار پر قابل قدر محققانہ تبصرہ و تقریظ ہے۔ تاریخ ادب اردو (عسکری) غالباً اردو نثر و شعر کی واحد مبسوط معیاری تاریخ ہے۔ (مترجم (مرزا محمد عسکری) کا کمال ہے کہ کتاب طبع زاد معلوم ہوتی ہے اور ترجمہ[۲] کا گمان تک نہیں ہوتا۔ تاریخ ادب میں جدید اردو شاعری وغیرہ کئی دوسری کتابیں بھی نظر سے گذریں۔

صاحب طرز انشا پرداز مہدی الافادی کی افادات مہدی کے مضامین اردو ادب عالیہ میں اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ مہدی کا طرز تحریر شبلی و محمد حسین آزاد کے

---

[۱] ۔ آج زمانہ کا رنگ بدل گیا۔ ہماری قدیم "تنقید و تحقیق" کے معیار آج فرسودہ گردانے جارہے ہیں اور "مشرقی ادب" کو "مغربی پیمانوں" سے جانچا جارہا ہے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ زبان و معاشرت و ثقافت کے تمام اختلافات کو نظر انداز کر کے جو مغرب میں ہے اسے مشرق میں دکھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور جو "ان کے" نزدیک ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا اسے "ہدف ملامت" بنادیا جاتا ہے۔ گو وہ خود ہی کہتے ہیں، مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ نہ وہ کبھی ملے ہیں نہ ملیں گے۔ لیکن واحسرتا ذہنی شکست کہاں پہنچا دیتی ہے۔ انا للہ۔

[۲] ۔ اصل کتاب انگریزی میں رام بابو سکسینہ کی تالیف ہے۔

اسالیب آمیزش۔ دلکش اور پراثر ہے۔ بندہ اس کے اسلوب سے بہت متاثر ہوا نذیر احمد کی بنات النعش۔ مرأۃ العروس اور توبۃ النصوح بچپن میں پڑھ چکا تھا۔ ابن الوقت رویائے صادق اور ترجمہ قرآنی بعد میں نظر سے گذرا۔

شبلی | شبلی کی سیرت النبی اور الفاروق والدہ محترمہ کے کتب خانہ میں تھی۔ الفاروق پڑھی۔ شبلی کی تحقیق و تاریخ نگاری نے مسخر کر لیا۔ الفاروق شبلی کا بڑا کارنامہ ہے جس نے بہت سے مغرب زدہ اذہان کو اسلامی عدل و نظریہ سیاست کی فوقیت کا قائل کر دیا۔ کاش وقتی تقاضوں کے مداوا کے ساتھ مولانا مرحوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دینی و روحانی مزایا و کمالات کو بھی پورا اجاگر کر دیتے۔ تو کتاب کی افادیت مزید بڑھ جاتی تاہم جو ہے تاریخی لٹریچر کا قابلِ فخر سرمایہ ہے۔

الفاروق کے مطالعہ نے شبلی کی عظمت و محبت پیدا کر دی اور شبلی کی ایک ایک کتاب و مقالہ مزہ لے لے کر پڑھتا رہا۔ المامون، الغزالی۔ الکلام الجزیہ۔ موازنہ انیس و دبیر شعر العجم مقالات (آٹھ جلدیں) نظر سے گذریں۔ تاریخ و ادبیت و علم کا ایک عظیم مجسمہ شبلی دل و دماغ پر چھا گیا اور ان کی علمی و تحقیقی فتوحات نے اس وقت تک کے دیگر تمام نقوش ماند کر دیئے۔ شعر العجم جو ان کی ادبی کتابوں میں شاہکار رہے ہے۔ میرے ادبی ذوق کو جلا بخشتی رہی۔ اور ان کی دیگر کتابوں سے اپنی علمی پیاس بجھاتا رہا۔

سیرت النبی (اوّل و دوم) برسوں سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ پڑھ کر سوتا تھا۔ مجھ پر شبلی کا سب سے بڑا احسان ہے کہ ان کی سیرت النبی نے سیرت سے شغف بخشا اور اسی مطالعہ سیرت کے سلسلہ میں جب سیرت النبی (جلد چہارم) کی "صفاتِ الٰہیہ" کی بحث پر پہنچا تو قلب و دماغ شدّت تاثیر سے دگرگوں تھے اور اسی کا اثر تھا کہ

لہ۔ ترجمہ نذیر احمد کی اغلاط حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اصلاح ترجمہ دہلویہ کے نام سے شائع فرمائی ہیں۔

آخرش سیرت نگار نبوی جانشین شبلی اپنے شیخ قیم و مربی اوّل حضرت سید الملت علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہ کو غائبانہ اپنا دل دے بیٹھا ؎

اتانی ھواھا حین لم اعرف الھویٰ فصادف قلباً خالیاً فتمکنا

میری ساری عمر کا حاصل وہ تیری اک نظر
جس نے دنیا بھی بدل دی عشق کی میرے لئے

گویا شبلی مرحوم نے حضرت سید سلیمان ندویؒ کی بارگاہ تک رسائی کا سبب اوّل بنے۔ ان کی سیرت نہ ہوتی تو فقیر کوچہ سلیمانی کی گرد کو سرمۂ چشم نہ بنا سکتا۔ فجزاھما اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

حضرت الشیخ قدس سرہٗ کے در سے کیا ملا۔ یہ الگ داستان ہے جس کا یہ عجالہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ گو جی چاہتا ہے۔

باز گواز نجد و از یاران نجد تا در و دیوار آری بوجد

سیرت النبیؐ | علامہ شبلی و حضرت سید سلیمان ندویؒ کی سیرت النبیؐ میرے آقا سیدِ دو عالم نبی الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح و تعلیمات کا دائرۃ المعارف ہے۔ اور سیرت پر اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری کتاب ہے جس کی نظیر پورے اسلامی کتب خانہ میں نہیں ملتی۔ شبلی و حضرت سلیمان ندوی پر اللہ تعالیٰ کا احسانِ خاص تھا۔ کہ ان سے یہ کام لے لیا گیا۔ سیرتِ نبویہ کے اس خزانہ سے اپنی استعداد

لہ۔ بشری لغزشوں سے کون بری ہے۔ چند مقامات سے دیانتاً اختلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن اس سے کتاب کی مجموعی ثقاہت و استناد پر اثر نہیں پڑتا۔

ٹہ۔ یہ لطیفہ سن کر شاید تعجب کیا جائے کہ فقیر کا اصلاح کا تعلق ۱۹۴۴ء سے حضرت سید سلیمان ندویؒ سے خط و کتابت کے ذریعہ قائم ہو گیا تھا۔ جو حضرت تھانویؒ (بقیہ ص۱۷۳ پر)

ظرف کے بقدر استفادہ کی کوشش کرتا رہا۔ اور یہ بات برملا کہہ سکتا ہوں کہ فقیر کی زندگی میں یہ کتاب مستطاب جس قدر دخیل رہی شاید ہی کوئی کتاب اتنی موثر رہی ہو[1]۔
سلسلہ سیرت میں حضرت سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مختصر کتاب "خطبات مدراس"[2]

(بقیہ صفحہ ۱۷۲ سے) نور اللہ مرقدہ کے مجاز بیعت (خلیفہ) تھے لیکن ۱۹۵۰ء میں جب حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو حضرت کے استفسار پر کہ حضرت تھانوی کے مواعظ ملفوظات و دیگر سلوک کی کتابیں پڑھی ہیں۔ تو عرض کیا بندہ اسی بارہ میں بھی "سیرت" کی جلدوں سے استفادہ کرتا رہا ہے۔ متواضع شیخ نے فرمایا "حضرت تھانوی کی کتابیں پڑھتے وہاں ہر چیز اندر سے پھوٹ کر نکلی ہے"۔ غرض سلوک کی راہ اور حضرت تھانوی سے عقیدت بھی سیرت ہی کا فیض ہے۔

[1]۔ سیرت النبی کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ پشتو اکیڈمی کے زیر نگرانی مولانا محمد اسرائیل صاحب نے پوری چھ جلدوں کا ترجمہ کر لیا ہے، جس میں سے صرف ایک جلد طبع ہو سکی ہے۔ کاش! صوبائی حکومت و جامعہ پشاور اس کی اشاعت کی سبیل کر سکے۔ دوسری صورت پشتو جاننے والے مخیر حضرات کی اعانت بھی ہو سکتی ہے۔

[2]۔ کتاب عربی و انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ خطباتِ مدراس میں ۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ یہ حقیقت واضح و ثابت کی احادیث مبارکہ کا ایک کثیر حصہ صحابہ کرام خود تحریراً قلمبند فرما چکے تھے ——— "پرویزی جیلہ گردن" کی ابلہ فریبیاں اور دسیسہ کاریاں فیوض نبویہ سے امت کو محروم کرنے کے لیے ہزار ڈھول اڑاتی ہیں۔ حقیقتِ نبوت کا شمس بازغہ اپنی نورانیت سے انشاء اللہ قیامت تک امت کے دلوں کو روشن کرتا رہے گا۔

سیرت کے دفاتر اور بعض ضخیم مجلدات سیرت پر بھاری ہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام (روح فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کی دلیل۔ نبوت محمدی پر شاہد عدل۔ ہر جدید قدیم پڑھے لکھے کے مطالعہ کے لائق اپنے طرز استدلال و پیشکش میں اچھوتی اور دلکش ہے۔ سیرت پر مختصر کتابوں میں خطبات مدراس اور النبی الخاتم (سید مناظر احسن گیلانی) نشر الطیب (حضرت تھانوی) سے زیادہ (اپنے اپنے رنگ میں) موثر عظیم۔ جامع۔ دلکش اور البیلی کتابیں فقیر کی نظر سے نہیں گذریں۔ رحمت عالم (حضرت سلیمان ندوی) اور اوجز السیر بھی اپنی خاص تاثیر رکھتی ہیں۔ اور عام طلبہ کے لیے مفید اور دلچسپ ہیں مولانا سلیمان منصور پوری کی رحمۃ اللعالمین سیرت کے ذخیرہ میں ایک اچھا اضافہ اور بعض تحقیقات و مباحث میں منفرد ہے۔ حضرت مفتی شفیع صاحب کی خاتم الانبیاء اور مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی سیرت قرآنی[۱] بھی خوب ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ[۲] صاحب کی

۱۔ یہ کتاب حضرت موصوف کے خطبات سیرت ہیں جو مدراس میں دیئے گئے اپنی طرز میں اچھوتی کتاب ہے

۲۔ ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی ثم فرانسادی (مقیم پیرس) شہرۂ آفاق محقق اور متعدد زبانوں میں بلند پایہ محققانہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی اردو، عربی، انگریزی کتابوں سے خوب استفادہ کیا۔ صحیفہ ابن ہمام الرثائق السیاسیۃ النبویہ۔ INTRODUCTION TO ISLAMIC JURISPURDANCE، MUSLIM CONDUCT OF STATE بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میدان جنگ، عہد نبوی کا نظام تعلیم، مؤقر جرائد میں ان کے مقالات خاصہ کی چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے فرانسیسی میں قرآن کریم کا ترجمہ بھی کیا ہے اور سیرت النبی (دو جلدوں) میں لکھی ہے۔ باوجود ایک عظیم محقق و علمی شخصیت ہونے کے انتہائی متواضع، ملنسار اور صورت و لباس میں مشرقی و دینی طرز کے پابند ہیں (باقی ص۱۷۵)۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیاسی زندگی اپنے طرز میں ہے۔

عربی ذخیرہ سیرت میں علامہ ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ کی پہلی چھ جلدیں (نصف اول کو چھوڑ کر) سیرت النبی پر مشتمل ہیں۔ بحمد اللہ مدتوں مطالعہ میں رہی اور بھرپور استفادہ بقدر ظرف کرتا رہا۔ حافظ نے سیرت طیبہ کے دفاتر کو کھنگال لیا ہے۔ اور حیات نبویہ کا مبسوط تذکرہ امت کے سامنے پیش کر دیا ہے جس کا مطالعہ عربی دان طبقہ کے لیے مفید ہے۔ چھٹی جلد روایات معجزات پر ہے اور قابل دید ہے۔ البدایۃ النہایۃ میں ابن کثیر ایک عظیم مورخ۔ بصیر محدث۔ دقیقہ رس محقق و ناقد کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ حافظ موصوف کی صرف یہی کتاب ان کی جلالت شان اور دفور علمی پر دلالت کیلئے کافی ہے۔ سیرت ابن ہشام (عربی) موجود کتب سیر میں مقدم اور ام الکتب[۱] ہے۔ جس سے کوئی شائق سیرت بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ کتاب عصر رسالت کی عکاس ہے۔ ابن ہشام کی حقیقت نگاری و خلوص دل پر اثر کرتا ہے۔

علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں سیرتِ نبوی کا قد آدم آئینہ امت کے لیے مرتب کر دیا ہے یہ کتاب نہ صرف سیرت و وقائع محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والتحیہ) کی امین رہنما ہے۔ بلکہ صرت آموز و سیرت ساز پر بھی ہے۔ زندگی کے ہر گوشہ میں اسوۂ نبوت کو نمایاں اور اجاگر کر دیا ہے کہ جادۂ حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کے راہی ہر قدم پر نقش رسالت کی گرد کو سرمۂ چشم بنا سکیں۔ اور مشعلِ ہدایت کی ضوفشانیاں ان کے ظاہر و باطن کو

(بقیہ ۱۷۴ سے) فقیر نے انہیں حضرت سید صاحب کی ایک مجلس میں دیکھا۔ جب وہ تعلیمات اسلامی بورڈ سے استعفی دے کر فرانس جانے والے تھے۔

۱۔ بعض کتب سیر اس سے پہلے بھی لکھی گئی لیکن متداول اور موجودہ کتاب میں اولیت کا شرف اسی کو حاصل ہے

روشن کرتی رہیں۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ۔ ایک قرآنی حقیقت ہے جس پر عمل سیرتِ مبارکہ کے تفصیلی مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ الحمد للہ علماءِ امت (ابن اسحٰق ۔ زرقانی و سہیلی، قسطلانی و قاضی عیاض سے لے کر اس وقت تک کے محقق و محتاط سیرت نگاروں نے اس فریضہ کو کمال خوبی سے ادا کیا ہے اور ہر زبان میں سیرت پر بڑی چھوٹی اور منجھولی کتابیں مہیا فرما کر حضور انور نبی الانبیاء سید الرسل صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے جمال جہاں آرا سے عالم کو روشنی بخشی ہے۔ سعادت مند و خوش نصیب ہیں۔ وہ حضرات جو اس قدسی الصفات ذاتِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے پرتو سے اپنے کاشانہ زندگی کو منور کر سکے۔

سیرت النبی (شبلی و سلیمان ندوی) کے ضمن میں سیرت پر یہ چند باتیں زبان قلم پر آ گئیں۔ بات اردو کے مصنفین اور کتابوں پر چل رہی تھی۔ بحمد اللہ تعالیٰ اردو اساطین ادب کی کتب قیمہ ایک ایک کر کے پڑھیں اور اردو کلاسیکی لٹریچر کا خوب مطالعہ کیا دل و دماغ بقدر ظرف مستفید ہوتا رہا۔

جادو بیان محمد حسین آزاد اور سحر طراز ابوالکلام آزاد[1] دونوں اپنے خاص طرزِ انشاء کے بادشاہ موجد و خاتم ہیں۔ دونوں کا طرزِ نگارش دل کو لبھاتا رہا۔ تاہم اقلیم دل پر شبلی کے قلم کا سکہ جم چکا تھا۔ اور "شبلوی انشاء" نے دیگر نقشوں کو ماند کر دیا تھا چنانچہ شبلی اور ان کے تلامذہ اور منتسبین کی کتابیں اوڑھنا بچھونا بن گئیں دار المصنفین اعظم گڑھ

---

[1] ۔ ابوالکلام آزاد مرحوم کے الہلال مضامین تذکرہ۔ ترجمان القرآن و باقیات آزاد (مولانا غلام رسول مہر) سے لے کر انکی انشاء کے آخری و جدید نمونوں غبار خاطر و کاروانِ خیال تک مسلسل مطالعہ میں رہے کیا زبان پائی تھی۔ ان من البیان لسحرا کا نمونہ و ثبوت۔

(جیسے جانشین شبلی سید الطائفہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے برّصغیر میں اسلامی علم و دانش کا حقیقی اعظم گڑھ بنادیا تھا) کی کونسی کتاب ہے جو نظر سے نہ گذری ہو۔ اردو کے سید المصنفین سلیمان اعظم (علامہ ندوی) کی کتابیں تو خیر علم و ادب کا معیار اور تحقیق و دانش کا نمونہ ہیں ہی۔ میرے لئے شبلی اکاڈمی کی ہر کتاب حسن صوری و معنوی کا مجموعہ اور علم و حکمت کا خزینہ تھی۔

سیر الصّحابہ | دار المصنفین کی کتابوں میں سیرت النبی کے بعد سیر الصحابہ کی ضخیم مجلدات کا میری ذہنی ساخت پر گہرا اثر رہا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی پاک ہستیاں انبیاء علیہم السلام کے بعد انسانیت کا خلاصہ رشد و ہدایت کا مینار اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے علم و عمل کی حامل وامین و داعی اور ان کی زندگی کی شاہد و گواہ ہیں۔ صحابہ کرام کی ذواتِ عالیہ حقیقتاً اسلام کی برتری و حقانیت کا ثبوت ہیں جن کی فضیلت پر نصوصِ قرآنیہ وارشاداتِ نبویہ کافی ہیں۔ امت ہر دور میں ان کے اسوہ اور نمونہ کی محتاج[1] ہے۔ حضرت سیّد سلیمان ندویؒ نے اسوۂ صحابہ کی اہمیت و

---

[1] حضرت الاستاذ علامہ محمد یوسف البنوری مدظلہ نے عقبات کے مقدمہ میں خوب کہا ہے۔

اذا قلنا لرجل انّهٗ صحابی او انّهٗ صحب رسول الله صلی الله علیه وسلم فناهیک به مزیة وفضیلة فی قوة ایمانه وشدة یقینه وکمال اخلاصه وعمق علمه وحسن عمله وجهاده فی سبیله وایثاره لما عند الله

جب ہم کسی شخص کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ صحابی ہے یا اس نے حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صحبت اٹھائی ہے۔ تو صحابہ کی قوت ایمان۔ شدت یقین کمال اخلاص علمی گہراؤ۔ حسن عمل۔ جہاد اور اللہ تعالیٰ کی مرغوب چیزوں کی ترجیح اور دنیا سے بے رغبتی میں فضیلت و کمال

(باقی ص۱۷۸ پر)

ضرورت کے پیشِ نظر اردو میں احوالِ صحابہ کا ایک پاکیزہ و مستند ذخیرہ گیارہ جلدوں میں امت کے سامنے اپنے رفقاء سے لکھوا کر پیش کرا دیا۔ جو سلجھی ہوئی زبان میں تاریخ و سوانح نگاری کی جدید خوبیوں کے ساتھ علم و عمل کی ایک اچھی دعوت ہے۔ سیر الصحابہ کے

(بقیہ ص ۱۷۷ سے)

وزهدا فى الدنيا فكاننا اثبتنا كل كمال وجمال وكل فضل ونبل فاذن ذلك ابلغ تعبيرا واوجزه لاثبات فضل وكمال۔ قال سيدنا عبدالله ابن مسعود رضى الله عنه ذلك الصحابى الجليل الذى قال فيه سيدنا الفاروق رضى الله عنه كنيف ملئى علماء وفقهاً فى اصحاب سيدنا الرسول صلى الله عليه وسلم اولٰئك اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم كانوا افضل هذه الامة ابرها قلباً وا علما واقلها تكلفا الى ان قال فاعرفوا لهم فضلهم... الخ عبقات ص۱ اختارهم الله لصحبة نبيه صلى الله عليه وسلم ولاقامة دينه فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوهم على اثرهم وتمسكوا بما استطعتم من

فضیلت و کمال سمجھنے کے لیے یہ لفظ (صحابی) تیرے لیے کافی ہے (گویا جب ہم کسی شخص کو صحابی یا اس کے لیے صحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کرتے ہیں) تو اس شخص کے لیے ہم ہر کمال و حسن۔ فضیلت و شرافت کو ثابت کر دیتے ہیں (کہ لفظ صحابی میں یہ سب کچھ موجود ہے) اس طرح صحابی کے لفظ کا استعمال فضل و کمال کے ثابت کرنے کے لیے بلیغ ترین اور موجز ترین تعبیر ہے۔

صحابی جلیل سیدنا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ (جن کے بارے میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ علم و فقہ سے بھرپور تھیلی ہیں) ان کا ارشاد ہے۔ وہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس امت میں سب سے افضل تھے جن کے دل سب سے پاکیزہ جن کا علم (بقیہ ص ۱۷۹ پر)

سلسلے کے بعد سیرت ساز کتابوں میں تابعین و تبع تابعین کے مجموعے بھی خوب ہیں۔ جو دارالمصنفین کی حسنات میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ سیر الصحابہ کی تدوین میں دارالمصنفین کی اردو زبان میں سبقت الی الخیر کا شرف حاصل ہے۔ اردو میں حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہٗ کی مقبول ترین تالیف "حکایاتِ صحابہؓ" جو "بہشتی زیور" کی طرح گھر گھر پھیل چکی ہے اپنی تاثیر و سہولت میں لاجواب ہے۔

امت نے صحابہ کی زندگی و سیرت کے جاننے کے لیے ہر زمانہ میں اہتمام کیا ہے چنانچہ عربی میں طبقات، رجال و سیر کے دفاتر صحابہ کے احوال سے پُر ہیں۔ متعدد کتابیں خاص صحابہ کے حالات میں لکھی گئیں جن میں زیادہ متداول اور مقبول اصابہ اسد الغابہ اور استیعاب ابن عبدالبر وغیرہ ہیں۔ علامہ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں وفیات کے ضمن میں التزاماً صحابہ کے حالات جمع کیے ہیں۔ مخدومنا حضرت علامہ محمد یوسف کاندھلوی کی حیات الصحابہ (تین ضخیم جلدوں میں) صحابہ کی زندگی کا اچھوتا و مستند و عمدہ مجموعہ ہے جو داعیانہ ذہن کا عکاس اور محدثانہ طرز کی پیشکش ہے اور قوت تاثیر وافادیت

(بقیہ حاشیہ) اخلاقھم وسیرھم فانھم کانوا علی الھدی المستقیم۔

(جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۸)

سب سے گہرا جو سب سے کم تکلف کرنے والے تھے۔ (اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے چنا تھا تاکہ وہ ان کے دین کو قائم کریں۔ پس ان کی فضیلت کو پہچانو ان کے نقش قدم پر چلو۔ اور جس قدر ممکن ہو ان کے اخلاق اور سیرت کو مضبوطی سے پکڑو کہ وہ سیدھے راستے پر تھے۔

لہ۔ حکایاتِ صحابہ کا ترجمہ انگریزی و جاپانی اور فارسی میں ہو چکا ہے۔

میں اپنی مثال آپ[1] ہے۔ عربی جاننے والوں کے لیے صحابہ کی زندگی سے آگہی اور اثر پذیری کے لیے محولہ بالا کتب کا مطالعہ مفید بلکہ ناگزیر ہے۔

کتب تاریخ | دارالمصنفین اعظم گڑھ کی تاریخی کتب تاریخ اسلام۔ تاریخ دولت عثمانیہ۔ تاریخ اندلس۔ تاریخ صقلیہ وغیرہ ایک ایک نظر سے گزریں۔ شبلی مرحوم کا ایک قول حضرت الشیخ قدس سرہٗ نے حیات شبلی میں نقل کیا ہے کہ "تاریخ تو شبلی کے دسترخوان کی چٹنی تھی"۔ یہ چٹنی زبان کا چٹخارہ بن گئی اور اپنے تاریخی ذوق کی آبیاری عربی، اردو اور انگریزی کی کتابوں سے کرتا رہا۔ عربی میں طبری ابن خلدون ابن اثیر ابن کثیر ابن قتیبہ بلاذری وغیرہ کتابیں دیکھیں۔ انگریزی میں فلپ ہٹی کی ہسٹری آف عربس اور ہسٹری آف سیریا۔ گبن کی DECLINE AND FALL OF ROMAN EMPIRE میور کی THE CALIPHATE اور دیگر متعدد کتب اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام وغیرہ کے متعلقہ حصے پڑھے اور ان کا تریاق اپنے بوریانشین مورخین ہی کی کتابوں میں دکھائی دیا۔ مستشرقین کا طبقہ بڑا پرکار ہے۔ ان کے شہد غاسم قاتل سے بچنے کے لیے گہری نگاہ اور ہوشمند دل کی ضرورت ہے۔

دارالمصنفین نے استشراق کے فتنہ کا جس بے جگری سے مقابلہ کیا: اس کی مثال معاصر عہد میں کم ہی ملتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی یہ خوش نصیبی ہے کہ وہاں دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ندوۃ المصنفین، دائرۃ المعارف حیدرآباد تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ جیسے متعدد ادارے موجود ہیں۔ جن کی اکثر کتابیں دنیا کی کسی بھی مجلس علمی کے لیے فخر و مباہات کا سبب بن سکتی ہیں۔

---

[1] مقام شکر ہے کہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی نوراللہ مرقدہ کی حیاۃ الصحابہ کا مکمل اردو ترجمہ شائع و مقبول ہو چکا ہے۔

دارالمصنفین نے سوانح پر جو کتابیں شائع کی ہیں وہ تحقیق و استناد کی بلندی کے ساتھ اردو ادب کا اعلیٰ سرمایہ ہے غرض ہیچمدان دارالمصنفین کی کتابوں کا ہمیشہ زلہ ربا رہا اور اپنی جہالت کی پردہ پوشی ان کتابوں کی ورق گردانی سے کرتا رہا۔ دارالمصنفین کیساتھ تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ اور ندوۃ المصنفین دہلی کی علمی و ادبی تصنیفات سے خوشہ چینی کا اعتراف نہ کرنا احسان فراموشی ہوگی۔ فقیر جدید طبقہ اور عام مسلمانوں کی ذہنی الجھنوں کا مداوا بڑی حد تک ان اداروں کی مطبوعات میں پاتا ہے۔

حضرت سید سلیمان ندویؒ عرض کر چکا کہ شبلی کی سیرت نے سیدی و مطاعی حضرت الشیخ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی بارگاہ تک پہنچا دیا۔ حضرت سید صاحب نوراللہ مرقدہ میرے صرف دینی اور روحانی پیشوا ہی نہ تھے بلکہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۲ء تک کا دس سالہ زمانہ ایسا گزرا کہ جہاں بھی رہا۔ دل ان کے پاس تھا۔ اور ان کی ہر تحریر و ہر سطر فقیر کے لیے سرمہ بینش، مایہ تسکین، مہمیز عمل اور روشنی کا مینار تھی۔ سیرۃ النبی کے بعد "سلیمانیات" کا جو حرف و شوشہ ملا، حرز جان تھا۔ میرے لیے علم عمل کی بلندیوں کا دائرہ حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کی ذات بن گئی تھی، گو ان کی نگاہ پاک اور پر پرواز کا جو تقاضا تھا اس کی پرکاہ کو بھی نہ پا سکا کہ

فیضِ ساقی ہے باندازہ ظرف میخوار　　　دل حریف مئے بسیار کہاں سے لاؤں

تاہم اپنی کوتاہیوں کے باوجود فکر و نظر کی رہنمائی ہمیشہ حضرت والاؒ کی تحریروں اور ارشادات سے پائی اور بحمداللہ تعالیٰ یہی فقیر کا سرمایہ زندگی ہے ؎

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر　　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

حضرت والاؒ قدس سرہٗ کو دین و مذہب کے علاوہ تاریخیؔ[1]۔ ادبی۔ علمی۔ تحقیقی۔

---

[1] حضرت سید صاحبؒ کا تاریخ میں مقام مسلمہ ہے۔ آپ کی نظر تاریخ (بقیہ ص ۱۸۲ پر)

غرض ہر راہ میں اپنا سمجھا۔ اور بحمد اللہ آج بھی حال یہ ہے کہ ؎

خدا جانے مجھے کیا کہہ کے ساقی نے پلا یا

وہ کب کا جا چکا پھر بھی نظر آتا ہے محفل میں

حضرت والا قدس اللہ روحہ کی تحریریں میری زندگی پر کس کس طرح اثر انداز ہوتی تھیں۔ اس کا اندازہ صرف دو واقعات سے فرمائیے

۱۔ حضرت تھانویؒ کی کتابیں بہشتی زیور۔ التکشف وغیرہ والدہ صاحبہ مدظلہا کے کتب خانہ میں موجود تھیں۔ لیکن ان دونوں کتابوں میں "پیر و مرید" کے باہمی آداب و ضوابط پڑھکر "راہ سلوک" مجھ جیسے کوتاہ ہمت کو پہاڑ معلوم ہوتی تھی اور اس گھاٹی کے قریب جانا بھی دشوار معلوم ہوتا تھا۔ اس بارے میں ذہنی کشمکش و حیص و بیص میں مبتلا تھا کہ ۲۲ جولائی ۱۹۴۳ء (۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ) کو شیخ الکل حکیم الامۃ حضرت شاہ اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ کا وصال ہو گیا۔ اخبار "ڈان" دہلی میں سانحہ ارتحال کی خبر پڑھی اور اس میں حضرت قدس سرہ کے خلفاء میں حضرت سید صاحبؒ کا

(بقیہ ص۱۸۱ سے) کے جملہ شعبوں پر انتہائی عمیق تھی۔ آپ کی تحریروں میں اتنا رہنما مواد مل مل جاتا ہے جس کی بنیاد پر تحقیق کی نئی اور عظیم راہیں کھل سکتی ہیں۔ فقیر نے اپنے انگریزی مقالہ THE EARLY INDO-ARAB RELATIONS میں حضرت ہی کی کتابوں کو بنیاد بنا کر اپنے خاکہ میں رنگ بھرا ہے۔ گو دیگر مصادر بھی کافی ہیں لیکن بنیاد اور خیال انگیز حضرت ہی کا سرمایہ ہے۔ اس مقالہ میں چار ہزار قبل مسیح سے لے کر عربوں کی فتح سندھ تک عرب و ہند کے تعلقات، کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ میرا ایم اے عربی کا مقالہ تھا۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ حضرت کی اپنی معرکۃ الآراء کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" کے نام سے موجود ہے۔

نام پڑھا۔ خوش بختی نے کہا ـــــ ع۔ آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

اس تقریب کو حضرت سید صاحب نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں رسائی کا بہانہ بنایا۔ خط لکھا۔ چوتھے دن خط کا جواب اعظم گڑھ سے پشاور پہنچا۔ مقصد بر آیا اور سلوک کی مہیب راہ حکمت سلیمانی سے گلدہ جنت معلوم ہونے لگی۔ سچ ہے۔

ع۔ ساقی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے۔

پھر کیا تھا۔ در مکاتبت وا تھا۔ دل بے اختیار پکار رہا تھا۔

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (النمل ع۳)

اے میرے پروردگار میں نے اب تک اپنے نفس پر ظلم کیا۔ اور میں اب سلیمان کے ساتھ اللہ جو جہانوں کا پروردگار پر ایمان لایا۔

اور زبان حال کہہ رہی تھی ؎

اب درِ پیر مغاں چھوٹے نہیں　　اس کی مٹی میں بھی فیضِ جام ہے

حضرت حکیم الامت قدس روحہ کے وصال پر جو مضمون معارف[۱] اعظم گڑھ میں آیا اس نے رہی سہی کی کسر پوری کر دی۔ اور کوچہ سلیمانی کی گرد ہمیشہ کے لیے سرمۂ[۲] چشم

---

[۱]۔ پہلے خط کے بعد اگست ۴۳ء کا معارف آیا۔ حضرت سید صاحب نے ارتحال شیخ قدس سرہٗ پر "موت العالم موت العالم" کے عنوان سے کاغذ پر اپنے سوختہ اور خون شدہ دل کے ٹکڑے بکھیر دیئے تھے۔ اس منثور مرثیہ کی ہر بات نشتر بن کر دل میں پیوست ہو گئی اور عظمت اشرفیہ کا انمٹ نقش قلب پر مرتسم ہو گیا۔

[۲]۔ حضرت والا نور اللہ مرقدہ کے سلوک پر بندہ کی ایک کتاب "سلوک سلیمانی" شائع ہو چکی ہے اور دوسری ضخیم کتاب شاہراہِ معرفت (جس پر حضرت مولانا عبد الماجد (بقیہ صـ پر)

بن گئی اور طریق اشرفی کی بادہ پیمائی سرمایہ سعادت ٹھہری ـــــــ ؎

حیاتِ نو مجھے ان کی نگاہِ نازنے بخشی

بھرا ہے آبِ حیوان کاسۂ زہر ہلاہل میں

۲۔ معارف ستمبر ۱۹۴۲ء میں حضرت مولانا الیاس اور ان کے سفر لکھنؤ و کانپور وغیرہ کے حالات کلکِ سلیمانی نے اس تاثیر میں ڈوب کر لکھے تھے کہ ہر بات اپنا اثر دکھاتی گئی ؎

ادھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل میں
اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعوی باطل میں

اور نتیجۂ زندگی ان کی تحریک[1] کی گرد بن کر رہ گئی۔

(بقیہ ص سے) دریا بادی۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے مقدمات اور حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب مدظلہٗ جیسے اکابر کی تقریظ ہے) ہنوز تشنۂ طباعت ہے۔

[1] تبلیغی کام اعلاء کلمۃ اللہ اور احیاء دین کے لیے ایک علمی جدوجہد اور کوشش ہے جس کا خاکہ و عملی ڈھانچہ نصوص قرآن و سنت اور اسوۂ صحابہ کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ یہ کام نظری سے زیادہ عملی ہے اس لیے اصلاً اس کے مالہ و ما علیہ کے سمجھنے کے لیے اس کام کے ذمہ دار حضرات کے ساتھ معتد بہ وقت گذارنا ناگزیر و ضروری ہے۔ تاہم دیگر تحریری کوششوں کے علاوہ فقیر کی بعض قلمی کاوشیں ایک گونہ اس کام کے وضوح میں ممد ثابت ہو سکتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ الفرقان لکھنؤ میں چھ نمبروں پر متعدد مضامین

۲۔ کتاب پیام رسانِ امت

۳۔ الفرقان لکھنؤ کے حضرت مولانا یوسف نمبر میں بنگلا کا مقالہ "صدیق وقت یوسف اقلیم دین و دعوت"۔ کاش فقیر کی تشنۂ تکمیل کتاب "نظام ہدایت" مکمل ہو جاتی تو اس سلسلہ میں کافی مواد منظرِ عام پر آجاتا۔

علامہ شبلی مرحوم کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں حضرت سید سلیمان ندوی جیسا ہونہار و باوفا شاگرد مل گیا جس نے استاذ مرحوم کے کاموں کو نہ صرف باقی رکھا۔ بلکہ چالیس سال تک اپنی خداداد صلاحیتوں سے اسے نکھارتے اور آگے بڑھاتے رہے۔ حضرت سلیمان ندوی استاذ مرحوم سے علم و تقویٰ میں گوئے سبقت لے گئے تھے۔ لیکن وفاشعاری کا کمال تھا کہ اپنی تمام رفعتوں کو استاذ کے آستانہ پر قربان کرتے رہے۔ اور جب تک حضرت سلیمان ندوی زندہ رہے۔ شبلی کی مسند علم خالی نہ ہو سکی۔ کاش حضرت سید صاحبؒ کو اپنے جیسا کوئی امام الاوفیاء اور فدائی مل جاتا۔ جو ان کے محاسن و فضائل مزایا و کمالات اور کارناموں کو نہ صرف اجاگر کرتا بلکہ انہیں مزید جلا بخشتا ؎

فمن يسع او يركب جناحى نعامة   ليدرك ما قدمت بالامس يسبق

حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے حیاتِ شبلی لکھ کر نہ صرف استاذ مرحوم کے کارناموں کو نکھارا بلکہ مسلمانانِ ہند و پاک کی پچاس سالہ علمی و ثقافتی۔ ادبی و سیاسی تاریخ بھی قلمبند فرما گئے اس مبسوط سوانح کا بڑا کمال یہ ہے کہ استاذ کی بے مثال محبت تاریخیت و حقیقت کو مجروح نہ کر سکی۔ حضرت سید سلیمان ندوی کی قلمی دیانت و تاریخی غیر جانبداری کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ شبلی کی بے پایاں عقیدت کے باوجود یہ بلیغ فقرہ حیات شبلی میں رقم فرما دیتے ہیں۔

"بہر حال شبلی شبلی تھے جنید و شبلی نہ تھے"

حیات شبلی کا دیباچہ و مقدمہ مستقل اہمیت کی وقیع علمی دستاویز میں ہیں۔ غرض اپنی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر یہ کتاب اردو کی مبسوط سوانح عمریوں میں سب پر گوئے سبقت لے گئے اور اردو کلاسیکی ادب میں ایک عظیم اضافہ ہے۔ حضرت سید صاحبؒ کی کتابوں میں خیام اپنی نظیر آپ ہے۔ علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے سید صاحب کو اس کتاب کے بارے میں خوب لکھا تھا۔ عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے۔ اس پر اب کوئی مشرقی

یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔ الحمد للہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا"، یہ کتاب خیام پر مباحث کے علاوہ دیگر کئی مسائل پر عجیب و نادر تحقیقات کا انمول مجموعہ ہے۔ مثلاً فارسی رباعی کی تاریخ اور فلسفیانہ تصوف، وغیرہ کی بحثیں قابل دید ہیں یہ کتاب اردو ادب کے تحقیقی سرمایہ کا فخر ہے۔

تاریخ ارض القرآن جوانی کی ابتدائی تصنیف ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر پہلی اور سب سے زیادہ کامیاب، کتاب ہے۔ گو حضرت سید صاحب نور اللہ مرقدہ خود فرماتے تھے کہ یہ کتاب اب نیا پر پرواز چاہتی ہے لیکن اس کی تالیف پر ساٹھ سال گزر جانے پر بھی اس موضوع پر معتدبہ اضافہ نہ کیا جا سکا۔ اور یہ کتاب اپنی نظیر آپ ہی رہی۔

سیرت عائشہ حضرت ام المومنین کی بے مثل سوانح ہے یا یوں کہیئے "سیرت نبوی" کا صنفِ نازک کی نسبت سے تمتہ ہے۔ جو حضرت صدیقۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے کمالات علمی و عملی کا نادر مرقع و آئینہ ہے جسے دیکھ کر ہر زمانے کی عورتیں اپنی زندگی سنوار سکتی ہیں۔ حیات مالک امام دار الہجرت کی بہترین سوانح ہے۔

"عربوں کی جہازرانی" اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے "عرب و ہند کے تعلقات" حضرت سید صاحبؒ کی تاریخی بالغ نظری وسعتِ مطالعہ پر شاہد ہے۔

سید القلم تقریباً نصف صدی تک رواں دواں رہا۔ تصنیفی عمر کے ان پچاس سالوں میں حضرت سید صاحبؒ نے متعدد ضخیم کتابوں کے علاوہ بے شمار علمی و ادبی مقالات اور کتابوں پر مقدمات لکھے۔ صدارتی علمی خطبات پڑھے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر علم و دانش تحقیق و ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ مزید برآں ہزارہا علمی و تحقیقی مسائل کے جواب لکھے بے شمار مکتوبات تحریر فرمائے۔ جن کی افادیت مسلمہ ہے۔ اللہ تعالےٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ دار المصنفین کے اس زاویہ نشین درویش بے گلیم نے علم و تحقیق کی کتنی محفلیں سجائیں

اور دین و مذہب کی کتنی گتھیاں سلجھائیں اور عہد حاضر کے استشراق اور علمی فتنوں کا کس بے جگری و کامیابی سے مقابلہ کیا۔ مجھ سا کم ظرف (جو سرتاپا ان کی نگاہ کرم کا پروردہ[1] ہے) ان کے کمالات کا کیا اندازہ لگا سکتا ہے ——— ع

دامن نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

تاہم فقیر کی جستجو و کوشش یہی رہی کہ دانش و عرفان سلیمانی کا کوئی گوشہ نگاہوں سے اوجھل نہ رہے گو ——— ع برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

حضرت مولانا تھانویؒ | حضرت سید صاحبؒ کی کشف برداری نے شیخ الکل حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت اشرف علی تھانویؒ نوراللہ مرقدہ کی بارگاہ قدس تک پہنچا دیا۔ ۱۲/اکتوبر ۱۹۵۰ میں جب کراچی میں خدمت عالیہ میں پہلی حاضری ہوئی۔ استفسار فرمایا: آپ نے حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ (حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہ) کے مواعظ و ملفوظات پڑھے ہیں۔ فقیر نے نفی میں جواب دیا۔ ارشاد فرمایا: حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات و مواعظ پڑھیئے۔ وہاں ہر بات اندر سے پھوٹ کر نکلی ہے۔" پھر کیا تھا! حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے مواعظ و ملفوظات، رسائل و کتابیں فقیر کی روز و شب کا مشغلہ بن گئیں ——— اور بحمداللہ تعالیٰ آج پوری بصیرت و دیانت کے ساتھ یہ بات کہنے میں باک نہیں کہ حضرت تھانوی کی کتابیں امت کے ہر مرض کا مداوا اور ہر بیماری کے لیے تریاق ہیں۔ ایک دور افتادہ قصبہ میں بیٹھ کر یہ مرد درویش علم و دین کی جتنی علمی و عملی۔ ذہنی و روحانی خدمت کر گیا، پوری پوری اکاڈمیاں اور مدارس و خانقاہیں مشکل کر پاتی ہیں۔ نوسو کے قریب کتابیں چار سو مواعظ (جو عام تقطیع کے تقریباً بیس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں) ملفوظات کے ہزاروں صفحات اپنے ورثہ علمی میں امت کی راہنمائی کے لیے چھوڑ

---

[1] اقبال کا شعر ہے ؎ میرا درس حکیمان درد سر داد کہ من پروردۂ فیض نگاہم

حضرت حکیم الامتؒ کے مواعظ و ملفوظات جدیدہ و قدیم عامی و عالم ہر طبقہ کے امراض روحانی کے لیے قرابادین شفا ہیں۔ تربیت السالک، انفاس عیسیٰ وغیرہ میں نفسانی و باطنی امراض کے جو نیز بہدف علاج بتلائے ہیں اور جس دقت نظری اور ایمانی بصیرت سے امراض کی تشخیص کی ہے پورے اسلامی کتب خانہ میں اسکی نظیر شاذ ہی ملے گی۔ حضرت مجدد الملۃ نور اللہ مرقدہ کی ہر کتاب علم و معرفت کا گنجینہ اور برکات ظاہری و باطنی کا خزینہ ہے۔ مبتدی طالب علم کے لیے ابتداء میں حضرت والا قدس سرہٗ کے پچاس سے سو تک مواعظ اور ملفوظات (حسن العزیز وغیرہ) کا مطالعہ مفید رہتا ہے۔ پھر تعلیم الدین قصد السبیل، اصلاح الرسوم صفائی معاملات حیاۃ المسلمین اور بہشتی زیور کا بغرض استفادہ و عمل مطالعہ بفضلہٖ تعالیٰ کفایت کر دیتا ہے۔ گو طالب صادق آخر دم تک طالبعلم اور سالک آخر وقت تک سعی و کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ ورد من قال ؎

اندریں راہ می تراش و می خراش — تادم آخر دمے فارغ مباش

قصد السبیل گو ۴۶ صفحہ کا رسالہ ہے لیکن حکمت اشرفیہ نے سلوک کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ بہشتی زیور گو عورتوں کے لیے لکھا گیا ہے، لیکن حقیقتاً حنفی نکتہ نظر سے مسائل کا ایک قیمتی و محتاط ذخیرہ ہے، جس کا مطالعہ و استحضار ایک وسطانی عالم کی فقہی معلومات کے بقدر ہے۔ بیان القرآن اور نشر الطیب کے بارے میں فقیر کی معروضات گزر چکی ہیں، سلوک میں حضرت کی کتاب التکشف عن مہمات التصوف خصوصاً اس کا پانچواں حصہ خاصا کی چیز ہے اور فقیر کی ذہنی ساخت میں اس کا عظیم حصہ ہے۔ التشرف احادیث سلوک کا اچھوتا مجموعہ ہے اور مسائل السلوک میں قرآنی نصوص سے فنی اعتبارات و حقائق کو ثابت کیا گیا ہے، کلید مثنوی رومی کے حقائق و رموز کی شاہ کلید ہے اور فنی نکتہ نظر سے مثنوی کی اردو میں اشرف الشروح ہے۔ اعلیٰحضرت حاجی

امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے حواشی اور بحر العلوم کی خاص شرح بھی اپنے رنگ میں خوب ہیں شیخ الکل حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے سلف صالحین کے طریقے کے مطابق سلوک کو ہر غل وغش سے پاک کرکے کتاب وسنت کی روشنی میں نکھار کر امت کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ آپ کی صوفیانہ تصنیفات انشاء اللہ رہتی دنیا تک امت کے لیے قندیل ہدایت بنی رہیں گی، تجدید تصوف سلوک کا یہ کارنامہ مجددیت اشرفیہ کے تاج کا تابندہ گوہر ہے ؎

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور مے خانہ

یہ عجالہ اس دور کے اعظم المصنفین کے علوم وکمالات کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے اور نہ یہاں استقصاء مقصود ہے تاہم یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ علوم اشرفیہ کا بحر ناپیدا کنار بقدر طلب وظرف ہر طالب کی پیاس بجھانے کے لیے کافی ہے۔

حضرت سید صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے مکاتیب کا تعلق ۱۹۴۳ء میں قائم ہوا سلوک کی طرف توجہ ہوئی۔ گھر میں مکتوبات امام ربانی (مجدد الف ثانیؒ) کا ترجمہ موجود تھا۔ ابتدا اس سے ہوئی۔ حضرت مجدد کے مکتوبات نے شرعی تصوف شریعت وطریقت کی عینیت ویکجائی، ذات باری کی تنزیہ۔ وحدۃ الوجود وواحدۃ الشہود اور دیگر مسائل سلوک کی حقیقت واضح فرما دی۔ اور اس راہ میں اپنا مسلک یہ بن گیا ہے "ما را نص در کار است نہ با فص ما را فتوحات مدینہ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ است۔

حضرت تھانوی اعلی اللہ مقامہ کی کتابوں حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الانیقۃ (التکشف جلد پنجم) اور مسائل السلوک سے بھی یہ بات دل میں پیوست ہو گئی کہ شریعت عین

لے۔ مکتوب صد

طریقت ہے اور طریقت عین شریعت، دیگر ہیچ اس کے سوا جس نے کچھ کہا وہ یا شریعت کو نہیں جانتا یا طریقت سے ناواقفیت ہے۔

کتب تصوف | سلوک کی کتابوں میں سراج طوسی کی کتاب اللمع محاسبی کے رسائل خصوصاً رسالۃ المسترشدین عبداللہ انصاری ہروی کی منازل السائرین طالب مکی کی قوت القلوب امام قشیری کا رسالۃ القشیریۃ علی ہجویری کی کشف المحجوب، امام غزالی کی احیاء العلوم (مع تخریج عراقی) وکیمیائے سعادت شیخ سہروردی کی عوارف المعارف، حضرت شیخ جیلانی کی غنیۃ الطالبین، فتوح الغیب، یحییٰ منیری کے مکتوبات سہ صدی، نظام الدین اولیاء کے فوائد الفوائد۔ ابن عربی کی خصوص الحکم و فتوحات مکیہ، مولوی رومی کی مثنوی معنوی، ابن قیم کی مدارج السالکین الوابل الصیب۔ وغیرہ امام شعرانی کی کتابیں مجدد سرہندی کے مکتوبات، شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابیں خصوصاً قول الجمیل۔ تفہیمات الٰہیہ کے بعض مقامات۔ حجۃ اللہ البالغہ مباحث احسان وغیرہ۔ شاہ اسمٰعیل شہید کی صراط مستقیم و عبقات۔ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی جملہ تصنیفات اور ان کے سلسلۃ الذہب سے منسلک مشاہیر اکابر متقدمین و متاخرین کی صوفیانہ کتابیں اور دیگر ائمہ سلوک کی مہم کتب و اسلامی سلوک کا بیش بہا سرمایہ ہے۔

گو سلوک سراپا عمل ہے تاہم علمی اعتبار سے ان اساطین صوفیہ کی کتابیں اسلامی سلوک کی حقیقت اور عہد بہ عہد کی فکری تاریخ سے ایک گونہ آگاہ کر سکتی ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ تصوف کے بارے میں علمی معلومات کا انبار کفایت نہیں کرتا بلکہ کسی شیخ کامل کی تربیت اور علمی محنت و کوشش منزل تک پہنچاتی ہے۔ اسلیے کہا گیا ہے ؎

صد کتاب و صد ورق را در نار کن　　　قلب خود را جانب دل دار کن

حضرت الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی نوراللہ مرقدہ کی برکات کا اثر ہے کہ ان کے انتساب کی وجہ سے یہ "بدنام کنندہ نکو نامے چند" ہو کو چک کی بعض عظیم دینی

علمی شخصیتوں کی نظرِ کرم الطاف و توجہات کے قابل ٹھہرا (الحمد للہ علیٰ ذالک)

مولانا عبدالباری ندوی | ان میں پہلے بزرگ حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کے رفیق قدیم حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے خلیفہ و مجاز بیعت قدیم و جدید فلسفہ کے ماہر ہمارے مخدوم محترم حضرت مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ ہیں جن کی کتابوں کا تجدیدی سلسلہ تجدید تصوف و سلوک، تجدید دین کامل، تجدید تعلیم و تبلیغ، تجدید معاشیات علوم اشرفیہ کی ترجمانی و وضاحت میں اور اپنی افادیت میں بے مثل ہے اور جدید طبقہ کے لیے حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے علوم کی کلید ہے۔ حضرت موصوف کی ان چاروں کتابوں سے بندہ فیضیاب ہوا۔

"سورہ والعصر کی تفسیر" اپنے رنگ میں لاجواب اور فریضۂ تبلیغ و دعوت پر خاصہ کی چیز اور ہر مسلمان کے پڑھنے کے قابل ہے۔

"مذہب اور سائنس" تو مولانا کا شاہکار، ان کی قدیم و جدید علوم سے واقفیت کی شاہد اور سائنسی علوم سے مرعوب اشخاص کے لیے نادر تحفہ ہے۔

عبدالماجد دریابادی | دوسری شخصیت حضرت سیدنا قدس سرہٗ کے صدیق حمیم اردو کے صاحب طرز و فخر ادیب، صدق کے مدیر، شہیر مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہٗ کی ہے۔ مذاہب عالم اور عصری علوم پر ان کی نگاہ بہت گہری و ہمہ گیر ہے مشرقی و مغربی علوم سے یکساں بہرہ ور ہیں جس پر ان کی تفسیر (انگریزی)[1] اور اردو

---

[1] تفسیر ماجدی (انگریزی) دینی لٹریچر کا ایک گراں مایہ سرمایہ۔ قابل علمی کوشش۔ قرآن کے "مھیمن"، "مصدقاً لما معھم" ہونے پر دلیل ناطق اور برہان قاطع ہے۔ تفسیر میں دیگر ادیان کے مصنف و کتب سے قرآنی آیات کے شواہد اور ہم معنی آیتیں اس قدر کثرت سے نقل کر دی گئی ہیں کہ استقصاء پر حیرت ہوتی ہے۔ تقابل (بقیہ صفحہ پر)

اور صدق کی نگارشات شاہد ہیں۔

یوں تو صدق اور صاحب صدق کی تحریر[۱] مدتوں سے قلب ونظر کی بالیدگی اور ادبی ذوق کی پاکیزگی کا سبب بنتی ہے اور ان کی اکثریت دینی و ادبی کتابوں سے استفادہ کیا۔ لیکن مولانا کی جس تصنیف نے ابتدا میں متاثر کیا وہ سفرنامہ حجاز ہے جو والہانہ عقیدت و محبت، قلبی واردات، عالمانہ حزم و احتیاط، دینی حقائق، فقہی مسائل، صوفیانہ نکات، سفری معلومات، قیمتی مشوروں، سنجیدہ و دردمندانہ تبصروں کا عجیب و حسین امتزاج ہے۔ طرز بیان دلکش و رواں انشائے ماجدی کا اعلیٰ نمونہ، ہر ذوق کے قاری کے لیے وافر مواد مہیا ہے۔ شروع کیجیے تو ختم بغیر چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ مولانا کی باقیات صالحات میں یہ سفرنامہ انشاء اللہ اونچا مقام پائے گا۔ کتاب کا مقدمہ حضرت الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی نوراللہ مرقدہٗ کا لکھا ہوا ہے اور سلیمانی جامعیت و ادبیت کا مرقع۔

دوسری کتاب "حکیم الامت" ہے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کئی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں۔ لیکن قلم ماجدی نے حکیم الامت نوراللہ مرقدہٗ کی زندگی کے جو حکیمانہ نقوش و والہانہ خاکہ ہوشمندانہ سراپا کھینچا ہے۔ اسلوبِ بیان طرز اور پیشکش میں اچھوتا مقام رکھتا ہے حضرت قدس سرہٗ کی دلبرانہ زندگی قلندرانہ ادائیں، علمی ذوق ادبی مذاق، تربیت و دقیقہ رسی و پاسداری حقوق، رعایت جلیس، نرمی و محبت، ضبط اوقات و نظم معمولات ——— بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست کی جو تصویر

(بقیہ صہ سے) ادیان اور اہل کتاب کے صحف سے موازنہ اور ان کی شہادتوں سے قرآن کی سچائی کا ثبوت، خاصہ کی چیز ہے۔ غالباً تفسیری ادب، اس قسم کی نظیر سے خالی ہے۔

[۱] ۔ سوائے ان کے ایک معلوم تفردّ کے۔

"حکیم الامت" میں دکھائی دیتی ہے دلکش و زیبائی کی بہترین مثال ہے۔

تیسری کتاب "محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق" ہے۔ زندگی میں جن چند کتابوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ یہ کتاب ان میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔ کلک ماجدی کو محمد علی کا نام ہی گویا وجد میں لاتا ہے مولانا کا شدت تأثر ہر لفظ سے چھلکتا ہے۔ کاغذ پر الفاظ کی بجائے درد دل اور خون جگر عجیب بے تابانہ انداز میں بکھرا دکھائی دیتا ہے۔ شاید کوئی منظوم مرثیہ اتنا دردناک اور قرب انگیز ہو۔ جنتے محمد علی جوہر کی زندگی یہ سادہ و منشور واقعات، محمد علی کا حرف آخر اور نقطہ نقطہ دل میں اتر جانے والی نصیحت، درس بصیرت اور مرقع حیرت[1] ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کو زندگی میں جن محرومیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس کی کامیاب موت کے بعد سیرت جوہر کی یہ معجز نما نقاب کشائی اس کی ما بعد الموت کامرانیوں کا ایک حصہ ہے اور شاید اس کے شعر سے

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر — مرکے جوہر آپ کے جوہر کھُلے

کی جیتی جاگتی تعبیر ہے۔

صاحب صدق کے یہ جواہر پارے جوہر کے حق میں "لسان صدق فی الآخرین" وجعلها کلمة باقية فی عقبه لعلهم يرجعون کے مصداق ہوں گے۔

ناسپاسی ہوگی اگر مولانا دریابادی کے مرتب کردہ مکتوبات[2] سلیمانی کا یہاں تذکرہ

---

[1] - باب ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۸۸ اور اس کے ضمیمے تو قیامت ہیں۔

[2] - فقیر کا دونوں جلدوں پر تبصرہ صدق جدید لکھنؤ کے شماروں میں شائع ہو چکا ہے حضرت الشیخ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مولانا دریا بادیؒ کے نام مکتوبات کا یہ مجموعہ مولانا موصوف نے فقیر اور دیگر دوستوں کے اصرار پر اپنے مفصل حواشی کے (بقیہ ص ۱۹۴ پر)

نہ کیا جائے۔ بحثی مکتوبات کے اس مجموعے میں برصغیر کے مسلمانوں کی چالیس سالہ کلی و ادبی، دینی وسیاسی تاریخ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مولانا کی علمی وادبی خدمت وابستگان دامن سلیمانی پر ایک عظیم احسان ہے۔

ابوالحسن علی ندوی اس سلسلہ میں تیسری شخصیت مخدوم و محترم حضرت مولانا ابوالحسن علی الندوی کی ہے جو اپنی جلالت شان علمی و نظری خدمات دینی اور دعوتی سرگرمیوں کی بنا پر عرب وعجم میں یکساں مقبول اور عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ ان کی کتابیں متعدد مشرقی و مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو کر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل چکی ہیں۔ اردو، عربی دونوں زبانوں میں یکساں مہارت و عبور[1] ہے —— عربی میں ایک خاص و

(بقیہ صفحہ ۱۹۳ سے) کے ساتھ مرتب فرمایا، ادبی تاریخ میں دو نادرۂ روزگار ادیبوں اور فاضلوں کو باہمی مکاتیب کا اتنا طویل زمانہ شاید ہی ملا ہو۔ مکتوب کا یہ مرقع دو عظیم و شریف دوستوں کی چالیس سالہ رفاقت و مودت کی حسین روداد ہے جو بیش بہا علمی، ادبی تاریخی فوائد پر مشتمل ہے۔

[1] علی الطنطاوی نے کیا خوب کہا ہے: ولقد کنت احب حین اقراء لابی الحسن فأجد لرجل من الهند هذا الاسلوب البليغ وهذه الاصالة وهذا الطبع ثم زال العجب راظهر السبب وعلمت ان ابا الحسن عربی صریح صحیح النسب کالاسبها فی مؤلف الاغانی والابیوردی الشاعر وهما قرشیان امویان والفیروزآبادی صاحب القاموس وان خیر عربیة متواتر مستفیض فی الهند فمن هنا جاء هذا البیان الذی قل نظیره فی هذه الایام۔
وقل یشغل غیر العربی بعلوم العربیة حتی یکون اماما فیها فی اللغة والنحو والصرف والاشتقاق

متبکر اسلوب نگارش کے موجد ہیں۔ یہ طرز عربی ادب عالیہ کی ایسی صنف ہے جس میں دینی علوم و کمال فصاحت و بلاغت و عمدہ زبان میں جدید و قدیم طبقہ کے سامنے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ علی میاں کی زبان میں غذدیت و حلاوت درد و سوز، بلندی فکر داعیانہ ولولہ، عاشقانہ جذب و رخانہ تحقیق، عالمانہ احتیاط حکیمانہ دانش، ادیبانہ رعنائی ساحرانہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ وہ خود سراپا سوز درد ہیں۔ ان کا خمیر محبت و نرمی محبت سے عبارت ہے علم و تقویٰ نے ان سے فروغ پایا ہے اور جامعیت علوم کی سندان سے مزین ہے۔ مشرق و مغرب کے دینی و عصری تقاضوں اور جدید طبقے کے نبض آشنا ہیں۔ ان کی تحریر دلوں کے اندر اتر جاتی ہے اور بیک وقت دل اور دماغ دونوں کی تسلی کا سامان مہیا کر دیتی ہے۔

مولانا موصوف کی جس کتاب نے سب سے پہلے گھائل کیا وہ سوانح[1] مولانا الیاس ہے جو بار بار پڑھی اور ہر مرتبہ قلب و روح نے لطف تازہ پایا۔ ایک مرد حق آگاہ جس کی زندگی ؎

مسلمانی غم دل در خریدن ۔۔۔ چو سیماب از تپ یاران تپیدن
حضور ملت از خود در گذشتن ۔۔۔ دگر بانگ انا الملت کشیدن

کا عملی نمونہ تھی۔ اس کا سراپا و سوانح ایک دل فگار قلم نے آب دیدہ و خون جگر

(بقیہ ۱۹۴ سے) وفي سعة الرواية بل اكثر علماء العربية كانوا في الواقع من غير العرب ولكن من النادر ان يكون فيهم من له مثل هذا (الذوق الا) الذي تعرفه لابي الحسن فلو لم تثبت عربيته بصحة انسب ثبت باصالة الادب۔ (المسلمون في الهند ص۲)

[1] کتاب کا مقدمہ سیدی الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہ کے ایجاز رقم کا اعجاز ہے

سے لکھا ہے کمال یہ ہے کہ جذبات کا تلاطم اور جوشِ محبت کتاب کی سنجیدگی نفاہت و ہوش پر غالب نہیں آیا۔ سچ ہے ؎

درکفِ جام شریعت درکفے سندان عشق

ہر ہوسنارکے نداند جام سندان باختن

دوسری کتاب تاریخ دعوت وعزیمت ہے جو امت مسلمہ کے لافانی کمالات، جاودانی، اثرات، دائمی ثمرات بارآور مزاج، ثمر فطرت اور زرخیزی زمین کا بیّن ثبوت ہے ؎

جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں

ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

حضرت علی میاں مدظلہ نے یہ کتاب لکھ کر وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کر دیا ہے[۱]۔ اسلامی دعوت وعزیمت کے اعاظم الرجال اپنے ماحول میں جن فتن وآزمائشوں

---

[۱] - اسلامی دینی، علمی ومعاشرتی تاریخ سے ناواقفیت (شاہی خانوادوں کی تاریخ کی سرسری شدبد رکھنے والے) اپنی بے بصری سے "عصر سعادت" کے بعد اسلام کے زوال کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں گویا (خاکم بدہن) اسلام کے ان نادان دوستوں کے نزدیک خلافت راشدہ کے بعد اسلام کا اپنا پیغام ونظام چلن ودعوت ختم ہی ہو کر رہ گئی حالانکہ خلافتِ راشدہ کا خاتمہ اسلام کے "معیاری اور نمونہ" کے دور کا اختتام تھا۔ ملوکیت سے اسلام نہیں مٹا صرف اسلامی آئین کی ایک دفعہ اپنی جگہ سے ہٹی، جسے مسلمانوں نے آسانی سے برداشت نہیں کیا۔ واقعہ کربلا، واقعہ حرہ۔ نفسِ ذکیہ کا خروج وغیرہ اس احتجاج کا رنگین ثبوت ہیں۔ امت کا عمومی مزاج باقی رہا اور ان شاء اللہ تعالیٰ ہمیشہ رواں دواں رہے گا۔

سے دوچار ہوئے اور انہوں نے اپنی خداداد بصیرت و ذہانت علم و معرفت للہیت و تقویٰ جیداری و عزم، قربانی و فتوہ سے تاریخ کے مختلف ادوار میں امت کی شکستہ صفوں کو ثبات بخشا۔ ان کی رہنمائی کی اور اسے ساحل مراد تک پہنچایا۔ وہ امت مرحومہ پر اللہ تعالیٰ کا فضل خاص، امت کی فضیلت اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معجزہ ہے اس اعجاز و کمال کا ایک زندہ و پرشور، جاندار و پرسوز محرک عمل و مفید علم مرقع و مجموعہ ایک سید و سعید قلم کے ہاتھوں مرتب ہوگیا ہے جس کے مطالعہ سے امت کی بقاء و ترقی کے بارے میں یاس و قنوطیت کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور مستقبل میں بھی رحمت الٰہیہ سے ایسے نفوس قدسیہ کے پیدا ہونے کی امید پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ امت لاثانی، یہ دین ابدی ہے یریدون ان یطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون[1]

تیسری کتاب سوانح مولانا عبدالقادر رامپوری رحمۃ اللہ تعالےٰ ہے جس کی ہر سطر کسی سوختہ سامان دلودہ قلب اور سینہ بریاں کی پکار ہے۔ علی میاں نے اپنے شیخ کو محض ذاکر شاغل بزرگ اور زاہد مرتاض کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ نہ ہی ان کی کرامات حسی کا تذکرہ کیا۔ بلکہ اپنے شیخ عالی مقام کی بصیرت فن، اعتدال مسلک وسعت قلب و جامعیت، حقائق بینی و مہارت، سلوک اور تربیت کے غوامض و دقیقہ رسی کا بیان اس انداز سے فرمایا ہے کہ دل و دماغ، نفس و روح، سیراب و شاداب ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کے واقعات بتاتے ہیں کہ ہمارے بوریا نشین گلیم فقر میں کس طرح مختلف طبقات کے دلوں پر شاہی کرتے تھے اور معاشرہ پر اثر انداز

---

[1] ۔ اس کتاب کے تین حصے شائع ہو چکے ہیں۔ کاش چوتھا حصہ جو مجدد سرہندی اور ہندوستان کے متاخرین ارباب دعوت و عزیمت پر مشتمل ہو شائع ہو جاتا

ہوتے تھے۔ سچ ہے ؂

نہیں فقر و سلطنت میں کچھ امتیاز ایسا
وہ سپاہ کی تیغ بازی یہ نگاہ کی تیغ بازی

چوتھی کتاب "سیرت سید احمد شہید ہے" امیر المؤمنین فی الهند مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہید (رائے بریلوی) ہماری بزم و دشین کے گوہر شب چراغ قافلہ سپین کے سالار جہاد و حریت کے علمبردار ناموسِ شریعت کے پاسبان تھے۔ امیر شہید اور امام شہید (سید اسمٰعیل شہید) کے کارناموں میں صحابہ کی جیداری و فدائیت، اخلاص و تقویٰ اور اتباع شریعت کی جھلک پائی جاتی تھی۔ آہ!

درمیان کارزار کفر و دین ترکش ما آخدنگ آخریں

انگریز نے اپنے استعماری مفادات کے پیش نظر ان کی مخالفت کا ایسا صور پھونکا کہ ہما شما یگانے و بیگانے اس کی آواز میں گم ہو گئے اور مظلوم امیر شہید کو سوائے ایک مخصوص حلقے کے، غیر تو کیا اپنوں نے بھی ہدف ملامت بنایا۔ خدا کا شکر ہے کہ انہی کے خاندان کے ایک فرد فرید کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور انہوں نے امیر شہید اور ان کے رفقاء پر سے گرد و غبار سے تو بر تو پردوں کو ہٹایا اور ان کی عظمت جس کے سامنے بالاکوٹ کی بلندیاں پست ہیں۔ دنیا کے سامنے ظاہر ہو گئی۔ فقیر کے علم میں سید احمد شہید پر حضرت علی میاں اور مولانا غلام رسول مہر کی کتابوں سے بہتر کتابیں نہیں لکھی گئیں۔

یوں تو مولانا موصوف کی ہر کتاب قابل قدر، مفید اور وقتی تقاضوں کے مطابق ہے۔ سب کتابوں پر گفتگو اس مختصر مقالے پر نہیں ہو سکتی تاہم اسلامی ممالک میں اسلام و مغربیت کی کشمکش کی افادیت کا تذکرہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ موجودہ دور میں فتنہ افرنگ نے اپنی ہوش ربائی۔ مکر و کید ـــــ ظاہری چمک دمک۔ مادی ترقیات

جس طرح اسلامی ممالک کو مسحور کیا ہے اور انہیں اپنی راہ پر لگا دیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے عظیم المیہ ہے۔ اس کتاب میں مختلف رُخوں سے اس کا تجزیہ کیا گیا ہے کتاب قابلِ دید داد لائق داد ہے[1] اس طرح ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کا اردو ترجمہ "مسلمانوں کے عروج و زوال کا دنیا پر اثر" اپنی نوع کی منفرد کتاب اور مصنف کی دیدہ وری تاریخ دانی بصیرت اور فکرِ دینی کا ثبوت اور ان کی زندگی کا روشن کارنامہ ہے[2]۔

ردۃ ولا ابا بکر لھا کا ترجمہ "موجودہ طوفان اور اس کا مقابلہ" ایک نہایت اہم رفیع اور پراثر مقالہ ہے جس کا پڑھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے[3] اقبالؒ نے اپنی غزل کے بارے میں کہا ہے ؎

میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!
خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

یہی بات علی میاں کی نثر پر صادق آتی ہے کہ ان کی تحریریں ان کے دردمند دل کے ٹکڑے اور سوختہ جگر کا لہو شامل ہوتا ہے۔ ان کی ہر کتاب علم و ادب کا قیمتی سرمایہ

---

[1] بر کوچک ہند و پاک کے ضمن میں حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی مساعی کا تذکرہ کا فقدان طبیعت پر گراں ہے جس کا تذکرہ فقیر نے مصنف کے نام سے کر دیا ہے۔

[2] کتاب کا انگریزی ترجمہ THE WORLD بھی فقیر کی نظر سے گزرا ہے، خوب ہے اور ہر جدید تعلیم یافتہ کے پڑھنے کے لائق ہے۔

[3] اس مقالہ پر فقیر کے تاثرات صدق جدید لکھنؤ میں پانچ قسطوں میں شائع ہوئے تھے

ہے۔ دین اور دانش کا تجزیہ، عشق و عقل کا آمیزہ اور قدیم و جدید کا سنگم ہوتی ہے۔ ان کی تحریر کے یہ جواہر سب سے زیادہ ان کی جدید اور قابل فخر بلکہ شاہکار کتاب الارکان الاربعہ میں چمکے کھلے اور نکھرے ہیں۔ یہ کتاب ادب[1] و انشاء کا بہترین نمونہ حرف دمعنی کا اعجاز، واردات قلبی اور دلائل عقلی کا حسین امتزاج اور بیک وقت دل و دماغ کی طمانیت و تسلی کا سامان ہے۔ دیگر مذاہب سے عبادات کی خوبی و فوقیت پر استدلال جدید و قدیم دونوں طبقات کے لیے برہان ساطع و دلیل و دلیل قاطع امید ہے کہ علی میاں مدظلہٗ کی یہ کاوش احیاء العلوم الدین (غزالی) اور حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ) کے پہلو بہ پہلو حیات جاوید کے گی اور حقانیت دینی کا روشن مینار بنی رہے گی۔

ابوالحسن علی الندوی مدظلہٗ کی عربی کتابوں میں الارکان الاربعہ اور ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کے علاوہ الطریق الی المدینہ[2]، ربانیۃ لا رہبانیۃ

---

[1] ۔ تاریخ ادب کا یہ المیہ ہے کہ بہت سے عظیم ادیب جن کے ادبی شاہپارے زبان و ادب کا اعلیٰ نمونہ تھے "بزم ادب" اور "ادیبوں کی محفل" میں اس لیے جگہ نہ پا سکے کہ وہ علم و تقویٰ کی مجالس کے بھی رکن رکین تھے اور "روایتی ادیبوں" کا جامہ پہن کر نہیں آئے تھے۔

[2] ۔ لطیفہ: ۱۳۸۲ میں اللہ تعالیٰ نے پہلے حج کی سعادت نصیب فرمائی۔ اس سفر میں بحمداللہ حج سے قبل مدینہ طیبہ میں تقریباً ڈیڑھ ماہ قیام رہا۔ دیگر بزرگوں کے علاوہ حضرت میاں کی صحبتوں سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔ ان دنوں وہ اپنی کتاب الطریق الی المدینہ مرتب فرما رہے تھے۔ حج کے بعد جب جدہ پہنچا تو دل نے کہا۔۔۔ لیوپولڈ اسد نے الطریق الی مکہ (ROAD TO MECCA) لکھی۔ علی میاں نے الطریق الی المدینہ مرتب فرمائی ثم الطریق الی الجہنم یعنی الطریق الی الغرب لکھ ڈالو کہ حقیقتاً "تہذیب مغرب" (بقیہ اگلے)

روائع اقبال، حدیث مع الغرب، الصراع عین الایمان والمادیۃ مذاکرات سائح فی الشرق العربی، المسلمون فی الہند، نزہۃ الخواطر (ہشتم) وغیرہ اور دیگر کئی چھوٹے کتابچے نظر سے گذرے۔ ہر کتاب ان کی تحریر کے خصوصی امتیازات کی حامل ان کی بے چین روح اور پرسوز دل کی پکار ہے جس کا بنیادی مقصد احیاء دین اور ملت کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے اور امت کو ان سے استفادہ کی توفیق بخشے۔

بندہ شملہ میں والد مرحوم کے ساتھ مقیم تھا۔ جون ۱۹۴۱ء کی کوئی تاریخ تھی کہ میرے بڑے بھائی محمد اکرم صاحب اپنے دفتر کی لائبریری سے رسالہ معارف اعظم گڑھ لے کر آئے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اردو کے سب سے وقیع رسالہ پر نگاہ، بڑی کاغذ و طباعت کی نفاست سے نگاہوں نے لذت پائی۔ رسالہ بار بار پڑھا۔ اتنا متاثر ہوا کہ تقریباً پورا رسالہ بیاض میں نقل کر لیا۔ رسالہ معارف پر تو بعد میں گفتگو ہو گی۔ یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس رسالہ میں پہلی مرتبہ متکلم وقت مناظر اسلام حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ مدیر کے مضمون "تدوین حدیث" کی ایک قسط نظر سے گذری۔ مولانا کی ہر بات دل میں گھر کرتی چلی گئی۔ جو مصنف کے اخلاص و صداقت کی دلیل تھی۔

(بقیہ صنؒ سے) بطریق الی الجہنم ہے کہ اس کی بنا و نشو و نما "شہوات" پر کلیۃً مبنی ہے اور حدیث پاک میں وارد ہے حفت النار بالشہوات (جہنم شہوات سے ڈھکی ہوئی ہے یعنی جہنم میں دخول شہوات کی بنا پر ہے) اس خیال کا آنا تھا کہ مغربی تہذیب و تمدن اپنے تمام بے خدا و بے حیاء مناظر کے ساتھ نگاہوں میں آگیا۔

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس ۔۔۔ کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

ادھر کہتا گیا وہ ادھر آتا گیا دل میں
اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعویٰ باطل میں

وہ پہلا دن تھا کہ مولانا گیلانی کی تحریر کا اشتیاق پیدا ہوا۔ پھر ان کی ہر تحریر جہاں بھی میسر آئی شوق و ذوق سے پڑھتا رہا۔ مولانا کا میلان علم و ذوق افادہ اپنی تحریر میں رسمی حدود و قیود تصنیف کا پابند نہ تھا بقول اقبالؒ ؎

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

ان کی افتادِ طبع قاری کے سامنے بیک وقت مختلف النوع علوم و مسائل، رموز و دقائق، نکات و حقائق کو پیش کرتی چلی جاتی ہیں۔ گویا ایک مخلص و شفیق معلم کی طرح اپنے علم کے بحر ذخائر سے قاری کی تشنگی کو ایک ہی بار بجھا دینا چاہتے ہیں اور اسے وہ سب کو دکھا دینا چاہتے ہیں جو ان کی بصیر نگاہ کے سامنے ہے اور اسے ہر وہ بات بتا دینا چاہتے ہیں جسے وہ جانتے ہیں۔ اس بارے میں ان کے ہاں صبر و امساک و تحمل تاخیر دہش بھی گناہ معلوم ہوتی ہے اس لیے ان کی تحریر کی سطروں میں بھی ایسے علمی نکات مل جاتے ہیں جن تک عام رسائی مشکل ہے۔ ان کی ہر بات ان کی وسعتِ مطالعہ، عمق علم، دقیقہ رسی حقائق بینی، بصیرت دینی ژرف نگاہی پر دلالت کرتی ہے۔ اسلوب بیان میں اطناب کے بادشاہ ہیں۔ افادہ کا دریا ہر وقت مثلاً رہتا ہے اور سیل معانی اپنی روانی میں موتی بکھیرتا جاتا ہے۔ بقول اقبال ؎

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

مولانا گیلانی کی کتابوں میں النبی الخاتم تدوین حدیث، اسلامی معاشیات مقالات احسانی ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ امام ابوحنیفہ

کی سیاسی زندگی سوانح قاسمی خاصہ کی کتابیں ہیں مولانا گیلانی کے جو مقالات مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔ اگر وہ یک جا مرتب ہو جاتے تو ایک مفید علمی خدمت ہوتی مولانا گیلانی طرز قدیم کے پروردہ اور جدید تقاضوں سے آشنا تھے اس لیے ان کی تحریر قدیم وجدید دونوں طبقات کے لیے مفید ہے بہرحال مولانا گیلانی نے جو ذخیرۂ تصانیف چھوڑا ہے وہ ملت کا قیمتی سرمایہ ہے جس سے کوئی شخص مستغنی نہیں رہ سکتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب | حجۃ اللہ فی الارض افضل المحققین حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کی کتابوں میں حجۃ اللہ البالغۃ، البدور البازغۃ، ازالۃ الخفا۔ تفہیمات الٰہیہ۔ الفوز الکبیر ـــــ الخیر الکثیر۔ فیوض الحرمین القول الجمیل وغیرہ ذہن وقلب کی بالیدگی کا سبب بنتی رہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے قرآن وحدیث فقہ وکلام، تصوف وفلسفہ کے آمیزہ سے اپنی منفرد راہ نکالی ہے جس میں یہ سب علوم باہم رچے بسے ہیں۔ شاہ صاحب کے علوم سراپا موہبت وعطا والقاء ہیں جس میں کسب کا دخل کم اور واردات الٰہیہ اور توفیق ربانی کی رہنمائی زیادہ ہے۔ علی کا فیضان ان کی ہر تحریر سے امنڈتا دکھائی دیتا ہے۔ شاہ صاحب علوم ظاہریہ باطنیہ اور عقلیہ سب کے شاہسوار امام ہیں۔ اس لیے آپ نے علوم نبویہ کی توفیق ربانی سے جو تشریح فرمائی ہے اور جن رموز وحقائق کو کھولا اور جن اسرار وحقائق کو فاش فرمایا ہے وہ بیک وقت دل، دماغ عقل وروح کو مطمئن کر دیتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی کتابیں "جلوتیان مدرسہ" اور "خلوتیان میکدہ" دونوں کیلیے مفید اور سامان تسلی ہیں اور اقبال کے اس شعر کی مصداق ہیں ؎

تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب وجستجو، عشق حضور واضطراب

علم اسرارِ دین ایک غامض اور ادق فن ہے جو "دانش برہانی" سے زیادہ

حکمت ایمانی اور "نور ایمانی" کا محتاج ہے۔ امت میں اس فن کے ماہرین کی جو گنی چنی محدود ہستیاں گذری ہیں انکے ائمہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا نام بے تکلف لیا جا سکتا ہے۔ حکمت ولّٰہی نے شریعت کے جن غوامض کو کھولا ہے اور جیسی تشریح فرمائی ہے اس کی مثال نایاب نہیں کمیاب و شاذ ضرور ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ ولی اللّٰہی حکمت و عرفان کا شاہکار، ان کی مجددیت کا امتیاز اور اسلام کے عظیم کتب خانہ کا کوہ نور ہے۔ اپنی طرز کی پہلی اور آخری کتاب ہے شریعت کے اصول و فروع کے اسرار و حقیقت پر ایسی جامع بکیماں اور پر مغز کتاب کی نظیر شاید ہی مل سکے۔

ازالۃ الخفاء کا موضوع گو خلفائے ثلاثہ کی حمایت ہے لیکن حقیقتاً خلافتِ اسلامیہ اور اسلامی سیاست وطرزِ حکومت کی حقیقت اور اس کے رموز دقائق پر اس سے گہری کتاب فقیر کے محدود علم میں نہیں۔ کتاب میں بے شمار علمی حقائق و نکات ضمناً آگئے ہیں۔

الفوز الکبیر اصول تفسیر پر ولی اللّٰہی ذوق و بصیرت، کا عمدہ نمونہ ہے۔ خیال ہے کہ شاہ صاحب نے اس کتاب میں الاتقان (سیوطی) اور برہان (الزرکشی) سے بھی استفادہ فرمایا ہے۔

القول الجمیل تفہیماتِ الٰہیہ۔ فیوض الحرمین اور دیگر کتابوں میں بھی حکمتِ ولّٰہی کے جواہر بکھرے پڑے ہیں۔ حضرت کی تصوف پر کتابیں ہمعات سطعات وغیرہ عام اذہان کی سطح سے بلند ہیں۔ حضرت شاہ صاحب اصلاً ایک عظیم محدث قرآن کے مترجم اور صوفی ہیں۔ اس لیے اپنی کتابوں میں انھوں نے جن خاص اصطلاحات کو استعمال کیا ہے وہ سب کتاب وسنت سے مستنبط ہیں۔ شاہ صاحب کی خدمت حدیث کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اجمالاً کہا جا سکتا ہے

کہ تحریری خدماتِ حدیث کے علاوہ شجرِ طوبیٰ کا سایہ درساً اور سنداً عالم پر محیط ہے

ڈاکٹر اقبالؒ اس شعور کی ابتدا تھی۔ فضا حکیم شاعر ڈاکٹر اقبال کے نغموں سے پرشور تھی ـــــ مسلمانانِ ہندان کی شعلہ نوائیوں سے نئی زندگی پا رہے تھے اور اسلامیانِ برکوچک کے درماندہ قافلہ کے لیے ان کا پر درد کلام بانگ درا اور ان کی ہر صدا آواز رحیل[1] تھی۔ بچہ بچہ کی زبان پر ان کے اشعار رواں تھے، طبیعت نے اثر لیا۔ بانگِ درا کی متعدد نظمیں حافظہ میں مرتسم ہوگئیں اور اقبالؒ شعر و سخن کی عبقری شخصیت اور اسلامی اقدار کے داعی کی حیثیت سے دل و دماغ پر چھا گیا۔ جب ہوش و آگہی نے پر و بال نکالے تو بالِ جبریل اپنی پسندیدہ کتاب تھی، متعدد بار پڑھی، ہر بار دل و دماغ نے اثر لیا۔ متعدد غزلیں، ساقی نامہ، مسجد قرطبہ، طارق کی دعا، ذوق و شوق وغیرہ ازبر ہوگئیں۔ اسی زمانہ میں ضربِ کلیم پڑھی۔ سن کی پختگی نے اقبال کے فارسی کلام کی طرف متوجہ کیا۔ اسرار و رموز، زبورِ عجم، جاوید نامہ، پیام مشرق، ارمغانِ حجاز، مسافر اور پس چہ باید کرد، متواتر نظر سے گزرتی رہیں۔ آج بھی اقبال اپنی تازگی اور اثر انگیزی میں جوان اور دل و دماغ کی تسکین کا سامان ہے۔

اقبالؒ اول و آخر اسلامی شاعر ہے۔ وہ حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے عشق امت کے درد و فکر، مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے احساس اور تجدید ملت کے جذبہ

---

[1] تقسیم ہند سے پیشتر مسلمانوں کے تشخص اور ملی ذہن کی ساخت میں اقبال کا بڑا حصہ ہے

[2] مکتوباتِ اقبال'' اقبال نامہ'' بھی اسی وقت نظر سے گزرا جو اقبالؒ کے سمجھنے کے لیے ممد ثابت ہوا ـــــ

اس کی فکر بلند، اس کی آرزوئیں اور تمنائیں اس کی خلوت و انجمن کا گذارا اور اس کے دیدۂ تر کی بے خوابیاں دنیا میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور قرون اولیٰ کے نقشہ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔

اقبال کا کلام اسلام کی محبت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق، امت کے درد و فکر، مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے احساس اور تجدید ملت کے جذبہ کے آمیزہ سے تیار ہوا ہے۔ جسے ان کی مشرقی و مغربی علوم پر دسترس، حکمت ایمانی، دانش برہانی اور حب و شوق کی فراوانی نے جلا بخشی ہے۔ فقیر کے نزدیک اقبال کا شاعرانہ حاسۂ اسلام کے بارے میں اتنا حساس اور جذباتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ہر چبھتی چیز و کھٹک ان کا شاعرانہ تجربہ کیفیت (POETIC APPEARENCE) بن کر ان کی زبان کو گوہر بار کر دیتی ہے۔

اقبالؒ مشرق و مغرب کے علوم سے بہرہ مند ہوئے۔ حکمت مغرب کے وہ آشنا داور ماہر نقاد ہیں ؎

فریب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں — کہ اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

ان کی زندگی کا کارنامہ مسلمانوں اور خصوصاً نژادِ نو کو تہذیبؔ[1] حاضر کے مضر اثرات سے آگاہ اور اس کا تریاق اسلام میں بتانا ہے۔ انھوں نے مغرب کو ایک بصیر نگاہ سے جانچا اور پرکھا اور پھر پکار اٹھے ؎

مے از مے خانہ مغرب چشیدم — بجان من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویان فرنگی! — ازاں بے سود تر روزے ندیدم

---

[1] طلسم علم حاضر را شکستم — ربودم دانہ و دامش گستم
خدا داند کہ مانند ابراہیم — بہ نار او چہ بے پروا نشستم
(ارمغان حجاز ۲۰)

اقبال دانش مغرب کے محرم ہیں لیکن اس سے مسحور و متاثر نہیں ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

ان کا پیام اسلام کی دعوت اور پاکان امت کے افکار کا چربہ ہے ؎

شنیدم آں چہ از پاکانِ امت — ترا با شوخی رندانہ گفتم

اقبالؒ کے خیالات کی وسعت و گہرائی اسلام کے "بے حد و بے ثغور" عالمگیر و ہمہ گیر ادبی سرمایہ کا فیض ہے۔ جسے اقبالؒ کی بلند و حکیمانہ نگاہ نے عصر حاضر کیلیے اپنے رنگ میں پیش کر دیا ہے۔ یوں تو اقبال کے ماخذ بیشمار ہیں. لیکن رومی کا اثر اور چھاپ ان کے کلام پر بہت نمایاں ہے جس کا اظہار وہ بار بار کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

چوں می رومی در حرم دادم اذان من — از د آموختم اسرار جانِ من
بہ دور فتنۂ عصر کہن او — بہ دور فتنۂ عصر روانِ من

اقبالؒ کے سمجھنے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے دینی و ادبی سرمایہ کی معتدبہ واقفیت ضروری ہے۔ اس کی اپنی اصطلاحات ہیں جو اکثر اسلامی ادبی و دینی پس منظر رکھتی ہیں. جدید تعلیم جو ملی اور دینی تقاضوں کے پورا کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔ اقبالؒ سے استفادہ کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ آج اقبالؒ اپنے ملک میں نا آشنا ہے کہ "یاران محرم" سے محروم[1] ہے

(بقیہ صـ۲۰۶ سے)

من اندر مشرق و مغرب غریبم — کہ از یاران محرم بے نصیبم
غم خود را بگویم با دل خویش — چہ معصومانہ غربت را فریبم
چہ پرسی از مقامات نوایم — ندیمان کم شناسد از کجایم
کشادم رخت خود اندریں دشت — کہ اندر خلوتش تنہا سرایم

بلکہ یہ بات برملا کہی جاسکتی ہے کہ آج اقبال مظلوم و غریب ہے کہ ہر بہ خود غلط ملحدانہ نظریہ کا حامل اپنی دون فطرتی اور کم نگہی اور دین باختی کو اقبال سے منسوب کر رہا ہے۔ خصوصاً سوشلزم کے نام نہاد دعویدار اور اپنی صفوں میں شمار کروانے کی سعی نامسعود میں مشغول ہیں۔ کاش پاکستان میں اقبال کے پیام کی صحیح ترجمانی و اشاعت ہو جاتی ـــــ

اقبالیات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں اقبال کامل (مولانا عبدالسلام ندوی) روائعِ اقبال[۱] (عربی ابوالحسن علی الندوی) فیضانِ اقبال (شورش کاشمیری) خوب ہیں۔ اس مختصر سرگزشت میں اقبالؒ پر پوری گفتگو ممکن نہیں۔ چند باتیں زبان پر آگئیں جو عرض کر دیں۔

کتب فارسی | بندہ کی فارسی ابجد خوانی کی ابتدا والد مرحوم نے "کریما" سے کروائی پھر بوستان و گلستان کی بو و باش مشام روح کی عطر بیزی کا سبب بنی ـــــ کریما گلستان بوستان تو ہمارے قدیم (آہ مرحوم) دبستان اخلاق کی بہار تھی۔ فارسی شرفا کے گھرانوں سے کیا اٹھی۔ ہماری قدیم قدروں اور روایات کا خاتمہ ہو گیا۔ فارسی عربی کے بعد ہمارے قدیم ثقافتی ورثہ کی امین تھی۔ تصوف میں فارسی شاعری کی نظیر نہیں ملتی۔ حضرت ابوسعید ابوالخیر سے لے کر خاتم الشعراء جامی تک فارسی اشعار میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ دیگر زبانوں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا۔ ہمارے اپنے اقبال سے استفادہ بغیر فارسی کے ناممکن ہے۔

فارسی نظم میں مرشد رومی کی مثنوی معنوی دل و روح پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی ـــــ

---

[۱] ۔ اس کا ترجمہ نقوش اقبال کے نام سے اردو میں بھی شائع ہو گیا ہے۔

مرشد رومی حکیم پاک زاد　　　سرِ مرگ و زندگی بر ما کشاد

مثنوی کے ضخیم دفاتر صدیوں سے معارف و حقائق کے امین ہیں۔ رومی نے اپنی پرسوز لے سے حکمت ایمانیاں کا جو صور پھونکا ہے۔ وہ رہتی دنیا تک قلب و روح کو حیات نو بخشتا رہے گا۔ مثنوی دبستان تصوف کا نرا صحیفہ نہیں بلکہ حقائق دینی حکمت و فرزانگی، رموز زندگی کی نقاب کشا کتاب ہے۔ رومی و مثنوی پر فارسی و اردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بحرالعلوم کی دقیق و بسیط اور مفید شرح سے لے کر "الہام منظوم" تک رومیات پر اچھا خاصہ کام ہو چکا ہے۔ تاہم عصر حاضر کو رومی سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے[1]۔

عصر حاضر کے سب سے بڑے حکیم شاعر اقبالؒ نے خوب کہا ہے ؎

پیر رومی را رفیق راہ ساز　　　تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

زانکہ رومی مغز را داند ز پوست　　　پائے او محکم فتد در کوئے دوست

رومیات پر مثنوی معنوی کا نیور ایڈیشن جسے اعلحضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نور اللہ مرقدہٗ نے بڑے اہتمام سے شائع کرا دیا تھا۔ خاصہ کی چیز ہے۔ حسین طباعت کے ساتھ حواشی کی معنویت و خوبی "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کی مصداق ہے۔ شیخ الکل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی کلید مثنوی فن کے لحاظ سے اردو میں شاہکار ہے۔ مفتاح العلوم بھی خوب ہے۔ تلمذ حسین کی مراۃ المثنوی — مضامین مثنوی کا لاجواب آئینہ اور مصنف کی کاوش کا کامیاب ہے نشان ہے

---

[1] ۔ فقیر کی ایک تقریر "رومی کا پیام انثر حاضر" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

حدید بے مقصد تعلیم میں عربی و فارسی کے غیاب کے بعد کاش! ہم بحی طور پر اپنے اس ملی سرمائے سے مستفید ہونے کی کوشش کرتے۔

حسین صاحب کی کتاب "صاحب المثنوی"، "رومیات" میں اچھا اضافہ اور محققانہ کتاب ہے۔ شبلی کی سوانح مولانا روم کی افادیت ہنوز مسلمہ ہے۔ رومی کے علاوہ حافظ و سعدی، خسرو، عراقی وغیرہ کی غزلیات، سنائی و عطاء کا کلام حسن دہلوی و جامی وغیرہ کی نعمتیں۔ ابوسعید ابوالخیر و خیام کی رباعیات اس کورذوق کی تشنگی شوق کو مہمیز کرتی رہیں۔ شاہنامہ فردوسی، سکندرنامہ۔ نظامی۔ گلشن راز شبستری۔ عقائد خاقانی و قاآنی غرض چند پارسی کام و دہن کی شیرینی کا سامان رہی ۔

گہے شعر عراقی را بخوانم　　　گہے جامی زند آتش بجانم

آج نیا زمانہ ہے، نئے افکار ہیں، نئی اقدار ہیں۔ ہماری محفل دوشین کے چراغوں کے پروانے آج کہاں میسر آتے ہیں۔ نہ وہ دل رہے نہ وہ دماغ نہ وہ طبیعتیں رہیں نہ وہ مزاج۔ آج کسے کہا جائے۔ دل کی بہار قلب کا سوز و گداز انہیں کی نواؤں سے تھا۔ نژاد نو کو کون بتائے کہ عربی و فارسی کو کھو کر اور قرب کو اپنا کر ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا　　　کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اس ژولیدہ بیان کی ہرزہ سرائی بہت طویل ہو گئی۔ بہت کچھ کہا اور بہت کچھ کہنے سے رہ گیا "ناگفتنی"، "گفتنی" بن کر بھی ناگفتنی رہی تاہم اختتام سے پیشتر شیخین ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ اور ابن جوزی کی کتابوں سے استفادہ کا تذکرہ نہ کرنا ناسپاسی ہو گی۔ اپنی بے حاصل زندگی میں جو کچھ پڑھا لکھا یا سنا اسکا استقصاء مقصود نہیں۔ مدعا یہ تھا کہ شاید یہ تحریر کسی خوش بخت کے لیے مفید علم و محرک عمل بن جائے اور فقیر کے لیے دلالت علی الخیر کی بشارت نجات کا سبب بن سکے ورنہ یہ تباہ تو عمر بھر کی ورق گردانی کے باوجود علمی اعتبار سے۔ بجز چوپایہ بر و کتابے چند۔ اور حقیقت اسی کے رخ سے

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما　　　چہ قیامت کہ نمی رسی ز کنار ما بکنار ما

کا مصداق ہے۔

جناب ضیاء المشائخ

حضرت مولانا محمد ابراہیم جان المجددی

کابل ـــــ افغانستان

فضیلت پناه دانشمند گرامی مولوی سمیع الحق صاحب، صاحب امتیاز جریدۂ الحق
مکتوب محبت اسلوب مواصلت نمود بدراً. توضیح میکنم که سبب تاخیر جواب
آبنود که فقیر بطرف ولایت غزنه و بعض کارات مدرسه عالی نور المدارس فاروقی سفر نموده
بودم۔ در نامۂ گرامی پورزش چند نموده بودند میدانم که وجدان سلیم شما، حسن ظن که بمن دارید
این پرسش ها را از قریحۂ بقلم و از قلم بقرطاس حواله نموده اند اما حیاتۂ پر شور و بی انجام
من قیمت آں را ندارد که نظریات خویش را نسبت تعیین بعض جامع علمی و با شخصیت
ہائے برجستہ عرفانی توضیح دہم و یا از نقطہ نگاه حیات اجتماعی عالم اسلام از حیث
تاثیر سلسلہ زور ناستی که اذہان و انہام را تربیہ و تنبیہ می نماید اظہار نظریہ نمایم چوں
سوال فرموده اند بجواب می پردازم۔

اوّل : در حیات خوشگوار و با سعادت که در دوحۂ عالم علم سپری نموده و می نمایم و در حیاتِ برزخ نیز از آن بعون اللہ تعالیٰ بر آں حسنِ خاتمہ استفادہ خواہم نمود، طمانیت قلبی و تقویۂ وجدان مرا کہ باری آورد ہمانا در تفسیر قرآن عظیم الشان ابن کثیر و معالم التنزیل است و در سلسلۂ حدیث علاقہ من با بخاری و مسلم و مستدرک حاکم نیشاپوری بودہ و در فقہ ہدایہ و فتح القدیر کہ در سلسلۂ فقہ یا حقوقِ اسلامی بداں من زیادہ تر دل پسند بودہ و در معانی مطول را با تلخیص پسند دارم در تشریع اسلامی توضیح و از مؤلفات جدید تاریخ تشریح اسلامی را کہ سہ نفر مؤلف صاحب قدر مصری جمع نمودہ اند مرا محظوظ می نماید در تصوّف کہ دارائی دو مکتب است۔ اوّل وجودی عشق و علاقہ با "فصوص الحکم" ابن عربی و مثنوی مولانا بلخی رومی دارم در مکتب شہودی تلمیذ مکتوبات امام ھمام مجدد الف ثانی رح می باشم و بدان افتخار می نمایم۔ در تاریخ علامہ ابن خلدون را بسیار دوست داشتہ و الحق کہ درین فنِ استاد کامل می باشد، و در ادب عربی ابن مقفع و امام بصیری رح را در متقدمین امتیاز می دہم و در طبقہ حالیہ مرحوم شوقی بیگ مصری را ستائش می کنم و در ادب فارسی با سعدی و نظامی و جامی ہروی و واقف لاہوری و عُرفی را می پسندم و تخصیص خاص بمقام ادبی مولانا عبد القادر بیدل قائلم در کلام و فلسفہ حجۃ الاسلام غزالی و علامہ ابن رشد فلسفی را با کمال احترام می ستائم البتہ علم بردار ثقافتِ اسلامی در فلسفہ و کلام بودہ اند ہر کدام از ایں شہسوارانِ میدان با صفائی علم و دانش شانِ خاص داشتہ و در فنون مختصہ خود ہا توانستند کہ از موضوع علم و تعریف علم و تبصرہ ہائے بارعہ در آں علوم و اجتہادیات جامعہ و در آں فنون با تواں کامل و تدبّر علمی کہ شامل تمام نکات رسیدہ علمی بودہ معرفت را دارا بودند و از منطق رسائی دانائی کار گرفتہ اند رحمتِ خاص خداوند جل شانہٗ، برادان ایں برگزیدہ گان معارف اسلامی باد خصوصیات ایں ذوات عالی مرتبت آنست کہ فن را چناں شرح و لبسط دادہ اند کہ تمام طبقاتِ علمی امروزہ بمقام علمی شان

معترف بوده به آواز بلند می گویند هر فن راکه تخصیص داده اند کما هو آن را کمیتاً و کیفیتاً در رشته تصنیف و تالیف آورده اند و از اصل موضوع خارج نه شده تحقیقات بلند و تدقیقات ارجمند شان در همان موضوع که فرموده اند تماماً متکی بر قوایم علمی بوده جزاء الله عنا وعن سائر اهل العلم خیر الجزاء۔

دوم: در حصه جرائد و مجلات که طبعاً دران از چندین جنبه ئی اجتماعی بحث میشود مثل سیاست و اقتصاد و اخلاق و تحریک مسائل که احساسات یک ملت را بظهور می آورد ان را اگر روح حیات بگویم بعید نیست و در دنیا امروزه اسلامی بیشتر دلچسپی من بجریده المسلمون از قاهره نشر می شود بوده و سپس روزنامه الندوه عربیه را قابل قدر می دانم واز مجله ها دار العلوم دیوبند و مجله پیام حق که از کابل نشر می شود آن را مفید می دانم و مجله الحق را که در لسان ادبی اردو خدمت در شقوق حیات اجتماعی اسلامی و سیاسی اسلامی می نماید می ستایم منکه تخصیص برائے این روزنامه ها یا مجلات قائل شده ام هدف من تنها و تنها نیست که نشرات آنها در جنبه هائے سیاسی و اجتماعی و اقتصادی و در حیات از کلتور و ادیالوجی اسلام مستقلاً پیروی نموده دولت خانگی خود را به نسل و جبیل آئنده اسلامی معرفی می نمایند، زیرا امروز فرض تحسین است تا ابنائے مسلمان از استقلال علمی و سیاسی و اقتصادی به اساس یک منطق قوی واقف شوند کلتور اسلام در تمام شقوق حیاته بنی نوع انسانی مستقل بوده دگاهی از مکتب هائے امپیرلزم دیا تریالزم پیروی نموده حقوق سیاسی، حقوق اقتصادی، حقوق ملی، حقوق جغرافیائی همه را بطور خاص و منطق قوی و استقلال علمی بیان می نماید که بر هر انسان دانا و صاحب ضمیر روشن معلوم و هویدا است۔

سوم: مسئله که مربوط به حیات شخص من است، نسبت به حوصله هائے علمی است، البته من علاقه زیاد بدار العلوم عربیه کابل و بدرسگاه خانقاه عالیه مجددی دارم۔

عمر بہرہ ور و حظہائے نیک ظاہراً و باطناً حاصل نمودہ ام اگر بر تن من زبان شود
ہر موئے یک شکر دی از ہر زر تو آنم کرد، خاصتاً ذرہ نوازئ و تربیہ ظاہری و باطنی کہ از
حضورِ مقدس حضرت شیخ الاسلام مولانا و مرشدنا نور المشائخ قدس سرہٗ کہ پیشوائے
ظاہری و باطنی من است، بدست آوردہ ام زبان قاصرمن و قلب کاسرمن نمی تواند
شکریہ آں احسان را ادا نماید بلے می توانم کہ بگویم بحدا رہنمائی من است و در طریقِ
علم و معرفت استاد و پیشوائے برگزیدہ من بلے کہ من اُو را مریدم او بمعنی ہست پیر من۔
دیگر استاد بزرگوارم شیخ الحدیث والتفسیر مولانا یار محمد صاحب وردکی رحمۃ اللہ علیہ
کہ صدر دار العلوم عربیہ کابل بودند و در حصہ تفسیر موضح الفرقان بزبانِ پشتو حصہ بزرگ
داشتند گاہے مقام علمی شان را فراموش نمی توانم بہترین مقاماتِ آخرت را برائے
آں استاد بزرگوار طالبم۔

چہارم :۔ بہ عقیدہ من امروز بہترین نظریہ برائے ارتقائے ملتِ اسلامی
آنست کہ ملتِ اسلام خاصتاً طبقہ جوان باید سرمایۂ کامل از ثقافت و کلتور اسلامی بدست
آرند و از انکشافات علمی حدیثہ از طریق تکنالوژی عصری باید کاملاً واقف باشند البتہ
وظیفہ مہم علماء و رہنمایان اسلامی امروز آنست تا اساسات علمی و ثقافتی اسلامی بر
اساس منطق علمی امروزہ تدوین نمودہ برایں تعلیم ابتلائے امروزہ اسلامی بہترین ارمغان
اسلامی را تقدیم کنند۔ و باید ایں تدوین در تمام شقوق علمی اسلامی متکی بر اصولاتِ قولی
معنوی معقول و منقول بودہ در عین حال مراعات حسنِ انشاء و طرز تفہم موضوع علمی بر
اساس کیفیات علمی باشد کہ زیادہ تر بر بدیہیات و مشاہدات متکی بودہ و دارد لائل
باشد کہ آں دلائل را افکار منور و عقول سالم عقلاً و علماً قبول نمایند و نیز در مسائل کہ
قرآن عظیم شان در حصہ تکوین و کیفیات، کائنات سفلی و علوی ارشاد می نماید از امعان نظر
صائب کار گرفتہ صورتِ تدوین آں را در یک فارمول جامع علمی ترتیب نمودہ بعالم

علم ودانش عرصہ نمایند البتہ بعقیدہ من بدواً درایں مرحلہ یک یتنگ بزرگ علمائے موجودہ اسلامی ضرورت است دریں مورد کہ امروز احتیاج بزرگ بداں عالم اسلام وارد حرکت متبدت علمی بوجود آید من یقین دارم اگر ایں سلسلہ از یک توافق سالم وصداقت کامل انجام شور مشکلات امروزی عالم اسلام کہ از حیث بعض اسرار غامضہ علمی بوجود آمدہ وور دنیا کنونی ملتِ اسلام بحیث یک ملت ذی علم ومعرفت کہ سزاوار مقام مسلمین است اثبات وجود خواہند نمود۔

ایں بود نظریہ من کہ بجناب شما مختصراً توضیح نمودم۔ ع

گر بگویم شرح ایں بیحد شود (فقیر محمد ابراہیم المجددی ابن عمرؒ)

ترجمہ

محبت نامہ نے نقشۂ وصال سامنے کیا۔ سب سے پہلے تاخیر جواب کا سبب واضح کر دینا مناسب ہے۔ فقیر مدرسۂ عالیہ نور المدارس فاروقی (واقع شہر غزنی) کے بعض اہم کاموں کے لیے غزنی گیا تھا۔ آپ نے مکتوبِ گرامی میں اپنے وجدانِ سلیم کے پیشِ نظر مجھ پر حسنِ ظن فرماتے ہوئے چند سوالات بوساطتِ قلم زیبِ قرطاس فرمائے ہیں۔

میری پرشور اور بے انجام زندگی اس قابل نہیں کہ اپنے نظریات کو بعض علمی زاویوں یا ممتاز شخصیتوں میں متعارف کرانے کی جسارت کروں یا عالمِ اسلام کی اجتماعی زندگی کے گہرے تاثرات کے نقطۂ نگاہ سے جو لوگوں کے اذہان وافہام کی تربیت کرتی ہیں، اپنے نظریہ کی نشاندہی کرسکوں تاہم حسبِ تعمیلِ حکم سوالات کے جوابات تحریر کر رہا ہوں۔

(۱) اوّلاً یہ کہ خوشگوار اور باسعادت زندگی نے جو گستاں عالم میں اب بڑھاپے کی حالت تک پہنچا دیا ہے اور جسے بفضلِ ایزدی حسنِ خاتمہ اور برزخی زندگی کو سنوارنے کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔

فنِ تفسیر میں ابن کثیر اور معالم التنزیل نے اطمینانِ قلب اور تقویتِ وجدان کے ثمرات بخشے اور علم حدیث میں بخاری شریف اور مسلم شریف۔ امام حاکم نیشاپوریؒ کی مستدرک سے پوری وابستگی اور تعلق ہے۔ اور علم فقہ میں ہدایہ، فتح القدیر، فقاہت اور اسلامی حقوق کے اعتبار سے سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں اور علم معانی میں مطوّل کو تلخیص کے ساتھ پسند کرتا ہوں اور اصولِ فقہ میں جو تشریع اسلامی کا فن ہے اس میں توضیح، تلویح اور جدید تالیفات میں "تاریخ تشریع اسلامی نے مجھے محظوظ کیا ہے، جسے مصر کے تین مصنفوں نے مل کر تصنیف کیا ہے۔ اور علم تصوّف جس میں دو مکتب ہیں، اوّل مکتبِ وجودی عشق" میں ابن العربیؒ کے فصوص الحکم اور مولانائے رومؒ کی مثنوی سے علاقہ رکھتا ہوں۔ اور دوسرا مکتب "شہودی" میں امام ربانی حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے مکتوباتِ گرامیہ کا شاگرد ہوں اور ان سے شرفِ تلمذ پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ اور فنِ تاریخ میں علامہ ابنِ خلدونؒ کی تاریخ سے بہت ہی زیادہ محبت ہے، اور حق بات یہی ہے کہ یہ کتاب فنِ تاریخ میں استاذِ کامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور عربی ادب میں متقدمین میں سے ابن مقفعؒ اور امام بوصیریؒ کو تمغۂ امتیاز دیتا ہوں اور دورِ حاضر میں مرحوم شوقی بیگ مصری کا ثناخواں ہوں، اور ادبِ فارسی میں سعدیؒ، نظامیؒ، جامیؒ، ہرویؒ، واقف لاہوری اور عرفی کو ترجیح دیتا ہوں۔ اور ادبی مقام میں خصوصی طور پر مولانا عبدالقادر بیدل کا معترف ہوں۔ اور علمِ کلام و فلسفہ میں حجۃ الاسلام امام غزالیؒ اور علامہ ابن رشد فلسفی کو پورے احترام کے ساتھ حق مدح سرائی اور خراجِ تحسین ادا کرتا ہوں۔

یقیناً یہ حضرات اسلامی ثقافت کے فلسفہ و کلام کے علمبردار تھے، اور درحقیقت یہ تمام اکابر علمی میدان کے شہسواروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے علم و دانش کی روشنی میں اور اپنے خصوصی علوم و فنون جو اُن کو ورثہ میں نصیب ہوئے تھے۔

(جس میں پوری دسترس اور کامل عبور رکھتے تھے) کو بیان موضوع اور تعریف اور بلند پایہ تبصروں اور مکمل و جامع اجتہادات سے آراستہ کیا ہے اور اپنے ان فنون میں پوری توانائی اور علمی تدبر و فراست (جو جملہ نکات پر حاوی ہے) کے اعتبار سے "دارا" تھے۔

خداوند قدوس جل شانہ، معارف اسلامی کی ان چیدہ شخصیتوں کی ارواح طیبہ پر اپنی خصوصی رحمتوں کو نازل فرمائے۔ ان بلند پایہ حضرات کی خصوصیت تھی کہ انہوں نے ہر فن کی ایسی تشریح کی ہے کہ تمام علمی طبقے ان کے علمی مقام و منزلت کے معترف بآواز بلند یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان نیک سیرت ہستیوں نے ہر اس فن کو (جس سے ان کو خصوصی لگاؤ تھا) کماحقہ، پورے کم و کیف کے ساتھ تصنیف و تالیف کی لڑی میں پرو کر اصل موضوع سے کبھی اِدھر اُدھر نہ ہوئے اور موضوع سے وابستہ جو بلند پایہ تحقیقات و ترقیات کو بیان کیا ہے وہ علمی براہین اور بنیادوں پر مستحکم ہے۔ جزاہ اللہ عنا وعن سائر اھل العلم خیر الجزاء۔

(۲) رسائل و مجلات کے سلسلہ میں وہ جریدے اور رسالے پسند ہیں جن میں سیاست، اقتصادیات، اخلاق اور ایسے مسائل کی تحریک جو وحدت ملی کے احساسات کو فروغ دیں۔ اگر ان کو "روحیات" سے پکاروں تو یہ لقب بے جا نہ ہوگا اور موجودہ اسلامی دور میں زیادہ تر دلچسپی "المسلمون" نامی رسالہ سے ہے جو قاہرہ سے شائع ہوتا ہے، بعد ازاں عربی روزنامہ "الندوہ" کو قابل قدر سمجھتا ہوں اور ماہنامہ "دارالعلوم" جو دیوبند سے شائع ہوتا ہے، نیز "پیام حق" جو کابل سے شائع ہوتا ہے، اور ماہنامہ الحق کی ستائش کر رہا ہوں جو اردو کی ادبی زبان میں ملت کی اجتماعی، سیاسی شعبہ ہائے زندگی میں اسلامی اقدار کی خدمت کر رہا ہے۔

میں ان رسائل و جرائد کی تعریف محض اس لیے کرتا ہوں کہ میرا مطمح نظر صرف

یہی ہے کہ ہر قسم کے مجلات کی نشر واشاعت سے سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور کلچر کی روح ونظریات وافکار میں اسلامی روح پیدا ہو، فرزندانِ ملّتِ اسلامیہ کو اسلامی روایات واقدار سے متعارف کرے کیونکہ موجودہ دور میں سب سے اہم اوّلین فریضہ یہی ہے کہ مسلمان پود علمی، سیاسی، اقتصادی مسائل سے قوی دلائل کی بنیاد پر مسلح ہو کر اسلامی کلچرل کو افرادِ انسانی کی زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کریں اور سکولوں اور کالجوں میں امپیریلزم اور ماتریالزم (مادہ پرستی) کے پیروکار نہ بنیں۔ سیاسی، اقتصادی ملی اور جغرافیائی حقوق کو ایک خصوصی نہج، موثر بیان اور علمی سنجیدگی سے واشگاف کریں جسے ہر ایک دانشمند اور روشن ضمیر انسان سمجھتا ہے۔

(۳) تیسرا مسئلہ جو میری علمی زندگی سے وابستہ ہے۔ علمی چشموں سے سیرابی کی نسبت یہ ہے کہ میرا سب سے زیادہ تعلق دارالعلوم عربیہ کابل اور خانقاہ عالیہ مجددیہ عمریہ کی درسگاہ سے ہے، میرا علمی سرمایہ علم ومعرفت کے ان دو مرکزوں سے مستفاد ہے۔ باطنی حالات اور ذوقی کیفیات بھی عرفان کے اس مقدس مرکز خانقاہ مجددی سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اگر میرے جسم کے تمام بال زبان بن جائیں تو ان مراکز کے لامتناہی عنایات واحسانات کا حقِ سپاس وتشکر ادا نہیں کر سکتے، خاص کر باطنی وظاہری اصلاح وتربیت جو حضور مقدس حضرت شیخ الاسلام مولانا ومرشدنا نور المشائخ قدس سرہٗ (جو علومِ ظاہری وباطنی میں میرے آقا اور پیشوا ہیں) کی بدولت مجھے حاصل ہے۔

میرا قلب ودماغ اور زبان یکسر اس قابل نہیں کہ ان کی بے پایاں نوازشات کا سپاس ادا کر سکوں۔ ہاں! ما لا یدرک کلّہٗ لا یترک کلّہٗ کے مطابق مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ وہ علم ومعرفت میں میرے استاد اور پیشوا ہیں، میں اُن کا مرید اور وہ میرے مرشد وآقا ہیں۔ میرے دوسرے استاد بزرگوار شیخ الحدیث والتفسیر

مولانا یار محمد صاحب وردکی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو دارالعلوم عربیہ کابل کے صدر مدرس تھے، اور تفسیر موضح الفرقان (جو پشتو زبان میں لکھی گئی ہے) میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میں اُن کے علمی مقام کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو آخرت کے بہترین مدارج اور بلند مقامات پر فائز فرمادے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ میرے عقیدہ میں آج ملتِ اسلامیہ کی ترقی و بقا کے لیے بہترین نظریہ یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کو اسلامی کلچرل اور ثقافت کے مکمل سرمایہ سے بہرہ ور کر دیا جائے اور جدید علمی انکشافات، موجودہ دور کی ٹیکنالوجی سے کامل طور پر شناسائی حاصل کرائی جائے۔

البتہ آج علماء کرام اور راہنمایانِ اسلام کا اہم وظیفہ یہ ہے کہ ثقافتِ اسلامی کو موجودہ فلسفہ کی بنیاد پر مدوّن کر کے عصرِ حاضر کے نوجوانوں کو ارمغانِ اسلامی پیش کریں۔ اور اس امر کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ اس نئے تدوین میں علومِ اسلامیہ کے جملہ شقوق، ٹھوس اصول اور عقلی نقلی دلائل پر مبنی ہوں جنہیں روشن فکر، سلیم الطبع حضرات قبول کریں، اور ان جدید کتب کی عبارات میں روانی، شُستگی ہو، لہجہ عام فہم ہو، بدیہیات اور مشاہدات پر مبنی ہوں، اور ان میں ایسے دلائل سے مسائل کو ثابت کیا گیا ہو جن دلائل کو عقلِ سلیم رکھنے والے حضرات از روئے عقل و دانش قبول کریں، نیز اُن مسائل کو بھی ایک جامع فارمولے کے تحت جمع کریں جن کو قرآنِ مجید اور روایات میں تکوینی اور عالم سفلی، علوی کی کیفیات کو صراحۃً یا اشارۃً بیان کر دیا گیا ہے۔

البتہ میرے عقیدہ اور نظریہ میں یہ بات سب سے پہلے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں اکابر علماء اسلام کا ایک اجتماع منعقد ہو جائے جس کی علمی حرکت اور نشاط پیدا کرانے کے لحاظ سے بے حد ضرورت ہے۔ اگر پورے خلوص اور

صداقت سے یہ کام شروع ہو سکے تو عالمِ اسلام کو علمی وفکری پیش آمدہ جدید مسائل ومشکلات کا جواب دیا جا سکے گا، اور ملتِ اسلامیہ کو وہ علمی اور عرفانی مقام مل سکتا ہے جو اس کے شایانِ شان ہے۔

یہ میرے خیالات تھے جو مختصراً جناب کی خدمت میں عرض کیے گئے ؏

گر بگویم شرح ایں بے حد شود

حضرت العلامہ مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی مدظلہ

دینی علوم کی تعلیم اور تعلم کا یہ امتیازی شرف ہے کہ اس میں معلم متعلم، صاحب کتاب بلکہ موجدِ فن سے رابطہ اور نسبت قائم رکھی جاتی ہے۔ علومِ دینیہ کی سند اس کا ایک اہم حصہ ہے، سند میں اس امر کی وضاحت کی جاتی ہے کہ شاگرد اپنے اساتذہ کو دعاؤں میں یاد رکھے اور ان سے حاصل کردہ علوم وفنون کی اشاعت میں سرگرمِ عمل رہے۔ انفرادی طور پر بھی بعض اساتذہ اپنے باوفا تلامذہ کو یہ نصیحت کرتے ہیں اور اس پر عمل نہ کرنے والوں سے اظہارِ ناراضگی کرتے ہیں، بلکہ یہاں تک فرمادیتے ہیں:۔ یقبح بکم ان تستفیدوا منا ثم تذکرونا ولا تترحموا علینا۔

حضرت اسحٰق بن راہویہ محدثِ کبیر سے ان کے بیٹے محمد رحمہم اللہ نے

بیان فرمایا ہے کہ:۔

"ایسی رات کم ہی گذرتی ہے کہ جس میں (نمازِ تہجد) میں اپنے اساتذہ اور تلامذہ کے لیے دعا نہ کروں" (برنامج اشبیلی ص۵)

چنانچہ دیارِ عرب کے اکثر علماء نے صرف اسی عنوان پر کئی کتابیں تحریر فرمائی ہیں جن میں اپنے اساتذۂ کرام کے حالات اجمالاً، تفصیلاً ذکر فرمائے ہیں اور اس عنوان کو برنامج کا نام دیا ہے، جیسا کہ:۔

برنامج احمد بن عبدالمومن القیسی الشریشی، برنامج احمد بن محمد ابی غرنہ، برنامج احمد بن محمد بن مفرج النباتی، برنامج روایات الشلوبین، برنامج روایات الطلاعی، برنامج شیوخ داؤد بن سلیمان بن حوط اللہ، برنامج شیوخ عبداللہ بن سلیمان بن حوط اللہ، برنامج عبدالرحمٰن بن احمد بن عبدالرحمٰن بن ربیع، برنامج ابی عبداللہ الخولانی، برنامج ابی عبداللہ بن شریح، برنامج عتیق بن علی الاموی، برنامج علی بن احمد الزہری، برنامج علی بن عبداللہ الیحقبی، برنامج علی بن عبدالملک القطان، برنامج محمد بن عبدالحق بن سلیمان، برنامج بن عبداللہ الازدی، برنامج محمد بن الغزال الشریشی، برنامج یحییٰ بن عبدالرحمٰن ابن ربیع، برنامج شیوخ الرعینی م ۶۶۶ھ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ یہ اس عنوان کی آخری کتاب ہے جو ۱۳۸۱ھ میں دمشق سے شائع ہوئی۔

برصغیر میں اس موضوع پر بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ انفرادی طور پر بعض علماء کرام نے اپنے مشائخ اور اساتذہ کے حالات جمع کیے ہیں، بعض نے "میری محسن کتابیں" کے عنوان سے بھی ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جو اُن کی نظر میں اثر انگیز تھیں مگر جامع طور پر تا حال ایسی کوئی کتاب پیشِ نظر نہیں۔ علماء کرام نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ علماء اسلام نے ریاکاری اور خود نمائی سے دُور رہتے ہوئے اس تاریخی اور مفید کام کو بھی نظر انداز فرمایا۔ درسِ نظامی کی بعض کتابوں میں تو خطبہ تک کا

ذکر نہیں، الکلمۃ لفظ وضع لمعنی مفرد سے شروع کر دی گئیں، اور یہ اسی اخلاص کا اثر ہے کہ ایسی کتب بعض زیادہ مقبول اور ضروری سمجھی گئی ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کسی عالم نے اپنے کچھ حالات قلمبند بھی کیے ہیں تو وہ زاویہ خمول میں رہے نہ کسی نے تلاش کیے نہ ملے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اشاعتی اداروں نے اس موضوع اور عنوان کو اقتصادی اور مالی لحاظ سے نفع بخش نہ سمجھا۔

مقام شکر ہے کہ برصغیر بلکہ ایشیا کی مشہور علمی و دینی درسگاہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے باہمت علماء کرام نے ادھر توجہ کی اور اس عنوان پر علماء کرام کی خدمت میں ایک سوالنامہ بھیجکر ان کے حالات جمع کیے۔ اس ضمن میں محض حسن ظن بلکہ ذرہ نوازی کے طور پر اس ہیچمدان کو اس سوالنامہ کے جوابات تحریر کرنے کا باصرار حکم فرمایا، حالانکہ کیا پدی کیا پدی کا شوربا، اس گنہگار پر پورا منطبق ہے امتثالاً چند حروف اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ اس سے اپنے کرم فرماؤں کا ذکر زبان اور قلم سے جدا ہو جائے گا۔ جن سے وہی فیض و برکت حاصل ہونے کی توقع ہے۔ جو مادح نعمان رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوئی اور یوں پکار اٹھا ؎

اَعِدْ ذِکْرَ نُعْمَانٍ لَنَا اِنَّ ذِکْرَہٗ
هُوَ الْمِسْكُ اِذَا مَا کَرَّرْتَهٗ يَتَضَوَّعُ

اس عنوان پر نمبروار لکھنے سے پہلے یہ عرض ضروری ہے کہ اساتذہ کرام سب کے سب واجب الاحترام ہوتے ہیں، جیسا کہ فقہاء کرام نے یہاں تک فرما دیا ہے

لہ رتبۃ الاستاذ فوق رتبہ الوالد۔ (درر غرر ج ۲ ص ۴۵۳)

البتہ بطور کلی مشکک ان میں سے تفاوت کا پایا جانا امر طبعی ہے، اس لیے یہ گنہگار بعض اساتذہ کرام کا تذکرہ اسی نسبت سے کرے گا۔

(جوابات) سوال ۱، ۲ کا جواب

اس گنہگار کو متاثر کرنے والی کتابوں میں سب سے پہلی کتاب اللہ عزاسمہ ہے اور دوسری کتاب صحیح بخاری اور اس کی شرح قسطلانی۔

اہلِ علم حضرات کی مرتبہ کتابوں میں سے قاضی محمد سلمان منصورپوری کی مؤلفہ "رحمۃ للعالمین"۔ ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآباد (حال فرانس) کی مرتبہ "عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ"

چونکہ اس گنہگار کا سرمایہ دارین صرف اور صرف محبتِ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہے اس لیے مندرجہ بالا کتب اور اسی عنوان سے دوسری کتب بھی محبوب ہیں۔

(۳) مندرجہ ذیل مجلات و جرائد سے علمی، عملی، دینی اور روحانی فوائد حاصل ہوئے۔ معارف (اعظم گڑھ) برہان (دہلی) صدق اور صدقِ جدید (لکھنؤ) خدام الدین (لاہور) جدید مجلات میں سے الحق (اکوڑہ خٹک) البلاغ (کراچی) اور الخیر (ملتان) مفید پائے ہیں۔

(۴) میری تعلیمی اسفار کی زندگی کے دو دور ہیں۔

پہلا دور: اپنے وطن علاقہ چھچھ میں سب سے زیادہ دعائیں اور توجہات مولانا سعدالدین جلالوی (جو کہ مولانا عبدالحی لکھنوی کے شاگرد تھے) سے حاصل ہوئیں۔

دوسرا دور: تین مدارس پر مشتمل ہے:۔

(۱) مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور۔ ان اساتذہ کرام میں مولانا جمیل احمد تھانوی حال مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور سے متاثر ہوا مولانا اسعداللہ صاحب اگرچہ میرے باضابطہ استاذ نہ تھے مگر ان کی سیرت اور شفقت سے بہت متاثر ہوا۔ مولانا عبدالرحمٰن اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نوراللہ مرقدہما کی شخصیت نے بھی اس گنہگار کو متاثر رکھا، اگرچہ یہ حضرات بھی میرے اساتذہ میں سے نہ تھے۔

(۲) جامعہ اسلامیہ ڈابھیل: اساتذہ کرام میں سے مولانا سراج احمد رشیدی اور مولانا بدرِ عالم نوراللہ قبورہما سے کافی تاثر لیا۔ محدثِ کبیر حضرت علامہ انور شاہ صاحب

کی زیارت اور کبھی کبھی درسِ بخاری شریف میں شرکت نے بھی انمٹ نقوش اس گنہگار کے قلبِ مضطر پر چھوڑے۔

(۳) دارالعلوم دیوبند میں مولانا محمد ابراہیم، مولانا محمد اعزاز علی صاحب نوراللہ قبوہما کی علمی جلالت بلکہ عظمت نے کافی متاثر کیا۔

اسی دارالعلوم اور مرکزِ فیوض میں شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ سے جو متاثر ہوا وہ تحریر اور تقریر میں نہیں آسکتا۔ ان کی زیارت، ان کی گفتار، ان کا کردار بلکہ ان کی رفتار سے بھی یہ گنہگار اس قدر متاثر ہے کہ آج تک ع

سوزِ بلبل کم نہ گردد گر رود گل از چمن

یہ سب ان کی ذرہ نوازی کا اثر تھا اور اب بھی ہے۔ کمزوروں، کم عقلوں بلکہ کام چوروں پر اُن کی نظرِ کیمیا اثر کو فریدی نے یوں بیان کیا ہے ؎

تیرا دل معبدِ وفا کا تجھ میں شانِ حیدری
رقص کرتی ہے تیری آنکھوں میں آنِ دلبری

سوال ۵، ۶، ۷ کا جواب:۔

پورے قرآنِ عزیز کا ترجمہ کسی محقق باعمل عالم سے پڑھا جائے۔

حجۃ اللہ البالغہ، مکتوبات مجدد الف ثانیؒ، مکتوبات شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، خطباتِ مدارس سید سلیمان ندویؒ، تالیفات مولانا شمس الحق افغانیؒ، تقاریر مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

(۸) مدارسِ عربیہ کے نصاب میں ہرگز تبدیلی نہ کی جائے۔ اسی نصاب سے تو اکابر علماءِ حق شیخ الہند، حضرت مدنی، حضرت تھانوی، انورشاہ کاشمیری، شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالحق، مولانا شمس الحق (رحمہم اللہ) اور دوسرے تمام اکابر چمکے اور راہ نما

بنے۔موجودہ نصاب کے مرتب وہ لوگ تھے جو نہ صرف علماء تھے بلکہ اپنے اپنے دور کے اہل اللہ میں سے تھے۔البتہ اس نصاب کے ساتھ طلباء کو یہ تلقین کی جائے کہ :۔

(الف) علوم دینیہ اصحاب صُفہ کی وراثت ہے جس کے سرکردہ راہنما حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے ،

(ب) دینی علوم محض رضا الٰہی کے لیے حاصل کیے جائیں ورنہ لم یجد رائحة الجنة کی تنبیہ بھی سنائی جائے۔

(ج) تزکیۂ باطن کے لیے ذکر واذکار، تسبیح وتہلیل کا مختصر سا جامع نصاب شامل کردیا جائے۔اور آخری بات یہ سمجھادی جائے کہ ؎

علم را بر جان زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

واللہ الموفق

مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی

نجم المدارس کلاچی

محترم مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب! آپ کے بکرّات و مرّات اصرار کے باوجود عرصہ دراز کے بعد تعمیل کی توفیق مل رہی ہے۔

آپ نے پوچھا ہے کہ مَیں دورانِ تعلیم و مطالعہ کن کن اساتذہ سے زیادہ متاثر ہُوا ہوں؟ مختصر جواب یہی ہے کہ الحمد للہ ثم الحمد للہ ع

ایں خانہ تمام آفتاب است

احتمال یہ بھی ہے کہ یہ میری انفعالی کمزوری اور احساسِ کہتری کی علامت ہو کہ ؎

لختے بر داز دل گذرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم

لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ ربّ کریم کا احسانِ عظیم ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیاروں ہی کی گود میں رکھا ہے۔ وذٰلک فضل اللہ علینا وعلی کثیر من الناس

ولکن اکثر الناس لا یشکرون۔

خدا کا فضل و کرم ہے کہ اُس مہربان ذات نے غلط اساتذہ اور تعلیم سے محفوظ رکھا ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود
لطف اُو ناگفتہ ما می شنود

فلہ الحمد والشکر

سالہا سال تک اپنے اساتذہ اور مشائخ کو دیکھا، حال کی طرح ان کے ماضی کو معلوم کیا اور اب پچاس سال سے ان کا مستقبل بھی پیشِ نظر ہے، کبھی بھی الحمد للہ افسوس نہیں ہوا کہ ہم کہاں جا گرے، ان کے اغیار کو بھی دیکھا ان کے ناقدین کو بھی پرکھا، مگر ہزار شکر کہ کہا تو یہی کہا کہ ؎

گلستان میں جاکر ہر اک گل کو دیکھا
نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بُو تھی

اور جو اسلافِ اُمت کے علوم و معارف اور اعمال و احوال کو پڑھا تو پھر یہی کہا کہ ؎

گلستاں میں جاکر ہر اک کو دیکھا
تیری ہی سی رنگت تیری ہی سی بُو تھی

نقشِ اوّل میرے سب سے پہلے اساتذہ میرے والد ماجد (قبلہ حضرت مولانا قاضی محمد نجم الدین صاحب ابن قاضی عبدالغفار ابن ملا محمد مسکین ابن قاضی احمد ابن ملا اصل الدین غفرلی ولہم اجمعین) اور والدہ ماجدہ اور جدہ مکرمہ اُمّ الاب ہیں۔ قرآن مجید ناظرہ والدین سے پڑھا، حفظ شہر کے ایک صالح بزرگ جناب حافظ جمال الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کیا۔ اور فارسی سے لیکر کافیہ تک

کی کتابیں والد ماجد سے پڑھیں۔

والدین رحمہم اللہ تعالیٰ کے زہد و ورع کا اظہار اور عمل زندگی میں اُنکے صبر و قناعت اور اس کے ثمرۂ عاجلہ فہم دین کا اشتہار ان کی ارواحِ طیبہ کے لیے باعثِ اذیت سمجھتا ہوں یہ الغافلاتُ المؤمناتُ پوری زندگی میں قرن فی بیوتکنّ کی تصویر رہیں اور قانتاتٌ تائباتٌ عابداتٌ کی ایک گونہ تفسیر، والد ماجد اور ان دونوں کا وصف مشترک یہ تھا کہ زندگی کے آخری لحہ تک جہاں تک مجھے معلوم ہے حج تو خیر کبھی، زکوٰۃ بھی شاید فرض نہیں ہوئی، عمر بھر نانِ جویں پر گذاری اور کبھی بھی حرفِ شکایت ان سے سننے میں نہیں آیا' فقر و عسرت پر نہ صرف صابر بلکہ شاکر بھی رہے ــــــ خمول ان حضرات پر غالب تھا۔

والد ماجدؒ کے حالات لکھنے کا بارہا نہ صرف قصد کیا بلکہ بعض علماء نے اس کا بہ اصرار تقاضا بھی کیا، لکھنے بیٹھا اور کئی بار لکھنا شروع کیا مگر قلم رُکتا ہی رہا تا آنکہ ارادہ ہی ترک کر دیا ــــ مطالعاتی زندگی پر لکھنے کا کئی سال پہلے سے حکم ہوا تھا کہ آپ کے بار بار کے اصرار سے جب بھی ارادہ کیا تو کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آتی رہی، اب بھی نہ معلوم تکمیل ہو یا نہ ہو۔

والدہ ماجدہ رحمہا اللہ تعالیٰ کی قبر پر ایک دن ایک حافظ صاحب کے ساتھ گیا اُن سے کہا کچھ پڑھو' وہ پڑھنے لگے تو معاً طبیعت پر بوجھ پڑا کہ شاید والدہ ناراض ہوں کہ نامحرم سے سنوا رہا ہے خود کیوں نہیں پڑھتا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ایک تیسرے حافظ صاحب جو رشتہ دار بھی تھے بلکہ والدہ صاحبہ کے بھتیجے اور صالح انسان تھے وہ زیارت سے فراغت کے بعد تخلیہ میں مجھ سے کہنے لگے آپ نے خود نہیں پڑھا نامحرم سے کیوں سنوایا، میں نے کہا بات کیا ہے؟ وہ کہنے لگے کہ جب اس نامحرم نے پڑھنا شروع کیا تو مجھے بین النوم والیقظہ کی حالت میں یوں محسوس ہوا کہ گویا عمہ مرحومہ نے کروٹ بدل کر رُخ دوسری جانب کو کر لیا گویا ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کی خمول پسندی ہی شاید اس کا باعث ہے کہ مجھے کسی مختصر یا طویل مضمون میں ایسا تردد کبھی بھی پیش نہیں آیا جیسا کہ اِس مضمون میں! کچا چٹھا رطب و یابس جو بھی سامنے آیا ایک آدھ فرصت میں لکھ بھیجتا ہوں، مگر اس کے لیے آپ سے شرمندگی اٹھانی پڑی ۔ بہرحال سب سے پہلے تو ان کی یہی ادائیں ہیں جن سے یہ ناکارہ اوّلین مرحلہ میں متاثر رہا۔

اب والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی عملی زندگی اور پھر فہم دین کا ایک آدھ واقعہ لکھتا ہوں شاید میری طرح آپ بھی متاثر ہوں ۔ نکاح کی ایک مجلس میں ایک دوست بلکہ معتقد کے ہاتھ میں بیٹری دیکھی تو فرمایا "اس سے تو رات کی تاریکی میں بڑی سہولت ہوتی ہوگی" یہ وہ زمانہ تھا کہ قوم محنت کش تھی، نعمتِ ہمت سے محروم نہیں ہوگئی تھی ہر کسی کے پاس اس قسم کی چیزیں نہیں ہوا کرتی تھیں، اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کو یہ رونے اور رلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کہ ؂

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

بیٹری (ٹارچ) والے نے کہا قاضی صاحب! رات کے اندھیرے میں یہ واقعی بڑے کام کی چیز ہے، یہ آپ رکھ لیں رات کو اٹھنے میں آپ کو سہولت پہنچائے گی، آپ نے انکار کیا، اُس کے اصرار سے لے کر آ تو گئے لیکن علی الصبح ہی طالب علم کے ہاتھ واپس کر دی۔ وہ دوڑتا ہوا آیا عرض کیا حضرت! میں تطییبِ خاطر دینا چاہتا ہوں آپ رکھ لیں، آپؒ نے فرمایا:۔

"تمہارے اصرار سے میں رات کو لے آیا لیکن ساری رات پریشانی رہی کہ اس طرح میری عادت بگڑ جاوے گی، طبیعت لالچی بن جاوے گی، کسی کے پاس کوئی چیز دیکھوں گا تو اشارۃً کنایۃً مطالبہ

کرنے لگوں گا اور یہ نہ مروت ہے اور نہ ہی دیانت"۔
واقعہ مختصر ہے مگر بنیادیں اس کی بڑی گہری ہیں ؎

والنفس کالطفل ان تہملہ شب علیٰ
حب الرضاع وان تفطمہ ینفطم

"نفس کی مثال دودھ پیتے بچے کی سی ہے اگر اسے آزاد چھوڑ دو تو جوانی تک دودھ پیتا رہے گا اور چھڑا دو تو دو چار دن میں چھوڑ دے گا"۔۔۔
نفسانی خواہشات کو ختم کر دینے کا ایک ہی علاج ہے کہ اسے پہلے ہی دن ہمت کر کے چھوڑ دو۔ ع

گربہ روز اول باید کشت

تعریف یعنی ٹالتے رہنا کہ آج تو نہیں ۔۔۔ فردا ترک ایں سودا کنم ۔۔۔ یہ ہلاکت ہے۔ آج کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اس برائی کا تخم ڈال دیا۔ تخم ڈالتے رہنا اور یہ سمجھنا کہ اب اگنے نہیں دوں گا ایک غلط خیال، محال اور جنون ہے ؎

سر چشمہ سہل است بستن بہ میل
چوں پُر شد محال است بستن بہ فیل

یہ ہے علم نافع! اس کے کئی مظاہر والد مرحوم کی زندگی میں دیکھے۔ اور آج تقریباً ۲۵ سال آپ کی وفات کو ہو رہے ہیں مگر ان سے تاثر گویا آج کی بات ہے۔
آپ کے فہمِ دین کا واقعہ بھی عرض کر دوں۔ ایک دفعہ کسی اچھے بھلے متقدر شخصیت نے سوال کیا قاضی صاحب! دین کی باتیں قرآن و سنت میں موجود ہیں، ان کی تفصیلات اور تشریحات مفسرین اور محدثین کی کتابوں میں مل جاتی ہیں عمل کے لیے یہ کافی ہیں پھر یہ جو کسی بزرگ کی بیعت کی جاتی ہے اس کا بھی کوئی فائدہ ہے؟ فرمایا۔
"یہ کچھ کم فائدہ ہے کہ مرید بننے والا یہ تو مان لیتا ہے کہ کم از کم یہ

ایک شخص "جس کی بیعت کر رہا ہے" مجھ سے اچھا ہے"

کیا سمجھے آپ! واقعہ یہ ہے کہ دریا بکوزہ کر دیا ہے۔ بنصِ حدیث اپنا نفس اَعدی الاعادی سب سے بڑا دشمن ہے اس کا پہلا اور سب سے آخری سبق یہی ہے کہ تم ہی سب سے اچھے ہو، اگر انانیت اور نفسانیت کا کانٹا نکل جاتا ہے تو وصلِ حبیب محبوبِ حقیقی جلّ مجدہٗ کا راستہ دو ہی گام رہ جاتا ہے۔ دَعْ نَفْسَکَ وَتَعَالیٰ، نفس کو چھوڑ دو اور مجھ سے مل لو ؎

بے حجابانہ درآ از درِ کاشانۂ ما
کہ بجز درد توکس نیست دریں خانۂ ما

مقصد یہ ہے کہ شیخ کا ہاتھ پکڑ لینے سے نفسانیت کا کانٹا نکالنے کی ابتداء ہو گئی، اب ہمّتِ مرداں مددِ خدا، وصلِ حبیب کا دروازہ کھل گیا ؎

کیمیائیت عجب بندگیٔ پیرِ مغاں
خاکِ اُوگشتم و چندیں درجاتم دارند

بندگی سے مراد یہاں اطاعت اور غلامی ہے، اعتماد و انقیاد ہے ؏

کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

نہ کہ غیر اللہ کی عبادت کہ وہ تو شرک ہے اور وصلِ حبیب میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

نجاست شرک ہے اور دل سکونت گاہ دلبر ہے
مکاں گر ہے نجس دلبر کا رہنا ہو نہیں سکتا

یاد آیا کہ ایک دوست نے اپنے چہرہ کو انوارِ سنّت سے مزیّن کرنے کا عزم کر لیا، سبزہ نورستہ لے کر حاضر ہوا، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بڑی خوشی ہوئی، میں مدرسہ میں طلبہ کو پڑھا رہا تھا میرے پاس لے کر آئے اور فرمایا اسے مبارک باد دو، مجھے خوشی ہوئی، اسے مبارک باد دی اور پوچھا اس رحمتِ الٰہی کا سبب کیا بنا؟ مقصد یہ

تھا کہ کس کی نصیحت مؤثر ہوئی؟ کیسے خیال آیا۔ اس سے پہلے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور پشتو شاعر صوفی عبدالرحمٰن بابا کا شعر سنا کر جواب دیا، شعر پشتو میں ہے، آپ نے بڑی سادگی اور روا روی میں پڑھا لیکن مجھ جیسے غبی القلب کی حالت بھی چند لمحے یکدم بدل گئی اور سمجھ میں آگیا کہ ؎

دادِ حق را قابلیت شرط نیست
بلکہ شرط قابلیت داد اوست

جاذبۂ غیبیہ نے مدد کی اور دل پھر گیا، شعر یہ تھا ؎

چہ ضرور دِ چہ وَ کوبل خواتہ غوا رم
پہ خپل کور کنبس ھمکناہ دے دبِ څما

جس کا حاصل فارسی میں یوں ادا کیا گیا ہے ؎

ہم چو نابینا مبر ہر سوئے دست
زانکہ در زیرِ گلیم است ہر چہ ہست

اُردو میں یوں کہا جا سکتا ہے ؎

دِل کے آئینہ میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

ہاں اور نجم المدارس کے ایک طالب علم نے قرآنِ کریم حفظ کر لیا تھا، آخری دنوں میں اسے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہو گیا تھا۔ والحمد للہ اس کا والد آیا وہ داڑھی منڈایا کرتا تھا، والد صاحب نے اُسے بچہ کے حافظ ہوتے پر مبارکباد دی، پھر اُس سے پوچھا بچے کو حفظ کیوں کرایا ہے؟ اُس نے کہا کیوں جی یہ اچھا کام نہیں، ثواب کا کام نہیں! ـــــ اُن دنوں ملازمت کے لالچ میں نہیں لوگ قرآنِ پاک کو قرآنِ پاک سے محبت اور ثواب کمانے کے لیے پڑھا کرتے تھے ـــــ

قبلہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اُس کی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی سادگی سے فرمایا اور بھائی یہ اچھا کام نہیں، ثواب کا کام نہیں! ــــ بس از دل خیزد بر دل ریزد ــ کی تصدیق سامنے آئی، اُس نے کہا قاضی صاحب! آج کے بعد انشاء اللہ اسے نہ اُسترہ لگے گا اور نہ ہی قینچی! سلسلہ طویل ہے، ہمیں ع

بس است اگر در خانہ کس است

حفظ کے استاذِ مکرم بھی نہایت مسکین، بینائی کمزور، مگر اڑھائی تین سال کے عرصہ میں کبھی بھی یاد نہیں پڑتا کہ انہوں نے اشارۃً یا کنایۃً اپنی کسی ضرورت کا اظہار کیا ہو تا بہ طلب چہ رسد" گویا سب حضرات ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
با پادشہ بگوئے کہ روزی مقدر است

کا مرقع تھے ــــ حرصِ دنیا کی موجودہ وبا میں قدم قدم پر نہ صرف ان سے متاثر ہوں بلکہ اُن کی ہمتِ مردانہ پر نثار ہونے کو جی چاہتا ہے۔

دُوسری منزل غالباً چودہ سال کی عمر میں مَیں یہاں سے سراج العلوم سرگودھا گیا، وہاں چند سال رہنے کے بعد خیر المدارس جالندھر اور پھر وہاں سے دار العلوم دیوبند پہنچا ــــ پہنچا نہیں بلکہ حسنِ تقدیر نے مجھے ان اکابر علماء دیوبند کے زیرِ سایہ کچھ دن رہنے کی سعادت سے نوازا ؎

گلے بر دند زیں دہلیزہ پست
بآں درگاہ والا دست بر دست

حقیقت یہ ہے کہ ؎

اُن کے پاس گذریں چند گھڑیاں
اُنہیں کی یاد میری زندگی ہے

یہاں کا پتہ پتہ پھول اور ذرّہ ذرّہ آفتاب نظر آیا ــــ ھم کالحلقۃ المفرغۃ لا یدری این طرفاھا ــــ ان کی مثال ایک گول قیمتی انگوٹھی کی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اول کیا ہے اور آخر کیا ہے

مَیں نہ تفضیل کا قائل نہ مساوات کا
ہاں مجھے گمرہ کی ہدایت کو ہیں یکساں سب ہی

یہاں کے اکابر تو اکابر چھوٹے اور اصاغر بھی سبحان اللہ!

سرگودھا میں مدرسہ عالیہ سراج العلوم کے مہتمم حضرت قبلہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ متبحر عالم، بڑے قاری، نہایت فصیح و بلیغ اور مقرر علامۃ العصر حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ کے شاگردِ رشید اور قطبِ زمان حضرت مولانا احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ سراجیہ کندیاں کے مجازِ مطلق ــــ مگر اخلاق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مَیں نے خود انہیں مرکزِ رُشد و ایقان روضۂ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے پاس قطبِ عالم اعلیٰحضرت سیّدی مولانا نور المشائخ صاحب کابلی مجددی قدس اللہ سرہ العزیز کی مجلسِ سعادت میں دیکھا کہ علماء و مشائخ کی اعلیٰ سطحی مجلس میں نہایت ساکت و صامت انتہائی ادب سے کم و بیش ایک گھنٹہ تک ہمہ تن گوش بیٹھے رہے آپ کے چچا جان فقیہہ دوراں مولانا احمد دین صاحب کیلوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سے فارسی میں باتیں کرتے رہے، باہر آکر فرمایا "خدا کی قسم ایک لمحہ بھی حضرت کا قلبِ مبارک غافل نہیں رہا۔

مَیں نے دیکھا کہ جن دنوں آپ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا مفتی احمد سعید صاحبؒ دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث شریف میں شریک تھے احقر بھی خوش قسمتی سے ان کا ہم سبق تھا، حضرت الاستاذ دار العلوم تشریف لائے تو اپنی عام عادت کے برخلاف شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ سے ملنے گئے تو ادباً و حیاءً کھدر کا جوڑا پہن کر

گئے جو اسی ہی غرض کے لیے سلوایا گیا تھا کہ اس اللہ والے کے عزت و احترام کی ایک صورت یہ بھی ہے ——— کیا امام شافعیؒ کا امام اعظم ابو حنیفہؒ کی قبر پر جا کر غالباً دعائے قنوت چھوڑ دینے کا عمل اپنی تحقیق کو ترک کرتے ہوئے اسی کے مشابہ نہیں ہے۔ فما اشبہ الیوم بالبارحۃ ——— گویا آج اسلاف کا وہی نقشہ ہمارے اسلاف کے پیشِ نظر تھا۔

اپنے شیخ حضرت اقدس مولانا احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رومال لایا گیا تو میرا مشاہدہ ہے کہ آپ ادباً اٹھ کھڑے ہوئے اُسے بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا سر پر رکھا اور واللہ کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے ——— آج اعجاب کل ذی رأی برایہ (خود پسندی) کے اس دور میں اِس قسم کی قلبی محبت اور للّٰہی آداب کا تصور بھی مشکل سے کیا جاتا ہے جبکہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہی ادب تھا۔ بقول حضرت درخواستی دامت برکاتہم الدین کلہا ادبٌ۔

بہرحال یہ علم حقیقی اور علم نافع ہی کا اثر تھا کہ ہمارے اکابر فنائے نفس کی دولت سے مالا مال تھے اور اسی کے صلہ میں من تواضع للہ رفعہ اللہ رفعت درجات پر ممتاز رہے، اور میں ان حضرات کے کمالاتِ علمیہ و عملیہ میں سے اسی کمال سے زیادہ متاثر رہا۔

ایک اور عجیب بات سنیے! اسی سراج العلوم میں میرے مشفق استاذ حضرت مولانا صالح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ایک طالبعلم جو ذرا "تہ" ل اور تلخ زبان تھے۔ "اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے"، نے ایک دن علیٰ رؤس الطلباء ان سے کہا "اُستاد جی! آپ نے میرے تین سال ضائع کر دیئے، میں تین سال سے یہاں آیا ہوں کچھ نہیں سیکھا، آپ سمجھا ہی نہیں سکتے، خداوند تعالیٰ کو کیا جواب دو گے"؟ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً نے ہنس کر فرمایا:۔

"بھائی جان! دو سال کا جواب تو آپ خود اللہ تعالیٰ کو دیں کہ جب پہلے سال معلوم ہو گیا کہ یہاں کچھ تعلیم نہیں ہے تو پھر دوسرے اور تیسرے سال کیوں آئے؟ ہاں پہلے سال کے متعلق ہمارے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں۔"

یہ حوصلہ اور طلباء دین کی یہ قدر دانی ع

اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

حضرت الاستاذ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ خوشاب والوں نے سنایا کہ مَیں بیمار ہوا اور حضرت مولانا صالح محمد صاحبؒ بیمار پُرسی کے لیے تشریف لائے، ملتے ہوئے دست بوسی کا ارادہ کیا تو مَیں نے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ یہ کیوں؟ فرمایا آپ میرے اُستاذ ہیں اور اساتذہ کی دست بوسی جائز ہے۔ فرماتے ہیں مَیں نے تعجب سے پوچھا مَیں اور آپ تو ہم درس ہیں ہم استاذ ہیں، مَیں آپ کا اُستاد کب بنا؟ فرمایا مَیں چھٹی پر گیا ہوا تھا، ھدایۃ النحو کے کچھ اسباق رہ گئے تھے، واپسی پر آپ نے ہی ان کا تکرار کرایا۔ اس لیے آپ میرے اُستاذ ہیں اور مجھ پر آپ کا ادب کرنا ضروری ہے۔

یہ ہیں میرے اساتذہ جن سے مَیں متاثر ہوا اور اگر ان سے متاثر نہ ہوں کیونکہ وہ مشاہیر میں سے نہیں ہیں تو پھر مجھے اپنی ایمانی بے حِسی پر رونا چاہیئے۔

آئیے اب آپ کو جالندھر کی سیر کراؤں! خیر الاساتذہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے۔ محدّث بھی، فقیہ بھی، مربیِ اخلاق اور مزکی النفوس بھی، مناظر بھی اور انتہائی منتظمانہ صلاحیتوں کے مالک بھی۔۔۔ ان کا ایک ایک وصف جاذبِ قلب و نظر تھا لیکن آپؒ کی خاص شان صلۂ بین الفئتین کی تھی اور اسی سے میں زیادہ متاثر رہا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے اِتفاق اور

اختلاف دونوں میں خلوص اور للہیت کا جذبہ کار فرما ہے ؎

محبت ہو کسی سے یا عداوت
مزہ دے جاوے گی جب دل سے ہوگی

یہی وجہ ہے کہ تھانوی اور مدنی گروپ دونوں کے اکابر اور ارباب بصیرت حضرت خیر العلماء پر یکساں اعتماد فرمایا کرتے تھے ـــــ خیر المدارس جالندھر میں جس سال میں موقوف علیہ پڑھ رہا تھا حسنِ اتفاق سے شیخ الاسلام حضرت مدنی اور حکیم الامۃ حضرت تھانوی قدس سرہما یکے بعد دیگرے جالندھر تشریف لائے، دونوں کا سیاسی اختلاف برملا تھا۔ حضرت خیر الاساتذہؒ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز، مگر ہر دو حضرات کے میزبان حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ ہی تھے، دونوں کے قیام کے لیے آپ نے اوپر کا بالا خانہ جس میں آپ کے اہل وعیال رہا کرتے تھے اسی کو خالی کرایا۔ خیر المدارس کی کل کائنات جہاں تک مجھے یاد ہے اُس وقت صرف چار کمرے ایک برآمدہ ریلوے روڈ جالندھر پر اور ایک مسجد تھی صحن ندارد ـــــ دونوں اکابر سے صبح کی نماز کی امامت کرائی، دونوں حضرات سے بعد نمازِ فجر درس اور مختصر خطاب کرایا ـــــ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے جب سیاسی جہاد سے کنارہ کشی پر چند کلمات فرمائے تو حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ نے ہلکے سے تبسم سے ہی اس کا جواب دیا، ایک لفظ تک زبان سے نہیں نکالا ـــــ اس کے بعد چائے نوشی کی مجلس (جو کہ بہت ہی مختصر تھی) انتہائی فرحت و انبساط کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی ـــــ مَیں پہلی بار حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی زیارت سے مشرف ہُوا، آپ کو تانگہ تانگہ میں پچھلی سیٹ پر کھدر کے اپنے مخصوص قبا میں دیکھا تو غیر اختیاری طور پر یہ تصور قائم ہُوا کہ سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا چہرہ مُہرہ شاید ایسا ہی ہو ـــــ یہیں جالندھر میں اختلاف و اتحاد کی اسلامی حدود کی پابندی کا منظر بھی دیکھا

اور یقین ہو گیا کہ اگر نیت بخیر ہو تو ایسے اختلاف سے تشتت وافتراق اور پریشانی و انتشار کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا حضرت الاستاذ مولانا محمد عبداللہ صاحب رائپوری اور حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندہری رحمہما اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً گو کہ سیاسی ذہن میں حضرت مہتمم صاحبؒ سے دور اور بہت دُور تھے لیکن خیر المدارس کے معاملہ میں بلا مبالغہ یک جان و سہ قالب کا مصداق تھے۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے وصال پر ملتان کے تعزیتی اجلاس میں "الصدیق" "ملتان بابت جلد ۷۷ھ/۱۳۷۷ھ کے مطابق حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ نے ذیل کا مرثیہ پیش فرمایا:-

نفسی الفداء الصارم عریانِ من باترات اللہ ذی السلطانِ

میری جان اُس شمشیر برہنہ پر قربان ہو، جو خدائے غالب کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔

تذبابہٗ موت الملاحدۃ اللئام عداۃ دین الحق والایمانِ

اس کی دھار ملاحدہ لئام کی موت ہے، جو دینِ حق اور ایمان کے دشمن ہیں۔

اکرِمْ بہٖ ارحم بہٖ احلم بہٖ اعلم بہٖ بالفقہ والقرآن

بہت بڑے کریم بہت بڑے شفیق بہت بڑے بُردبار، فقہ اور قرآن کے بہت بڑے عالم۔

متمسکٌ بعری الھدایۃ والرشاد من کتاب واضح التبیانِ

قرآنِ عزیز کی واضح ہدایت کو مضبوطی سے تھامنے والے۔

درحقیقت یہ انسان تھے اور انسانوں کی طرح ہی زندہ رہے، ان کو یاد کر کے آج کے حالات میں بے اختیار یہ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ

این کہ می بینی خلافِ آدم اند نیستند آدم غلاف آدم اند

حاصل یہ کہ لوگ میرے اساتذہ کے علم وعمل، ریاضات ومجاہدات کو دیکھ کر محوِ حیرت ہیں اور میں سب سے زیادہ ان کے اخلاق شرافت اور جذبۂ للہیت سے متاثر رہا ہوں، کہ یہ چیزیں اب عنقا آشیانہ ہیں اور ان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی ہیں۔

دار العلوم دیوبند | میں جہاں تک قطب الاسلام امیر المؤمنین فی الحدیث بخاری زماں حضرتِ اقدس سیدی حضرت مولانا سید حسین احمد المدنی قدس سرہ العزیز کا تعلق ہے آپ کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ

اما ابن مسعود فابن مسعود فرضی اللہ تعالیٰ عنہما وارضاھا۔

شمسی بنگالی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

از ہیبتِ آں شیر نر یورپ ہمیشہ نوحہ گر
لرزہ فتادہ رجگر بز غالہ کردار آمدہ
شیخم حسین احمد نگر گردیدہ درگیتی سمر
کز غایت فضل و ہنر لقمان کردار آمدہ
ظلّ امیر الہند پائندہ تر دار ای خدا
بر طالبانِ بے نوا کانتاش انصار آمدہ

ہزار اختلاف کے باوجود جیل جانے پر حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ کا دل جس پر رو رہا ہو، سحر البیان امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جس شیخؒ کی موجودگی کے باعث دیو بند میں تقریر نہ کرنے کا عزم کر رکھا ہو ــــ اس پر کسی ناکارہ، آوارہ، بے علم وعمل طالب علم کا کچھ لکھنا ایک جرأتِ بیجا اور یقیناً ناروا جسارت ہے ــــ لوگوں میں حضرتؒ کی شہرت کفر وشرک اور ظلم وعدوان کے مقابلہ میں نبرد آزما ہونے کی وجہ سے ہے اور بلا شبہ یہ وصف خاص ع

ع ہر مدعی کے واسطے دار و رسن نہیں

کے ماتحت عام نہیں، اس کے لیے ازلی انتخاب اور ارباب عزیمت کا مقدر رہا ہے۔ آپ کا شمار ارباب ذکر کے طبقہ علیا میں یقیناً صحیح اور بالکل بجا ہے۔ نہ صرف محدثِ شہیر و کبیر بلکہ محدثین کرام کے محبوب ترین فردِ فرید — ہونے ہیں شاید آپ کی نظیر دور دور تک نہ مل سکے — ملکی سیاست میں علماء کی عزت و آبرو کے آپ ہی محافظ رہے ہیں۔ میں حضرتؒ کے جس وصفِ خاص سے متاثر ہوں وہ حضرتؒ کے سرتاپا سیاسی ہونے کے باوجود اور دریائے سیاست کے قعر میں پابند رہنے کے ساتھ ساتھ دامن تری کے عیب سے بالکل مبرا و منزہ رہے ہیں۔ جب بھی مذہب و ملت، اور دین و شریعت کا نام آیا تو حضرتؒ اپنے تمام حیثیاتِ سیاست کو بالکل بھول ہی جاتے تھے، گویا ؎

دلا تو رسم تعلق ز مرغ آبی جو
کہ گرچہ بدریاست خشک بر برخاست

جس سال دیوبند شریف میں میں دورۂ حدیث شریف پڑھ رہا تھا، حضرتؒ تین ہفتے لکھنؤ میں مدح صحابہؓ ایجی ٹیشن کی سرپرستی فرماتے رہے، واپسی پر جلسۂ عام میں فرمایا (جو کہ جامع مسجد دیوبند میں مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کی صدارت میں ہوا) کہ:

"لوگ کہتے ہیں یہ کیسا سیاسی شخص ہے کہ ایک فرقہ کے مذہبی مسئلہ میں دخیل بن گیا ہے (فرمایا) میں فلاں فلاں لیڈروں کی طرح سیاسی نہیں ہوں، مذہب کا معاملہ پیش آئے گا تو حسین احمد سب سے پہلے اس میں قربانی دے گا۔"

کھوکھلے نعروں کی حد تک ہم ہی کہتے رہیں گے، لیکن حضرتِ مدنیؒ نے عمل کر کے دکھایا، اور ہم عمل کے وقت آئیں بائیں شائیں کر کے رضا کاروں کو ورغلا لیتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے سُنا کہ ایک دفعہ حضرتؒ عصر کے بعد کسی سیاسی جلسے میں شرکت فرمائی جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی شریک تھے، مردوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی تھیں، پورے جوش و خروش سے تقریر فرمائی۔ مغرب کے بعد ہی تلقین مریدین میں مشغول ہوئے۔ حضرت بنوریؒ نے فرمایا خدا کی قسم ذرا بھی قلب مبارک پر غبار محسوس نہیں ہوا۔

سیاست اور مذہب کشتی پانی کے بغیر چلائی نہیں جا سکتی لیکن پانی اگر اس کے اندر گھس جائے تو یہی اس کی تباہی ہے ——

مذہب کی کشتی کے لیے مانا کہ سیاست کے دریا میں کودنا مجبوری ہے لیکن اگر سیاست اس کے اندر پڑی تو مذہب تباہ ہو گیا اور معاملہ یہی رہا کہ ؎

تر زباں ہوئیں کس کی جو قوم ہی نہ رہی

سیاست جب تک مذہب کے لیے رہے اور مذہب ہی کی پابند رہے تو پھر عین مقصود رہے لیکن مذہب کا نام سیاست کے لیے استعمال کیا جاتا رہے تو بالکل زندقہ و الحاد ہے۔

شرم کی بات ہے کہ شریعت کو مغربی جمہوریت پر قربان کرتے ہوئے بھی ہم حضرت مدنیؒ کے نام لیوا شمار ہوتے رہیں ؎

باخدا تز دیر دجیلہ کے رواست

حضرتؒ تو مدح صحابہؓ کے لیے ہزاروں مسلمانوں کو جیل بھجوائیں اور ہمارا دشمنانِ صحابہ سے ووٹ حاصل کرنے کی لالچ میں یارانہ ہو تو بھی ہم کو حضرت مدنیؒ کا غلام سمجھا جائے اواورے قوم تیری سادہ دلی ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

سیاست کو مذہب پر قربان کیا جائے جیسا کہ حضرتؒ کا طریقہ تھا تو یہ سیاست

برائے مذہب ہے اور مذہب کو سیاست کے لیے پسِ پشت ڈالا جائے تو مذہب برائے سیاست ہے۔ پہلا نہ صرف جائز بلکہ فرض اور دوسری صورت دھوکہ، فریب اور حرام و ناجائز۔

حضرت مدنیؒ کی ایسی سیاست سے یہ ناکارہ بہت ہی متاثر ہے اور اس قسم کے واقعات حضرتؒ کی زندگی کے قدم قدم پر سُنے جا سکتے ہیں مگر ایسے واقعات اب نہ سنے جاتے ہیں اور نہ ہی سنائے جاتے ہیں۔ فالی اللہ المشتکی ؎

دُرِ بنارس باقیا باقی نماند
آں قدح بشکست آں ساقی نماند

دیوبند کے اساتذہ عظام میں سیدی حضرت افغانی قدس سرہ سے زیادہ رابطہ رہا بلکہ صحیح یہ کہ حضرتؒ کی نظرِ شفقت زیادہ رہی۔ حضرت بلاشبہ علم کے سمندر اور معرفت کے بحرِ بے کنار تھے۔ میں نے انہیں واللہ لباسِ شاہی میں فقر کا بے تاج بادشاہ پایا۔ علومِ عقلیہ و نقلیہ کے استحضار میں نمونۂ سلف ہونے کے باوجود فنائے نفس کا یہ حال تھا کہ جب بھی کوئی عجیب نکتہ بیان فرماتے تو نہ صرف متقدمین بلکہ معاصرین کا حوالہ دینے میں کوئی استنکاف نہیں فرمایا کرتے تھے جبکہ نفس پرست علماء جان بوجھ کر یہ تصور دینے کی کوشش کیا کرتے ہیں کہ گویا یہ ایجادِ بندہ ہے۔ اس سلسلہ میں دل تو بہت چاہتا ہے مگر یہاں تو اتنا ہی آپ کی تعمیل میں بتلانا تھا کہ میں ان حضرات کے کس کمال سے زیادہ متاثر ہوا اور وہ یہی کہ کانوا وقافین لکتاب اللہ مذہب میں ان کا اوڑھنا بچھونا تھا حب فی اللہ اور بغض للہ ان کا طرۂ امتیاز۔

کتب اور مشائخ کرام کے سلسلہ میں کسی اور فرصت کا انتظار فرمائیں۔

ناکارہ عبدالکریم غفرلہٗ و والدیہ
خادم نجم المدارس کلاچی، ۲۸ رجب سنہ ۱۴۱۰ھ

ایک بقیۃ السلف عالمِ دین

علامہ مولانا **مارتونگ** رحمۃ اللہ علیہ

کی

کہانی اُن کی اپنی زبانی

برصغیر کے شمال مغربی سرحدی علاقے اور کوہستانی سلسلے ہر دور میں علم و فضل کے لحاظ سے بڑے مردم خیز واقع ہوئے ہیں۔ یہاں بے شمار ایسے اکابر علم و حکمت اور اعیان رشد و ہدایت بزرگ گذرے جن کا علم و تقوٰی اور جامع کمالات شخصیت پورے عالم اسلام کے لئے موجب فخر اور لائق تحسین بن سکتی تھی۔ مگر ایک تو دور دراز سنگلاخ اور دشوار گذار علاقوں میں رہائش پھر بعض وجوہات سے عموماً تحریر و تصنیف کا موقعہ نہ ملنے اور پھر ان بزرگوں کی طبعی، عزلت نشینی اور شہرت و نمود سے گریز نے ان کے فضائل اور کمالات کے غلغلہ کو بھی محدود رکھا نہ ان کی سوانح حیات مرتب ہوئی، نہ علوم و فیوض مدون ہو سکے۔ نہ ان کے علمی و فکری ورثہ سے عام عالم اسلام اور برصغیر کو کماحقہٗ آگاہی

ہوسکی۔ پھر یہ علاقے نہ تو دینی اداروں، دارالعلوموں، درسگاہوں سے شناسا رہے نہ ادھر انجمنوں تحریکوں اور جماعتوں کا رواج ہوا۔ نتیجۃً ایسے لائق افتخار اکابر و اعاظم رجال شخصیتیں پشتون علاقوں، پہاڑوں اور بستیوں کے گوشۂ خمولت کی نذر ہوگئیں۔ گو اللہ کی بارگاہ میں ان کے مقالاتِ عالیہ اور مدارج میں اس سے کمی نہیں آسکی۔ ایسے ہی بقیۃ السلف اور علمی لحاظ سے جامع شخصیتوں میں حضرت العلامہ مولانا خان بہادر صاحب عرف مولانا مارتونگ صاحب سابق مدرس دارالعلوم سیدو شریف سوات بھی تھے۔ زندگی بھر علوم و فنون کا درس و تدریس ان کا شیوہ رہا۔ پشتون علاقوں میں معقولات اور علوم عقلیہ میں تو انہیں امامت کا درجہ حاصل رہا اس وقت اپنے دور دراز پہاڑی وطن میں مقیم تھے اس وقت خوش قسمتی سے مولانا موصوف کے ایک جید اور قابل و فاضل تلمیذ مولانا فضل مولیٰ صاحب چکیسری دارالعلوم حقانیہ میں فرائض تدریس انجام دے تھے۔ اور جو اس وقت دارالعلوم دلبوڑی کے مہتمم ہیں۔ جنہوں نے ۶ سال مسلسل مولانا سے شرف تلمذ پا چکے ہیں۔ انہوں نے اس غرض سے مولانا کے پاس جانے کا سفر کیا۔ اور ہم آج اسے پشتو سے اردو میں منتقل کرتے ہوئے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں

میری علمی اور مطالعاتی زندگی کی ایک دلچسپ روئیداد ہے۔ جسے قارئین بھی پسند کریں گے۔

سمیع الحق

تاریخ ولادت ۔ ۱۳۱۶ھ تخمیناً

نسب ۔ والد کی جانب سے صدیقی اور والدہ کی جانب سے پٹھان قوم نصرت خیل پھر نصرت خیل میں خاص طور پہ بیجان خیل حیدر خیل ہے۔

سکونت ۔ مقام سکونت ڈیری مضافات ویدل کماچ علاقہ چغرزئی ضلع سوات

ابتدائی تعلیم ۔ میری عمر تین برس تھی کہ میرے قبلہ گاہ والد صاحب ہندوستان چلے گئے اور وہیں لاپتہ ہو گئے بلکہ آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ میری والدہ صاحبہ نے میری تربیت شروع کی جب کہ وہ اپنے بھائی (میرے ماموں) کے گھر پر مقیم تھیں میری عمر سات برس ہو گئی اور آٹھویں سال میں داخل ہوا تو میری والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ میرے چچا جو مولانا شیر بہادر صاحب موضع چکیسر میں حضرت العلامہ مولانا امان اللہ خان صاحب مصنف امانیہ سے معقولات کی کتابیں پڑھتے تھے میری والدہ کی وفات سے باخبر ہوئے تو فی الحال ہمارے گھر تشریف لائے اور مجھے مختلف وجوہات کی بنا پر اپنے ساتھ لے گئے۔

تقریباً ۶ ماہ کے عرصہ میں میں نے ناظرہ قرآن شریف موضع بلیانئی مضافات اکازی علاقہ غوربند میں ختم کیا۔ اس کے بعد چچا صاحب کی ہدایت پر موضع بلیانی کے علماء مولانا عتیق اللہ صاحب مرحوم اور مولانا عبداللہ صاحب مرحوم وغیرہ سے فارسی

کتابیں معہ خط و کتابت پڑھیں فارسی نظم میں میں نے زلیخا ختم کیا اور مولانا عتیق اللہ صاحب سے صرف میر شروع کی۔ اور تقریباً تین ماہ میں مزید کبیر سمیت زبانی یاد کیا۔ یہیں بلیانئی میں علم صرف کی کتابیں صرف بہائی، زرادی، زنجانی قلیل مدت میں پڑھیں۔ مراح الارواح شروع کر چکا تھا کہ میرے چچا علم صرف میں زیادہ تکمیل کی بناء پر مجھے بڈانہ گاؤں مضافات ہزارہ میں لے گئے۔ موضع بڈانہ علم صرف کی ایک مکمل درسگاہ تھی اور یہاں ایک کامل صوفی عالم موجود تھے۔ یہاں مراح الارواح ختم کی اور قانون کھیوالی مشتمل بر ساٹھ قوانین صرف حفظاً یاد کیا۔ مراح کو بھی حفظاً یاد کیا تھا۔ اور نماز مغرب سے عشاء تک ان کتابوں کا دورہ پورا کرتا تھا۔ پھر اپنے چچا صاحب موصوف کی معیت میں فصول اکبری بھی یاد کر لی۔

علم صرف سے فارغ ہو کر علم نحو کی کتابیں شروع کیں۔ نظم مأتہ عامل اور شرح مأتہ عامل علاقہ چھچھ میں تھوڑے عرصہ میں یاد کر لیں۔ ہدایۃ النحو نصف تک پہنچا چکا تھا کہ میرے چچا نے مجھے موضع بلیانی میں اپنے سابقہ اساتذہ کے پاس دوبارہ بلا لیا۔ اور خود تحصیل علم کے سلسلہ میں دہلی جا کر وہاں کے مدرسہ نعمانیہ میں داخلہ لیا۔ اس وقت وہاں کے صدر مدرس مولانا پور دل صاحب تھے۔ چچا جان وہاں مقیم ہو گئے تو پھر مجھے بھی بلا لیا اور بلیانی کے اساتذہ نے ایک معتمد شخص کے ساتھ مجھے دہلی بھیج دیا۔ میرے چچا نے طالب العلمی کے ساتھ ساتھ دہلی کی کسی مسجد میں امامت اختیار کر لی تھی۔ کھانا جو آتا تھا ایک ہی شخص کے لئے کافی ہوتا تھا وہ مجھے کھلا دیتے اور خود فاقے کرتے۔

ٹونک میں آمد۔ بالآخر فاقوں کی شدت سے تنگ آ گئے تو مجھے ساتھ لے کر ٹونک چلے گئے اس وقت ٹونک کی حکومت اور ولایت جناب ابراہیم خان کے ہاتھ میں تھی۔ شہر میں دو دینی مدرسے تھے ایک مدرسہ کا نام مدرسۂ قافلہ تھا

نواب صاحب کے بھائی جرنل عبدالرحیم خان کی نگرانی میں تھا۔ اور جناب مولانا سیف الرحمٰن صاحب جو علاقہ ہشت نگر چارسدہ کے باشندے تھے، اس کے صدر مدرس تھے۔ اور دوسرا مدرسہ خود نواب صاحب چلا رہے تھے جس کا نام مدرسۂ خلیلیہ تھا۔ اس کے صدر اور سرپرست حضرت مولانا حکیم برکات احمد صاحبؒ ٹونکی تھے۔ جو حضرت مولانا عبدالحق خیرآبادی کے براہِ راست شاگرد تھے یہاں فنون معقولات کے لئے اور اساتذہ مقرر تھے۔ اور مہتمم مدرسہ حضرت مولانا موصوف متقدمین کی کتابیں مثلاً افق المبین، شفاء اور اشارات خود پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھار جب حمداللہ اور قاضی کا درس دینے لگتے تو اطراف و اکناف سے طلبہ بڑی کثرت سے جمع ہو جاتے۔ مگر ہمارا داخلہ مدرسہ قافلہ میں ہوا۔ اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہاں کے صدر مدرس مولانا سیف الرحمٰن صاحب سے وطن سے واپسی میں سفر میں ساتھ ہو گیا۔ اور ان کی معرفت ہم نے مدرسہ قافلہ میں داخلہ لیا۔ میں نے اس مدرسہ میں تین سال گذارے۔ پہلے سال میں کافیہ اور دوسرے سال شرح ملّا جامی مولوی کلن صاحب سے پڑھیں جو اس زمانہ میں ایک ممتاز نحوی تھے اور ان دو سالوں میں منطق کے بعض رسائل ایسا غوجی شرح تہذیب، ملّا حسن، میبذی وغیرہ بھی پڑھے۔ اس اثنا میں حکیم مولانا برکات احمد صاحب نے اپنے صاحبزادہ کو شرح جامی کا درس دینا شروع کیا یہ درس ان کی ڈیوڑھی میں ہوتا اور اونچے درجہ کے طلبہ اس میں تبرکاً بڑی کثرت سے شرکت کرتے تو میں بھی حضرت حکیم صاحب کے صاحبزادہ کی معیت میں ان کا شرف تلمذ حاصل کیا اور دوسرے سال کے آخر میں مولانا حیدر حسن صاحب ٹونکی سے جو مشاہیر علماء میں سے اور مدرسہ قافلہ کے نائب صدر تھے۔ حمداللہ کا کچھ ابتدائی حصہ پڑھا۔ نیز اس مدرسہ میں مولانا محمد مصطفٰے صاحب سے حساب اور مولانا

حسن رضا صاحب سے سکندر نامہ پڑھا جو فارسی میں نہایت مشہور تھے جب کہ اول الذکر حساب میں مشاہیر علماء میں سے تھے۔

ابھی ہم ٹونک میں تھے کہ حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب کو مدرسہ فتحپوری دہلی کے اراکین نے سَو روپیہ مشاہرہ پر طلب کیا۔ ٹونک میں آپ کا مشاہرہ چالیس روپے تھا۔ مولانا حکیم برکات احمد صاحب چونکہ نواب ٹونک کے خصوصی طبیب تھے اس وجہ سے ان کا مشاہرہ تین سو روپے ماہوار تھا۔

حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب کے فتحپوری مدرسہ تشریف لے جانے کے بعد تین ماہ کی مدت گذری تھی کہ میرے چچا صاحب بغرض علاج سورت راندیر ایک پشتون حکیم کے پاس گئے۔

مدرسہ فتحپوری دہلی۔ مدرسہ فتحپوری دہلی میں میرا امتحان داخلہ بیندی کی فصل ابطال جزء لایتجزی میں مولانا سیف الرحمٰن صاحب مرحوم نے خود لیا۔ اس موقعہ پر میں نے حضرت مولانا کے مشکل سے مشکل سوالات کا برجستہ جواب دیا تو بعد میں حضرت مولانا صاحب اکثر اپنی مجالس میں میری ذہانت کے لحاظ سے مجھے برق خاطف کہتے تھے۔ امتحان داخلہ کے بعد مجھے داخلہ مل گیا۔ یہ ۱۳۳۰ھ کی بات ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فنون کی اونچی کتابیں پڑھنے کی غرض سے علمی طبقوں کا رجحان مدرسہ عالیہ رامپور کی طرف بہت زیادہ تھا۔

مولانا قطب الدین غور غشتی۔ ہمارے حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب کی تجویز ہوئی کہ فتحپوری میں ایک ایسا جیّد معمر عالم لایا جائے جو طلبہ کا مرجع ہو اور مدرسہ کی طرف رامپور کی طرح طلبہ کا رجحان پیدا ہو سکے۔ اس تجویز کی بنا پر غور غشتی (چھچھ) کے مشہور عالم مولانا قطب الدین صاحب کو ۵۰ روپے ماہوار پر دعوت دی گئی۔ مولانا قطب الدین ایک معزز علمی خاندان اور مہمان نواز

گھرانہ کے فرد تھے اور بے حد مقروض ہو گئے تھے۔ اس لئے مجبوراً فتح پوری کی دعوت قبول کی۔ ابھی یہاں حضرت موصوف مرحوم کو ایک سال ہی گذرا تھا کہ مدرسہ کے اکناف سے یہاں تک کہ رامپور سے بھی طلبہ کھنچنے لگے اور فتح پوری مدرسہ علمی لحاظ سے علوم و فنون کے لحاظ سے سارے ہندوستان کا مرکز بن گیا۔

مولانا قطب الدین کا علمی مقام ۔ مولانا کے تدریس کے دوسرے سال مدرسہ کے اپنے طلبہ کے علاوہ ایک سو چالیس اونچی استعداد کے طلبہ رامپور وغیرہ سے یہاں جمع ہو گئے۔ مولانا سیف الرحمٰن اور مولانا قطب الدین صاحبان ہر دو حضرات نے دورۂ حدیث قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے پڑھا تھا اور حضرت مولانا سیف الرحمٰن اس زمانہ میں مشاہیر محدثین میں سے تھے۔ لہذا دورۂ حدیث کی کتابیں آپ ہی پڑھاتے۔

ایک دفعہ جب حضرت مولانا صاحب علیل ہو گئے اور بیماری ممتد ہو گئی تو آپ نے دورۂ حدیث کے طلبہ کو حکم دیا کہ میری بیماری دوران دورۂ حدیث شریف کے اسباق مولانا قطب الدین صاحب سے شروع کریں۔ طلبہ نے حضرت مولانا قطب الدین صاحب کی خدمت میں درخواست پیش کردی کہ مولانا نے اجازت دی ہے۔ تو حضرت مولانا قطب الدین صاحب نے کتابوں میں اسباق کی جگہ معلوم کئے فرمایا کہ کل انشاءاللہ پڑھاؤں گا۔ کل تشریف لائے جگہ دریافت کی اور فی البدیہہ کامل تحقیق مذاہب اور تفصیل و تطبیق احادیث نیز ترجیح مذہب امام ابو حنیفہ میں تقریر کی تو طلبہ متحیر ہو گئے۔ کہ ہم تو انہیں ایک فلسفی عالم سمجھے تھے مگر آپ تو احادیث کے بھی سمندر نکلے۔ چند دن آپ سے دورۂ حدیث پڑھنے کے بعد طلبہ کی رائے یہ ہوئی کہ آپ حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب سے تحقیقات فرمانے میں بڑھ کر ہیں۔

الغرض داخلہ کے بعد میں تین سال مدرسہ فتح پوری میں پڑھتا رہا اور اس عرصہ میں حمداللہ، میرزاقطبی، میرزاہد، ملا جلال، قاضی مبارک۔ صدرا، میر کلاں، تصریح اور اقلیدس پڑھیں۔ سوائے تصریح کے جو میں نے مولانا عبدالمنان صاحب باجوڑی سے پڑھی۔ یہ سب کتابیں مولانا قطب الدین صاحب سے پڑھیں۔

مولانا پوردل صاحب میری اس سہ سالہ مدت طالب العلمی میں ایک مرتبہ مولانا قطب الدین صاحب بعض مجبوریوں کی بنا پر گھر سے نہ آسکے اور مدرسہ سے معذرت کی تو مولانا سیف الرحمٰن صاحب نے مولانا کی جگہ مدرسہ نعمانیہ دہلی کے صدر مولانا پوردل قندہاری کو ۵۰ روپے ماہوار پر طلب فرمایا، اور انہوں نے بخوشی دعوت قبول کی۔ مدرسہ نعمانیہ میں ان کی تنخواہ چالیس روپے تھی جب مولانا نے یہاں آکر تدریس شروع کی تو دوسرے دن مدرسہ نعمانیہ کے مہتمم معہ اپنے اہل و عیال کے منت سماجت کرنے مولانا کے پاس حاضر ہوئے اور تنخواہ بھی دس روپے بڑھا دی اور انہیں اپنے مدرسہ میں واپس آنے پر مجبور کیا۔ اور مولانا پوردل صاحب ان وجوہات کی بنا پر مدرسہ نعمانیہ ہی میں رہ گئے۔ بعد میں جب کوئی پوچھتا کہ آپ نے کیوں رائے بدل دی تو مولانا کی طبیعت میں ظرافت بھی تھی اور اردو بھی گلابی سی تھی تو فرماتے کہ "پچاس ادھر ہو گیا پچاس اُدھر ہو گیا اور بندہ حیران ہو گیا۔"

مولانا غلام نبی گلاؤٹھی اور مولانا قاضی پوری صاحب ان کے بعد مولانا سیف الرحمٰن صاحب نے مولانا قطب الدین صاحب کی جگہ پر ان کے ایک تلمیذ خاص مولانا غلام نبی صاحب گلاؤٹھی ضلع بلند شہر کو طلب کیا۔ مولانا غلام نبی صاحب کی تبحر علمی کی وجہ سے مولانا سیف الرحمٰن صاحب انہیں علم کا تھیلا کہتے۔ اتفاق کی بات کہ مولانا غلام نبی

صاحب بھی دو ہفتے کے بعد مدرسہ چھوڑ کر چلے گئے ۔ تو مولانا سیف الرحمٰن صاحب نے اکثر طلبہ کے مشورہ پر علاقہ چھچھ کے موضع قاضی پور سے قاضی پور مولوی صاحب کو دعوت دی جو ایک ممتاز عالم تھے ۔ مولوی صاحب فتحپوری تشریف لائے مگر چونکہ طلبہ منتہی تھے اور بکثرت اسباب میں شبہات اور اعتراضات کرتے رہتے اور قاضی پوری مولوی صاحب کے اردو تلفظ میں مادری زبان ہندکو بھی مخلوط ہوتی ۔ لہذا ہر طالب علم کے اعتراض کا مولانا صاحب کی طرف سے مسکت کر جواب دیتا اور مولانا صاحب میرے حق میں بڑی دعائیں دیتے اور مجھ سے بے حد راضی رہے ۔ لیکن مولانا موصوف بھی جب بعض وجوہات کی بنا پر ایک ماہ بعد مدرسہ چھوڑ کر چلے گئے تو مولانا سیف الرحمٰن نے ایک بار پھر سخت اصرار اور التجا کی ۔ مولانا قطب الدین صاحب سے التجا ظاہر کی ۔ مولانا قطب الدین صاحب مجبوراً اسی تمنا اور التجا کو پورا کرنے سال کے دوران ہی مدرسہ فتحپوری دوبارہ تشریف لائے اور عہدہ مدرسی سنبھالا ۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ مدرسہ فتحپوری میں میرا دوسرا یا تیسرا سال تھا کہ مولانا عبید اللہ سندھی صاحب نے مدرسہ کے شمالی دروازہ کے اوپر والی عمارت کرایہ پر لی اور اس عمارت میں رہنے لگے ۔ ان کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک اور شوخی تھی ۔ آپ کی نشست اسی عمارت میں ہوتی اور فارغ التحصیل طلبہ کو تکمیل کے طور پر حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے اور ہر طالب علم کو پچاس روپے ماہوار وظیفہ دیتے ۔

خفیہ مشورے اور سفر کابل جب حضرت مولانا سیف الرحمٰن صاحب اپنے اسباق سے فارغ ہوتے تو وہ اور مولانا سندھی مسجد فتح پوری کے محراب میں خفیہ مشورے کرنے لگتے ۔ کسی کو ان باتوں کی خبر نہ ہوتی ۔ نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ مولانا

سیف الرحمٰن صاحب نے انگریزی فوج میں بھرتی ہونے کے بارہ میں فتویٰ مرتب کیا اور اس کی اشاعت ایک معتمد ذمہ دار شخص کے سپرد کر دی ۔ خود اس فتویٰ کی اشاعت سے تین روز قبل حضرت حاجی صاحب ترنگ زئی مرحوم کے پاس مہمند اور پھر وہاں سے کابل چلے گئے ۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی اس کے چند روز بعد کابل تشریف لے گئے ۔ اور مولانا شیخ الہندؒ نے عرب کی طرف ہجرت فرمائی ان دنوں خلافت کمیٹی کے جلسوں کی گرمی مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے دم سے تھی ۔ اور مولانا آزاد جو امام الہند کے لقب سے ملقب تھے کبھی کبھی کلکتہ سے ان جلسوں میں شرکت کرنے دہلی آتے ۔

منڈو میں قیام تین سال گذرے تھے کہ مولانا قطب الدین صاحب غورغشتی کو منڈو ضلع علی گڑھ میں مولانا ماجد علی صاحب مشہور محدّث اور معقولی عالم کی جگہ منصب صدارت پر طلب کیا گیا ۔ میں بھی ۱۳۳۴ھ میں مولانا صاحب کے ساتھ منڈو چلا گیا ۔ اور مولانا عبد السلام قندہاری (جو میرے ہمعصر) تھے بھی ساتھ ہی تھے جنہیں معقولات کی اکثر کتابیں از بر تھیں ۔ اور غضب کا حافظہ تھا ۔ وہاں میں اور مولانا عبد السلام قندہاری اور درجہ علیا کے دیگر طلبہ نے شرح مطالع از اوّل تا بحث تناقض اور شرح اشارات از اول تا نمط تاسع خیالی اور شرح چغمینی پڑھیں ۔

رفاقت اور علمی نوک جھونک شرح اشارات کے درس کے دوران تقریباً تین ماہ تک میرے اور مولانا عبد السلام قندہاری کے درمیان علمی نوک جھونک اور مناظرے جاری رہتے ، جب ہمارے مناظرے طول پکڑ گئے اور رفقاء درس طلباء تنگ آ گئے تو مولانا قطب الدین صاحب سے درخواست کی کہ ہم تو آپ سے پڑھنے آئے ہیں ان دونوں کے مناظرے سننے تو نہیں آئے

مولانا صاحب نے فرمایا چاہلو! میرے پڑھانے سے ان دونوں کے یہ مناظرے تمہارے لئے زیادہ مفید ہیں۔ اس طرح آپ کو بہت سے علوم مستحضر ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے منڈو میں پٹھان طلبہ آدھے میرے اور آدھے مولانا عبدالسلام کے طلبہ ہوتے۔ چونکہ مولانا عبدالسلام اردو نہیں جانتے تھے۔ اس لئے ہندوستانی اور بنگالی طلباء بھی میرا ساتھ دیتے۔ دونوں کے طلباء میں اختلاف رہتا۔ میرے طلباء مجھے ترجیح دیتے تھے اور مولانا کے شاگرد انہیں بڑھاتے رہتے اسی باہمی تفاضل کا اختلاف بڑھتے بڑھتے شدت اختیار کر گیا تو مولانا قطب الدین کو اس بارہ میں فیصلہ کرنے کا حکم بنایا کہ ان کے فیصلہ پر عمل ہوگا۔

ایک دن دونوں جماعتوں کے نمائندہ افراد نماز عصر کے بعد اس امر کا فیصلہ کرانے مولانا قطب الدین کے پاس جمع ہو گئے۔ مولانا نے یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ دونوں ذہین ہیں۔ آپ جائیں اور یہ اختلاف چھوڑ دیں۔ لیکن طلباء نے اس پر اکتفا نہ کیا اور اصرار بڑھتا گیا کہ ضرور فیصلہ فرما دیں ورنہ اختلاف مزید بڑھ جانے کا خطرہ ہے۔ تو حضرت مولانا نے مجبوراً فرمایا کہ:۔

مولانا عبدالسلام کی معلومات اتنی ہیں کہ اگر کسی ایک مقام پر بحث شروع کر دیں تو ایک دن میں بھی ان کی تحقیقات ختم نہیں ہو سکیں گی۔ اس لئے کہ ان کا حافظہ بہت زیادہ ہے۔ اس لئے کہ اگر مولوی خان بہادر کسی ایک مقام کے توجیہات شروع کر دیں تو کمال ذہانت کی وجہ سے ان کی توجیہات کئی روز تک ختم نہ ہو سکیں گی۔ کیونکہ یہ زیادتِ ذہانت کی بنا پر مجتہد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مولانا عبدالسلام صاحب حافظ ہیں اور مولانا خان بہادر مجتہد ہیں ——

الغرض منڈو میں میں نے تین سال گذارے اور ۱۳۲۵ھ میں میں دیوبند چلا گیا۔

دارالعلوم دیوبند میں - ۱۳۳۵ھ میں دارالعلوم دیوبند گیا۔ میں نے داخلہ امتحان کے لئے فارم میں تین کتابیں لکھیں۔ ۱۔ قاضی ۔ ۲۔ شرح اشارات ۔ ۳۔ شرح چغمینی۔

مولانا انورشاہ کشمیری میرے امتحان داخلہ کے لئے حضرت کشمیری (شاہ انور شاہ) تجویز کئے گئے۔ جس وقت میں امتحان دینے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے قاضی کے مبحث تشکیک میں لاتشکیک فی الماہیات سے شروع فرمایا۔ اور اما انتفاء الماھیۃ تک تقریباً ایک صفحہ میں میں نے حضرت والا شان کو امتحان دیا۔ اس کے بعد حضرت والا شان نے کتاب بند فرمائی اور یاد سے منتشر سوالات شروع کئے۔ میں نے اس کے مناسب جوابات دیئے۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ امتحان کی دو کتابیں اور باقی ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا کہ معلومیۃ قابلیت کے لئے ایک کتاب کا امتحان کافی ہے۔ اس لئے باقی دو کتابوں میں امتحان نہ ہوا۔ پھر دریافت فرمایا کہ اس سال یہاں دارالعلوم میں آپ کون سی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف ہدایہ مکمل اور توضیح۔ تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ دورۂ حدیث کے لئے متنبی کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے متنبی بھی پڑھ لیں۔ اسی دن سے میرا کھانا مطبخ سے جاری ہوا۔ اور نمبرات کے لحاظ سے میں عمدہ درجہ میں کامیاب ہوا۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ میرے اسباب کی ترمیم و ترتیب حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے حوالہ تھی۔ انہوں نے مجھ سے کتابوں کے بارہ میں دریافت کیا تو میں نے ان کتابوں کا نام لیا۔ جو حضرت شاہ صاحب مرحوم کے سامنے لیا تھا۔ تو مولانا شبیر احمد صاحب نے پوچھا کہ جب ہدایہ مکمل پڑھنا

چاہتے ہیں تو کیا شرح وقایہ آپ نے پڑھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ شرح وقایہ تو کیا میں نے کنز الدقائق بھی نہیں پڑھی۔ تو فرمایا کہ جب شرح وقایہ اور کنز بھی نہیں پڑھے تو ہدایہ مکمل کس طرح لے سکتے ہو؟ تو میں نے جواب میں کہا کہ آپ اپنے اس دارالعلوم کے کسی مکمل طالب علم کو بلائیں جو ہدایہ پڑھ چکا ہو اور اعلیٰ طریقہ سے کامیاب بھی ہوا ہو۔ پھر مجھے اور ان کو ۵ منٹ دیں اور کسی مشکل جگہ کو متعین فرما کر بعد میں دونوں سے امتحان لیں اور ہم دونوں کا موازنہ کر لیں۔

مولانا شبیر احمد صاحب نے فرمایا کہ آپ کی قابلیت میں کوئی شک نہیں کہ جب آپ نے امتحان کے لئے شرح اشارات اور قاضی کا نام لکھا ہے اور پھر قاضی میں حضرت شاہ صاحب کا امتحان دے کر عمدہ نمبرات سے کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ مگر یہ ترتیب ہمارے دارالعلوم کے اصول کے خلاف ہے کہ شرح وقایہ نہ پڑھی ہو اور اسے ہدایہ میں شریک کر لیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کا یہ قانون غلط ہے اس وجہ سے کہ اس میں مراتب اذہان کی تفاوت کی رعایت نہیں۔ تو انہوں نے منطق کے لہجہ میں فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ دینیات میں مرکز خاک پر ہیں اور معقولات میں محدّب فلک الافلاک پر ہیں۔ تو میں نے جواباً کہا کہ اس لئے کہ معقولات مبادی ہیں۔ اور دینیات مقاصد اور مبادی مقاصد پر طبعاً مقدم ہوتے ہیں۔ لہٰذا میں نے وضعاً اسے مقدم رکھا ہے۔ اس لئے کہ وضع کی مطابقت طبع کے ساتھ ہو سکے۔ پھر آپ نے سوال کیا کہ آپ نے کونسی شرح اشارات پڑھی ہے۔ امام رازی یا طوسی کی؟ تو میں نے جواب میں قصداً ابہام سے کام لے کر کہا کہ جو شرح اشارات مدارس میں مروّج ہے اسی کو پڑھ چکا ہوں۔ تو فرمایا کہ میں اسی ہی کو متعین کرنے کا پوچھتا ہوں۔ تو میں

نے کہا کہ آپ کے دارالعلوم کا جو بلند و بالا نصاب ہے، خود آپ کے سامنے ہے پھر مجھے اس کے تعین کی کیا ضرورت ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جب آپ ناراض ہو رہے ہیں تو میں نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم سے آپ کو ہدایہ میں شمولیت کی اجازت لے لوں گا۔ میری خفگی حضرت مولانا نے میرے مذکورہ جوابات سے محسوس فرمائی۔

دیوبند سے امروہہ۔ مگر ابھی میرے اسباق شروع نہیں ہوئے تھے کہ دیوبند کی آب و ہوا کی عدم موافقت کی وجہ سے میں بیمار ہو گیا۔ تو میں نے بعض معتمد طلباء سے مشورہ کیا۔ انہوں نے یہ رائے دی کہ امروہہ ضلع مراد آباد کی آب و ہوا بڑی عمدہ ہے۔

مولانا حافظ عبدالرحمن امروہی۔ وہاں کے مدرسہ کے صدر مولانا حافظ عبدالرحمن امروہی مشاہیر مفسرین اور اکابر محدثین میں سے ہیں۔ آپ جلالین شریف میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور احادیث میں حضرت گنگوہی کے براہ راست شاگرد تھے۔ تو میں امروہہ چلا گیا۔ وہاں میری صحت بالکل ٹھیک ہو گئی۔

امتحان داخلہ میں پہلے نمبر پر کامیاب ہو کر داخل مدرسہ ہو گیا۔ مشکوٰۃ شریف میں نے یہاں مولانا رضا حسن صاحب سے پڑھی۔ جو حضرت مولانا سید احمد حسن امروہی کے بھتیجے تھے۔ اور مولانا احمد حسن مرحوم احادیث میں حضرت گنگوہی کے بالذات شاگرد تھے اور اپنے دور کے کامل اولیاء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ یہ بات مشہور تھی کہ مولانا احمد حسن پر جلالی شان غالب تھی، اور ان کے ساتھی حضرت شیخ الہند پر جمالیت کا غلبہ تھا۔ اور

مولانا محمد قاسم نانوتوی فرمایا کرتے تھے کہ ان دونوں میں سے ایک میری عین یمنی (دائیں آنکھ) اور دوسری عین یسریٰ (بائیں آنکھ) ہے اور یہ تعین نہ فرماتے کہ کون عین یمین ہے اور کون عین الیسر۔

توضیح اور ہدایہ اولین غالباً مولانا امین الدین سے شروع کی اور ہدایہ آخرین تفسیر بیضاوی اور جلالین شریف حضرت والا شان مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب سے شروع کیں۔ ایک کتاب ختم ہونے کے بعد دیوان متبنی بھی حضرت حافظ صاحب سے پڑھی۔ تقریباً دو ماہ گذرے تھے کہ مولانا امین الدین صاحب کو جو بہت بڑے حکیم تھے حکیم اجمل خاں صاحب نے دہلی اپنے طبیہ کالج کے لئے طلب کیا۔ ان کے جانے سے جگہ خالی رہ گئی۔

طالب علمی میں تدریس۔ اس وقت تک درجہ علیا کے طلبا مجھ سے خارجی اوقات میں معقولات کی اہم کتابیں پڑھنے لگے تھے اور حضرت مولانا امروہی سے میری بڑی تعریفیں کرتے تو حضرت مولانا نے مجھے فرمایا کہ چونکہ نائب صدر چلے گئے ان سے آپ توضیح پڑھتے تھے۔ وہ اب میں پڑھاؤں گا۔ اور ان کے ذمہ معقولات کے علاوہ دیگر کتابیں باقی مدرسین اور معقولات کی جو کتابیں صدرا، قاضی، حمداللہ ان کے پاس تھیں۔ وہ اب خارجی اوقات میں بحیثیت معین مدرس پڑھائیں گے اور اس کی مناسب تنخواہ بھی مقرر ہوگی اور اگلے سال جب آپ دورۂ حدیث سے فراغت پاسکیں تو یہ کتابیں مستقل آپ کے سپرد ہوں گی۔ اور آپ بحیثیت نائب صدر مستقل صدر ہوسکیں گے۔ اراکین مدرسہ کی شوریٰ بھی طلب فرمائی۔ جنہوں نے اس مشورہ کی منظوری دی۔ اور میرے لئے چارپائی، بستر وغیرہ اور کچھ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔ اگلے سال حضرت امروہی مرحوم سے دورہ حدیث شروع کیا۔

مولانا امروہی مسلک کی تلاش میں۔ آپ نے وقت اور حالات کے مطابق

دو ایک باتیں یہ فرمائیں کہ میں نے دورۂ حدیث تین مرتبہ کیا۔ پہلی بار عدم ناواقفیت کی وجہ سے ایسے استاد سے کتابیں پڑھیں کہ وہ غیر مقلد تھے (ان کے نام کا تعین آپ نے نہیں کیا) دورہ شروع ہونے کے بعد اثناء درس میں اور بعد اختتام دورہ مجھ میں عدم تقلید کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ لہٰذا میں نے ارادہ کیا کہ ثانیاً دورہ حدیث سن خیال سے کروں کہ حق حقیقی مجھ پر واضح ہوسکے۔ اس بنا پر میں حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اور جب ان کے درس میں شریک ہوگیا جس مقام پر میرا شک اور تردد ہوتا۔ حضرت گنگوہیؒ فراستِ ایمانی کی روشنی سے میری طرف متوجہ ہوجاتے اور ایسی تحقیق فرمالیتے کہ مجھے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب و مسلک حق ہونے کا یقین حاصل ہوجاتا۔

حضرت گنگوہیؒ کا درس حدیث ۔حضرت گنگوہیؒ کی یہ خصوصیت تھی کہ اختلافی مباحث میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب اقصیٰ مراتب کمال میں واضح کردیتے۔ اس طرح کہ کسی قسم کا شک و شبہ مذہب امام کی حقانیت میں نہ رہ سکتا۔ یہ احادیث میں ہمیشہ آپ کی عادتِ شریفہ رہی کہ اختلافی مسائل میں پہلے مذاہب اربعہ بیان کر لیتے۔ پھر امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے جوابات دیتے اور اثباتِ مذہب حنفیہ کے لئے احادیث بیان فرماتے۔ اور مخالفین کی احادیث کے امام کی طرف سے جواب دیتے۔ تو ایک مرتبہ کسی شاگرد نے عرض کیا کہ حضرت اگر امام شافعیؒ زندہ ہوتے اور آپ کی تحقیقات سے واقف ہوجاتے تو وہ بھی حنفی ہوجاتے۔ اس بات کا حضرت گنگوہیؒ پر اتنا بڑا اثر ہوا کہ رنگ زرد ہوگیا اور بے ہوش ہوگئے۔ ہوش میں آنے پر اس طالب کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ ارے گستاخ حضرت امام شافعیؒ زندہ ہوتے تو رشید احمد تمہیں اسباق پڑھاتے یا حضرت امام شافعیؒ کی کفش برداری میں لگے رہتے؟

الغرض جب میں نے گنگوہ میں دورہ ختم کیا تو علاوہ دو تین مقامات کے میرے سارے شکوک رفع ہو گئے۔ اور میں امروہہ چلا آیا۔ یہاں حضرت مولانا احمد حسن امروہی کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کیا۔ کہ حضرت میرے تمام شکوک حضرت گنگوہیؒ کے درس میں رفع ہو گئے ہیں سوائے دو تین مقامات کے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ دورہ حدیث کے اسباق میں بیٹھا کریں۔ بلکہ پورا دورہ یہاں بھی پڑھ لیں

تو جب میں نے تیسری بار یہاں مولانا احمد حسن امروہی سے بھی دورہ حدیث پڑھا تو مذہب امام ابو حنیفہؒ مجھ پر منزل لہ موجود علیہ کے منکشف ہو گیا۔

مولانا محمد قاسم کی کرامت۔ تیسری بات یہ ہے کہ ایک دفعہ درس میں طلبہ نے حضرت والا شان سے اس تعجب کا اظہار کیا کہ آپ کا جسم اتنا بھاری ہے کثیر الجسامۃ ہیں مگر رفتار میں پھر بھی اتنے تیز کہ ہم آپ کی عام رفتار کو دوڑنے میں بھی نہیں سکتے۔ تو انہوں نے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ جب میں نے دیوبند میں حضرت نانوتوی مرحوم سے خصوصی سفارشات کی وجہ سے مستقل طور پر جلالین شریف پڑھنا شروع کی اور اعلیٰ درجہ کے مدرسین بھی اس میں سامع ہوتے۔ مجھے اس زمانہ میں چلنے میں بھی بڑی دقت ہوتی۔ تو تنہائی میں ایک بار حضرت کی خدمت میں دعا کی درخواست پیش کی کہ موٹاپے کی وجہ سے چلنے پھرنے میں بڑی تکلیف ہے۔ میرے لئے دعا فرمائیں کہ یہ تکلیف سرعت رفتار سے بدل جائے۔ تو حضرت نانوتوی نے اس وقت سکوت فرمایا مگر تہجد کے بعد میں اپنے حجرہ میں جلالین شریف کا مطالعہ کر رہا تھا کہ کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ باہر نکلا تو حضرت نانوتویؒ تشریف لائے تھے۔ فرمایا کہ دروازہ بند کر دو۔ میں نے تعمیل حکم کی۔ اور حضرت میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چل پڑے۔ اور کسی آیت کی تحقیق سے متعلق بات چھیڑ دی کہ

اس میں آپ کو کچھ معلومات ہیں؟ تو میں نے عرض کیا کہ حضرت ہی اس کی تحقیق فرمادیں تو ہم راستہ میں چل رہے تھے۔ اور حضرت نے آیت کی تحقیق شروع فرمائی۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں آبادی تھی۔ اور تھوڑی سی رکے تھے کہ پیران کلیر کے خادم حاضر ہوئے، مزار کا دروازہ کھول دیا۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ حضرت نانوتوی حجرہ میں داخل ہوئے اور قبر کے پاس کچھ دیر مراقبہ فرمایا پھر باہر تشریف لائے اور میرا ہاتھ اسی طرح اپنے ہاتھ میں لے کر چل پڑے اور جہاں آیت کی تحقیق چھوڑی تھی وہاں سے آگے بات شروع فرمائی۔ کچھ دیر گذری تھی اور تھوڑا سا عرصہ گذرا تھا کہ ہم دیوبند کے اپنے حجرے میں پہنچ گئے جب کہ مدرسہ سے پیران کلیر کا مزار تقریباً چار پانچ میل یا اس سے زیادہ تھا۔ ہمارا وہاں آنا جانا، مراقبہ کرنا سب کچھ تقریباً ۱۵ منٹ میں ہوا۔

جب ہم حجرہ میں پہنچے تو صبح قریب تھی۔ میں کمرہ میں داخل ہوا اور حضرت تشریف لے گئے۔ صبح ہوئی تو میں نماز کے لئے چل پڑا۔ تو جسم میں نہایت خفت، پھرتی اور رفتار میں نہایت سرعت تھی۔ یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت کا اثر تھا کہ عظمت جسامۃ کے باوجود میں اتنا سریع رفتار والا ہوں۔

الغرض میں نے حضرت کے سرعۃ المسافۃ کے علاوہ اور بھی حضرت کی کرامات کا مشاہدہ کیا۔

مارتونگ جانے کے اسباب ۱۳۳۶ھ کے آغاز میں میں نے دورہ احادیث شروع کیا تو اسی سال میرے چچا دہلی سے ہری پور ہزارہ تشریف لے گئے اور ہری پور کے قریب موضع کلابٹ میں مقیم ہو گئے۔ چونکہ وہ ایک متبحر عالم تھے۔ اس لئے بڑی کثرت سے ہزارہ اور پنجاب کے مختلف طلبہ جمع ہو کر مختلف کتابیں علوم و فنون کی آپ سے پڑھنا شروع کیں۔ انہی ایام کے لگ بھگ

ہمارے گاؤں مارتونگ کے ایک قاضی صاحب جو ایک بہترین عالم تھے وفات پا گئے۔ قوم کی خواہش تھی کہ ان کی جگہ ایک ایسے جامع مکمل عالم آجائیں، جو مختلف فنون کے طلبہ کو بھی اپنے ارد گرد اکٹھا کر سکیں۔ اور ساتھ ہی متقی اور منصف مزاج بھی ہوں کہ قومی جھگڑوں کا فیصلہ عدل وانصاف سے کر سکے۔ لوگ اس کوشش میں تھے کہ میرے استاذ حضرت مولانا عتیق اللہ صاحب جو بلتیانی کے باشندے تھے اور میرے چچا صاحب کے ہم عمر اور مخلص دوست بھی تھے انہیں میرے چچا کے بارہ میں پتہ چل گیا کہ وہ ہندوستان سے آکر کلابٹ میں طلبا کو درس دے رہے ہیں۔ لہذا مولوی عتیق اللہ صاحب نے مارتونگ جاکر وہاں کے لوگوں کو جمع کیا۔ اور کہا کہ آپ کے حسب خواہش عالم مجھے معلوم ہے جو جامع اور متبحر منصف عادل شخص ہے اور ان کا بھتیجا بھی امروہہ سے اس سال فارغ التحصیل ہونے والا ہے۔ تو مارتونگ کے لوگوں کے جرگہ نے انہیں بااصرار کہا کہ خدا کے لئے اس عالم کو کلابٹ سے لے آئیں۔ تو مولانا عتیق اللہ صاحب کلابٹ گئے اور میرے چچا کو مارتونگ لے جانے پر مجبور کر دیا ان کی آمد پر مارتونگ کے لوگوں نے اتفاق کیا کہ آپ ہی ہمارے پیش امام مدرس اور قاضی ہیں میرے چچا نے یہ ذکر کیا کہ وہ شعبان میں فارغ ہو کر آئیں تو ان کے متعلق بھی آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ انہیں یہاں دینی خدمات کے لئے رکھوں گا۔ اس کے بعد میرے عم محترم نے لگاتار کئی خطوط امروہہ بھیجے اور لکھا کہ امتحان اور فراغت کے بعد فوراً مارتونگ آجائیں۔

<u>مولانا امروہی سے وعدہ تدریس</u> - ۱۳۳۹ھ کے آخر میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوا۔ اور حضرت مولانا عبدالرحمن امروہی سے اجازت طلب کی کہ میرے چچا نے مجھے فوری پر طلب کیا ہے۔ اور میرے لئے ان کے مشورہ

اور حکم سے تخلّف کرنا مشکل ہے لہذا مجھے جانے کی اجازت عطا فرمائیں۔ تو انہوں نے اس شرط سے اجازت مشروط کردی کہ آپ آیندہ سال بھی تعطیل کے بعد بحیثیت نائب صدر کے تدریس کے لئے یہاں آئیں گے۔ میں نے وعدہ کیا، تو انہوں نے وعدہ کی توثیق کی غرض سے مہتمم مدرسہ کو فرمایا۔ کہ ان کا سامان بستر وغیرہ دفتر ہی میں رکھ دو۔ اور اس کو طلبا کے امدادی فنڈ، صدقات سے آنے جانے کا کرایہ اور خرچہ دے دو۔ مدرسین کی مد سے اس لئے نہ دو کہ بالفرض اگر مجبوراً نہ آسکیں تو ذمہ دار اور گنہگار نہ ہوں گے۔

تو میں مولانا صاحب کی اجازت سے رخصت ہو کر مارتونگ چلا آیا اپنے چچا سے مولانا صاحب سے کئے گئے وعدہ کا ذکر ہوا۔ انہیں پریشانی ہوئی کہ اب یہ دوبارہ جائیں گے۔ انہی دنوں مولانا عتیق اللہ صاحب بھی مارتونگ میں موجود تھے تو میرے رکوانے کے لئے ان میں یہ تجویز طے ہوئی کہ ان کا عقد نکاح کرایا جائے۔

عقدِ نکاح اور تدریس۔ چنانچہ اس تجویز کو زیر عمل لایا گیا، تو مجبوراً مجھے مارتونگ میں ٹھہرنا پڑ گیا۔ تو تدریس شروع کی۔ میں اواخر شعبان ۱۳۳۶ھ میں یہاں آیا تھا۔ رمضان المبارک شروع ہوا اور میرے عم محترم کے ہاں مختلف فنون شروع تھے۔ تو انہوں نے بعض طلبہ میرے سپرد کئے۔ اسباق شروع کراتے ہی طلبہ مجھ سے نہایت مطمئن ہوئے۔ تو طلبہ کی خوشی کی وجہ سے میرے چچا نے اکثر کتابیں میرے حوالہ کردیں۔ اور دو تین کتابیں اپنے پاس رہنے دیں۔ دو تین سال ہی میں فنون کے اعلیٰ درجہ کی کتابوں میں نہایت شہرت ہوئی۔ اور اطراف و اکناف سے کثرت کے ساتھ طلبہ کا ہجوم ہوا۔ اور مجبوراً مجھے درس کو منظم اور باضابطہ شکل دینی پڑی۔ اس طرح کہ میں سات آٹھ اسباق اپنے ذمہ لیتا اور

طلبا اپنی مناسبت سے ان کتب مشروعہ میں شامل ہو جاتے ۔

حضرت سنڈاکی بابا سے بہ بیعت وسلوک کا تعلق

اس اثناء میں کہ میں مارتونگ میں مقیم تھا کہ حضرت شیخ المشائخ قطب الارشاد مولانا مولوی ولی احمد صاحب المعروف بہ سنڈاکی بابا لوگوں کے رشد و ہدایا اور قومی رسم و رواج کی اصلاح کی غرض سے سوات تشریف لائے۔ اور سوات کے علاقہ " شامیزو " میں سکونت پذیر ہوئے ۔ آپ حضرت مولانا نجم الدین صاحب معروف بہ اڈے بابا صاحب کے خلیفہ مجاز تھے ۔ اور مولانا نجم الدین صاحب حضرت شیخ المشائخ مولانا عبدالغفور صاحب معروف بہ سوات باباجی صاحب مرحوم کے خلیفہ تھے ۔

چونکہ حضرت "سنڈاکی بابا " کی اصلاحات اور دفع مظالم کے واقعات حدِ شہرت کو پہنچ گئے ، اور کرامات کا غلغلہ ہوا ۔ تو میرے قلب میں جذبۂ محبت موجزن ہوا۔ اور آپ سے بیعت کے لئے فرطِ اشتیاق پیدا ہوا تو اپنے چچا صاحب کی اجازت سے سوات کے علاقہ شامیزو چلا گیا کہ حضرت کی ملاقات سے مشرف ہو جاؤں ۔ ان کے ساتھ میرا تعارف پہلے سے بھی تھا وہ اس طرح کہ آپ جزیرۃ العرب سے واپسی کے دوران دہلی تشریف لائے تھے ۔ اور دہلی کے عوام میں عموماً اور طلبہ علماء کے حلقوں میں خصوصاً ان کا چرچا ہوا ۔ تین چار بعض وجوہات سے آپ دہلی تشریف فرما رہے ۔ اس وقت میری جوانی کا ابتدائی زمانہ تھا ۔ مگر میں نے بعض اوراد کی اجازت ان سے لے لی تھی اور اس کا اتنا اثر تھا کہ چار پانچ ماہ تک میں مدرسہ فتحپوری سے دہلی کے بازار تک نہیں گیا ۔

اس کے بعد دہلی سے حضرت سنڈاکی بابا پشاور تشریف لائے اور تہکال پایاں میں مقیم ہوئے ۔ اور لوگوں سے مشورہ کیا کہ یہاں ایک ایسی درسگاہ قائم

کی جائے جو ہندوستان کے دیوبند کی طرز پر ہو۔ مدرسہ کی عمارت کی تعمیر شروع فرمائی۔ مگر عمارتی چوب اور دیگر ضروریات کی غرض سے سوات تشریف لائے اور علاقہ شامیزہ میں ٹھہر گئے۔ یہاں چونکہ نواب دیر کی حکومت تھی اور حکومت کے کارندوں کے مظالم پٹھانوں کے نعر بار پر حد سے زیادہ ہو گئے تھے اور پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ آپ یہاں کی اصلاح اور نواب دیر کی حکومت ختم کرانے کے خیال سے یہیں مقیم ہو گئے۔ اور دارالعلوم تہکال کے بنانے کی تجویز ادھوری رہ گئی۔

سنڈاکی بابا سے بیعت سابقہ تعارف کی بنا پر میں حضرت سنڈاکی باباجی مرحوم کا شرفِ ملاقات حاصل کرنے علاقہ سوات کے موضع شامیزی روانہ ہوا۔ اور حضرت کی خدمت میں بیعت کی درخواست پیش کی۔ حضرت مرحوم کا قاعدہ تھا کہ بیعت سے ان حضرات کو نوازتے تھے جن میں صداقت، خلوص اور تکمیل شوق کا جذبہ ہوتا لیکن میری درخواست بیعت پر کسی قسم کا پس و پیش نہ کیا۔ اسی رات میں نماز استخارہ پڑھی۔ اور سو گیا۔ خواب میں جو کچھ نظر آیا وہ صبح کے وقت میں نے حضرت کو حرف بہ حرف بیان کیا۔ میری روئیداد کو سن کر حضرت نہایت خوش ہوئے اور مجھے اس مسجد سے جہاں بہت ہجوم رہتا اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا چلتے چلتے ہم گاؤں کی ایک پرانی ویران سی مسجد میں پہنچ گئے۔ اور یہیں پر حضرت نے مجھے بھی وضو کرنے کا حکم دیا۔ اور خود بھی وضو کیا اور مسجد کے ایک تاریک کمرے میں مجھے بیعت سے نوازا۔ خصوصی ہدایات دیں۔ اور کتاب اللہ پر عمل کی ترغیب کی۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر حضرت نے مجھ سے خصوصی مصافحہ فرمایا اور کہا کہ بیعت کا اس قسم کا مصافحہ سلسلہ وار چلا آرہا ہے۔ اور یہ بالواسطہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور بیعتِ رسول درحقیقت

بیعت خدا ہے۔ ید اللہ فوق ایدیھم اور آج کے بعد تم پر لازم ہے کہ رب کے قوانین کی حدود کے اندر رہیں اور ہر قسم کی نفسانی اور حیوانی خواہشات کو قابو میں رکھیں۔

اس کے بعد میں ہر چار پانچ سال کے بعد حضرت کا شرف ملاقات حاصل کرنے کے لیئے خدمت اقدس میں حاضری دیا کرتا تھا۔ اس دوران میں نے اپنے اسباق سلسلۂ قادریہ کی تکمیل بھی کی۔ حضرت نے چونکہ مجھے خلافت سے نہیں نوازا تھا۔ اور نیز چند مقامی وجوہات کی بنا پر وہ دیر چلے گئے تھے اور وہاں موضع کوہاں شریف میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس لیے ان کی وفات تک زیارت کا موقع نصیب نہ ہوسکا۔ ان کا مزار شریف وہیں ہے۔

جذبۂ تبلیغ کی شدت۔ حضرت کی وفات کے چند سالوں بعد دل میں جذبۂ تبلیغ ابھر آیا۔ اور چند باعمل اور صالح علماء کو اپنے ساتھ لے کر گاؤں گاؤں پھرے اور تبلیغ اسلام کرتے رہے۔ ہمارا مقصد صرف اور صرف احکام شرعی کا نفاذ تھا میری ان کوششوں کا نتیجہ بہت جلد سامنے آیا اور علاقہ مارتونگ، چکیسر اور علاقہ اباسین چغرزائی میں ہمیں بے حد کامیابی حاصل ہوئی۔ میری ان مخلصانہ جدوجہد اور شوق سے متاثر ہو کر میری قوم نے مجھ سے بیعت کے مطالبے شروع کئے۔ لیکن چونکہ میں بیعت کا مجاز نہیں تھا اس لیے میں نے کوئی ایسا کام نہیں کرنا تھا جس کا مجھے حکم نہیں ملا۔ لیکن میرے جو وظائف اور اذکار لوگوں نے سنے تھے انہوں نے از خود انہیں ورد میں شامل کر لیا۔ اور قدرت الٰہی یہ کہ وہ بہت اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔

بعد ازاں میں علاقہ تیراہ میں پڑوان شریف گیا۔ وہاں حضرت شیخ المشائخ سید عبدالرزاق صاحبؒ سے ملاقات ہوئی۔ (موصوف نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ

سلسلوں میں خلیفہ تھے ۔) اسی دوران ہم احکامِ شرعی کی تبلیغ کرتے رہے اور خصوصاً ادائیگی حج پر ہم نے بہت زور دیا۔ لوگوں کو اس فریضہ کی جانب مائل کرنے کا نہایت اثر ہوا۔

فریضۂ حج بعض اکابرین چکیسر نے مجھے بھی فریضہ حج ادا کرنے کی پیشکش کی۔ اگرچہ زادِ راہ کچھ بھی نہ تھا لیکن توکل علی اللہ اور وسیلہ انسان کے ذریعے خدا نے مجھے اپنے گھر کی زیارت سے نوازنا تھا سو وہ ہوا۔ ۵ر شوال ۱۹۴۸ء کو روانگی ہوئی۔ راستے میں کچھ عرصے تک بمبئی میں ٹھہرے رہے۔ لیکن جب مکہ معظمہ پہنچے تو ذیقعدہ کی درمیانی راتیں تھیں۔ چونکہ ایامِ حج ابھی دور تھے، اس لئے عمرہ پر اکتفا کرنا پڑا۔ اور زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق میں مدینہ منورہ کی طرف چل پڑے۔

شیخ سنوسی اور مولانا عبد الغفور مہاجر مدنی سے ملاقات

مدینۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم میں مسجد نبوی ؐ کے باب السلام میں داخل ہو رہا تھا کہ حضرت مولانا عبد الغفور (عباسی) سے ملاقات ہوئی۔ حضرت مولانا موصوف اس زمانہ میں دہلی کی مسجد سبیل کے امام تھے اور مدرسہ امینیہ میں درس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ انہوں نے مجھے پہچانا اور علمائے ہند سے بھی میرا تعارف کرایا جو وہاں مقیم تھے۔ لہذا آئے دن وہ لوگ ہمیں مدعو کرتے۔

ان دنوں ترکی کے شیخ المشائخ حضرت سنوسی بھی مدینہ منورہ میں آئے ہوئے تھے۔ ان کے مریدوں کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ تھی۔ شیخ مرحوم نے جنگِ طرابلس میں حکومتِ ترکیہ کو تین لاکھ مرید جنگ کے لئے دئے تھے۔ یہ باتیں مجھے حضرت مولانا عبد الغفور صاحب نے بتائیں۔ نیز یہ بھی بتایا کہ حضرت شیخ ایک محدث عالم بھی ہیں۔ اور بہت نزدیکی واسطوں سے سلسلۂ سند حضورِ اکرم ؐ

تک پہنچتا ہے۔ ان سے ملاقات کا شوق دل میں موجزن ہوا کہ تذکرۂ علمی ہو ان کی صحبت میں بیٹھ کر عربی میں گفتگو ہو۔ ملاقات کے دوران ان کی علمی قابلیت سے کافی متاثر ہوا۔ اور ان سے صحاح ستہ کی تدریس کی اجازت کی سند کے لئے عرض کیا۔ انہوں نے اپنے دست مبارک سے دو سندیں لکھیں جن پر اپنی خاص مہر لگوائی۔ ایک مجھے دے دی اور ایک مولانا عبدالغفور صاحب کو۔

دس بارہ دنوں کے بعد مکہ معظمہ روانہ ہوئے اور حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کیا۔ مکہ معظمہ میں حضرت مولانا عبدالسلام تنوی (ہزارہ) سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اگر مکہ معظمہ میں تدریس کی خواہش سے انہیں آگاہ کروں تو وہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن میں نے معذرت کا اظہار کیا اور وطن واپس آیا۔

شیخ سید عبدالرزاق سے خلافت

میرے ایک مرید نے سید عبدالرزاق کو میرے حالات سے آگاہ کیا۔ تو انہوں نے مجھے ایک تحریری حکمنامہ ارسال فرمایا۔ جس میں انہوں نے مجھے سلسلۂ قادریہ میں خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ اور مجھے اجازت دی تھی کہ میں لوگوں سے بیعت لوں۔ کچھ عرصہ بعد حضرت عبدالرزاقؒ مزار بابا تشریف لے آئے اور پھر مریدوں کے بے حد اصرار پر پورن بھی تشریف لے آئے۔ میں بھی حضرت سے ملاقات کی غرض سے پورن آیا ملاقات کی اور ان سے گذارش کی کہ مارتونگ کو اپنے قدموں سے مشرف فرمائیں میری درخواست پر وہ مارتونگ آ گئے۔ میں نے طلبہ کو چھٹی دی۔ ان دنوں میں نے ترمذی شریف ختم کی تھی اور شمائل ترمذی کو ابھی شروع کیا تھا۔ حضرت صاحب کو میں نے اسباق کے متعلق بتایا تو انہوں نے مجھے حکم دیا کہ شمائل ترمذی شریف ان کے سامنے طلبہ کو پڑھاؤں اور باقی اسباق کی چھٹی کر دوں۔ طلبہ جمع ہو گئے

اور درمیان میں حضرت صاحب جلوہ نشین ہوئے۔ ان کی کرامت کا اثر تھا کہ طلبہ پر توجہ سے نہایت اثر ہوا۔ درس کے دوران سب طلبہ پر گریہ طاری ہوا بیقراری اور اضطراری کیفیت قابل دید تھی۔ کبھی وہ رونے لگتے اور کبھی قہقہے لگاتے تمام طلبہ اور میں خود بھی حضرت کی اس جلالی کیفیت سے بے حد متاثر ہوئے درس کے خاتمہ پر طلبہ نے حضرت سے عرض کیا کہ انہوں نے اپنی توجہ مولوی صاحب کی طرف کیوں نہیں کی۔ تو ارشاد ہوا اگر میں انہیں بھی توجہ دے دیتا تو پھر وہ بھی درس دینے کے قابل نہ رہتے۔

اگلی رات کو حضرت نیراہ صاحب نے مجھے اسباق چشتیہ دیئے اور نقشبندیہ مجددیہ معصومیہ کے اسباق بھی سمجھائے۔ اور بعد میں کافی ہدایات و نصیحتوں اور محبت سے مجھے ان دو سلسلوں میں بھی اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ حضرت کی واپسی کے بعد میں نے بیعت اور تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور مجموعی طور پر پچپن سال تک مارتونگ اور دارالعلوم اسلامیہ سیدو شریف میں تدریس کے فرائض انجام دیتا رہا۔ ایک سال تک دارالعلوم مظہرالعلوم مینگورہ میں افتتاح کے بعد درس دیتا رہا۔ جس کے بانی حضرت حاجی خونہ گل صاحب ہیں۔

مارتونگ میں تدریس کا نظام الاوقات مارتونگ میں تدریس کے پہلے بیس سالوں میں نصاب اور طریقہ تعلیم یہ تھا۔ کہ شروع میں طلبہ کو منطق اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ فنون ختم کرنے کے بعد ہدایہ دونوں جلدیں شروع کی جاتی تھیں۔ نیز اس دوران نماز فجر کے فوراً بعد تدریس میں مشکوٰۃ شریف بھی پڑھاتا تھا۔ اور مشکوٰۃ شریف ختم کرنے کے بعد جلالین شریف تمام طلبہ کو پڑھاتا تھا۔

خواب میں زیارت۔ مارتونگ میں تدریس کے دوران متعدد بار خواب

میں زیارت رسولؐ کا شرف حاصل ہوا۔ ایک رات خواب دیکھا کہ میں ایک گاڑی میں سوار ہوں اور میرے ساتھ چند اور علماء بھی ہیں۔ جب ہماری گاڑی ایک جگہ پہنچی تو آواز آئی کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، ملاقاتیوں کو اجازت ہے۔ مجھے نہایت تعجب ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے نہیں اترا۔ میں گاڑی سے اترا اور اس جانب روانہ ہوا جہاں سے آواز آئی تھی۔ سامنے دیکھا کہ ایک میدان ہے جہاں مخلوقات کا مجمع ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لئے آئے ہیں اتنے میں نظر آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں داخل ہوئے اور سب سے پہلے مجھ سے مصافحہ فرمایا۔ میں نے حضور اقدسؐ کے جسم مبارک کو دیکھا تو ایک نوجوان نظر آئے۔ اس کے بعد حضورؐ نے اوروں سے بھی اسی طرح مصافحہ فرمایا۔ مصافحہ کا انداز ایسا تھا کہ ہر آدمی آگے آتا اور رسول اللہ سے مصافحہ کرنے کے بعد واپس چلا جاتا۔ میں نے ان سے دوبارہ مصافحہ فرمایا۔ جب زائرین مصافحہ سے فارغ ہوئے تو رسول کریمؐ ایک راستے پر روانہ ہوئے۔ میں بھی پیچھے چل پڑا اور تیسری بار مصافحہ کیا مگر مصافحوں سے مجھے تشفی نہ ہوئی۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ جب ان کے قریب پہنچا تو حضرتؐ مجسم نور نے مجھ ناچیز سے معانقہ فرمایا۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو ان کی عمر مجھے سن کہولت میں محسوس ہوئی۔ یعنی کافی فرق محسوس ہوا۔ پہلی ملاقات میں نوجوان محسوس ہوئے تھے۔ اور اب پچاس پچپن سے زیادہ کے۔

اس خواب کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے ذہن میں آلودگی اور گندگی باقی نہیں رہی۔ اور ذہن میں صفائی پا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسباق پڑھانے کے دوران بلا کلفۃ و مشقۃ عجیب عجیب لطائف بیان ہوئے۔ درس کے ساتھ

ساتھ میں نے جب تبلیغ کا کام بھی شروع کیا تو ایک رات خواب میں دیکھا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گاؤں کے قریب ایک پہاڑی کے پاس جلوہ افروز ہیں اور ان کے گرد بے شمار لوگ ہیں۔ میں بھی ان لوگوں میں ہوں۔ لیکن ان سے آگے اور رسول اللہؐ کے آگے دوزانو بیٹھا ہوں۔

خواب کو دیکھے اگرچہ ایک زمانہ ہو چکا ہے لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ رسول اللہؐ نے مجھے اشارہ میں کچھ فرمایا تھا۔ اس رات کے بعد میرے جذبہ تبلیغ میں شدت پیدا ہو گئی۔ لیکن ساتھ ساتھ میں تدریس بھی کرتا رہا۔ اس زمانے میں جب میں نے حسب معمول درس مشکوٰۃ شریف شروع کی تو شیر افضل خان نامی ایک حکیم جو چکیسر کے رہنے والے تھے۔ مشکوٰۃ شریف کے متعلق مارتونگ کے طلبہ کے ساتھ بحث و تمحیص کرتے تھے۔ مشکوٰۃ شریف کے اسرار و رموز سے واقفیت کے شوق نے تجسس کو ابھار دیا اور ایک دن فیصلہ کیا کہ درس مشکوٰۃ شریف میں ضرور شرکت کریں گے۔ چنانچہ اسی ارادے کی تکمیل کی خاطر وہ ہماری مسجد میں آپہنچے۔ لیکن جب طلبہ کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ درس مشکوٰۃ شریف ختم ہو گیا تو اسے بے حد مایوسی ہوئی۔ لیکن شوق اور لگن نے اسے نہ چھوڑا اور وہ روزانہ نماز عصر کے وقت چکیسر سے مارتونگ آجاتے اور مجلس میں بیٹھ کر علمی و دینی مسائل سنتے۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ صحاح ستہ مہیا کروں۔ لیکن میرے پاس چونکہ طلبہ دورہ حدیث کو پڑھانے کے لئے صرف یہی کتب تھیں۔ اس لئے میں نے معذرت کی۔ اسی دن وہ صاحب حیثیت و مروت اشخاص کے پیچھے لگ گئے اور انہیں مدرسہ کے لئے کتب خریدنے پر آمادہ کیا۔ ان لوگوں نے حسب توفیق چندہ کر کے تقریباً ۲۰۰ روپے جمع کئے۔

اس واقعہ سے چند روز قبل میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک جگہ بیٹھا ہوں۔

اچانک اسی اثنا میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہیں سے نمودار ہوئیں اور میری جانب بڑھنے لگیں۔ میں تعظیماً کھڑا ہوگیا اور انہیں بیٹھنے کی گذارش کی وہ میری جگہ آکر بیٹھ گئیں۔ جب وہ چارپائی پر بیٹھ گئیں تو میری نگاہیں پہلی بار ان کے چہرے مبارک پر پڑیں۔ انہوں نے بھی میرا جائزہ لیا۔ لیکن مجھے دوبارہ انہیں دیکھنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ پہلی نظر میں جب میں نے انہیں دیکھا تو ان کے چہرے میں نورانیت جھلک رہی تھی۔ شیشہ کی طرح شفاف، انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے کہ انسان شیشے میں اپنا عکس دیکھ رہا ہو۔

جب میں جاگ اٹھا تو دورۂ حدیث کی تدریس کے شوق نے عشق کی کیفیت اختیار کرلی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پشاور جاکر صحاح ستہ کی کتابیں خریدوں۔ لیکن پہلے حضرت مولانا قطب الدین غورغشتی سے دورۂ حدیث پڑھانے کی اجازت لوں۔

مولانا قطب الدین غورغشتیؒ سے اجازتِ حدیث

اجازت کے ارادے سے میں نے حضرت کی خدمت میں حاضری دی۔ اس وقت مولانا طلباء کو مؤطا پڑھا رہے تھے۔ میں نے ان سے اجازتِ حدیث مانگی۔ انہوں نے مجھے مؤطا امام مالک دی اور پڑھنے کا حکم دیا۔ میں نے جب پہلا صفحہ پڑھا تو انہوں نے مسکرا کر کتاب بند کی اور فرمایا جاؤ میری طرف سے آپ جیسے آدمیوں کو صحاح ستہ پڑھانے کی اجازت ہے۔ کیونکہ یہ ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔

حضرت قطب الدین اور میرے استاد الحدیث حضرت مولانا عبدالرحمٰن دونوں ہم درس رہ چکے تھے۔ اور دونوں حضرات نے دورۂ حدیث حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے پڑھا تھا۔ حضرت مولانا قطب الدینؒ سے اجازت حاصل

کرنے کے بعد میں نے باقاعدہ صحاح ستہ پڑھانا شروع کیا۔ کتابیں خریدیں اور اس کے ساتھ ساتھ اور علمی کتابیں بھی پڑھائیں۔ اور ایک مخلوط طریقہ سے میں تقریباً ۲۹ سال تک درس دیتا رہا۔ ایک رات میں نے خواب میں انتقال جناب سرور کائناتؐ دیکھا۔ ان کی چارپائی کے قریب ایک پستول پڑا تھا میں نے وہ اٹھا لیا اور سینے سے باندھ لیا۔ لیکن اس کی پٹی بہت لمبی تھی اور سینے سے نیچے تک لٹک رہی تھی۔

جب میں جاگا تو تعبیر پر متحیر ہوا۔ لیکن جلد ہی حقیقت معلوم ہوئی۔ کیونکہ دوسری رات جب میں نے خواب دیکھا کہ حضرت اخوند صاحب سوات مارتونگ میں تشریف لائے ہیں۔ وہ اس جگہ جہاں ایک مزار ہے، خیمہ زن تھے۔ اور وہیں سے احکامات صادر فرما رہے تھے۔ ایک شخص میرے پاس آیا اور ایک لفافہ مجھے دے کر واپس چلا گیا۔ جب میں نے لفافہ کھولا تو اس میں لکھا تھا کہ :۔

"میری طرف سے تم حاکم ہو"

<u>دارالعلوم سیدو میں</u>۔ چند روز کے بعد تقسیم ہند سے قبل بادشاہ صاحب اور والی سوات صاحب نے یہ ارادہ کیا کہ سیدو شریف میں ایک دارالعلوم کھولیں۔ اس وقت کے ولی عہد صاحب نے مجھے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی کہ وہ ایک دارالعلوم کھول رہے ہیں۔ اور میں بحیثیت صدر مدرس وہاں پہنچ جاؤں اور ایک عالم بھی بطور قاصد کے بھیج دیا۔

چونکہ میں علیل تھا اس لئے معذرت کا اظہار کیا۔ اور انہیں جواباً کہا کہ اگر زندگی رہی اور صحت ہوئی تو حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔

دارالعلوم کا قیام و افتتاح ذیقعدہ ۱۹۴۵ء میں ہوا۔ اسی دوران مجھے بار بار دعوت دی گئی۔ لیکن چونکہ میں علیل تھا اس لئے وہاں نہ پہنچ سکا۔ چند مہینوں

کی علالت کے بعد جب صحت قدرے اچھی ہوئی تو میں ربیع الاول کے مہینے میں سوات چلا گیا۔ اور ۲۰ ربیع الاول کو دارالعلوم میں درس شروع کیا۔ اس سال چونکہ تعلیمی سال میں چند ماہ رہ گئے تھے۔ اس لئے دورۂ حدیث کا انتظام نہ ہو سکا اور آئندہ سال کے لئے یہ ارادہ پکا کر لیا۔ اور اسی طرح اگلے سال دورۂ حدیث کے علاوہ فنون وغیرہ کے درس بھی باقاعدہ شروع ہو گئے۔ ان دنوں مہمانوں اور متعلقین کے آنے جانے کی وجہ سے مجھے مالی دشواریوں کا بہت سامنا کرنا پڑا۔

میاں گل عبدالودود بادشاہ کے ساتھ قیام

ایک دن بادشاہ صاحب نے مجھے طلب فرمایا اور کہا کہ چونکہ میرے مہمان زیادہ آتے رہتے ہیں اور ان کی خاطر تواضع وہاں کے شایان شان ناممکن ہے اس لئے میں ان کے ساتھ ان کے ذاتی محل جس کا نام عقبہ تھا میں رہوں۔

چنانچہ میں وہاں منتقل ہوا، اور میری دشواریاں اور پریشانیاں ختم ہو گئیں کیونکہ چائے صبح کے وقت نوکر لے آتا اور کھانا بادشاہ صاحب کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتا۔ نیز عقبہ سے دارالعلوم تک آنے جانے سے ورزش بھی ہو جاتی اس لئے بفضل خدا صحت بالکل ٹھیک ہو گئی۔ بادشاہ کے ساتھ عقبہ میں تقریباً ۱۵ سال میں نے گذارے۔ اسی دوران ہر جمعرات کو با جازت بادشاہ صاحب مسجد ڈبہ مینگورہ جاتا۔ وہاں میرے فرزند مولانا رشید احمد اور میرے چچا زاد بھائی مولانا امان اللہ مقیم تھے۔

پندرہ سال بعد دارالعلوم مینگورہ کے قریب ایک نئی عمارت میں منتقل ہوا۔ چونکہ اب روزانہ عقبہ سے نئی جگہ آنا دشوار تھا اس لئے میں نے بادشاہ صاحب سے مینگورہ میں قیام کی اجازت لی۔ مولانا رشید احمد اور مولانا امان اللہ فراغت

کے بعد ہارتونگ چلے گئے۔ اور وہیں سے علم دین کے تشنگان کی پیاس بجھانے رہے۔

طلبہ کی حالت میں فرق ۔ میں نے بیس سال تک جن طلبہ کو پڑھایا ان میں ہر وطن اور ہر قوم کے لوگ تھے۔ اور ان میں علم دین کا جذبہ تھا، خلوص تھا، اور وہ نہایت شوق سے دین الٰہی سے معرفت کی خاطر اتنی صعوبتیں برداشت کرکے آتے تھے۔ لیکن آئندہ چھ سال تک میں نے جن طلبہ کو پڑھایا۔ ان میں سے اکثر سند کے لئے آتے تھے۔ انہیں نہ دین سے غرض تھی اور نہ عمل وعلم کا شوق بعض مدرسی اور عہدوں کے لالچ میں مگن تھے۔

حالانکہ ہمارے دارالعلوم سے ایسے طلبہ بھی فارغ ہوئے ہیں جنہیں سرکاری عہدوں کی پیش کش نہایت عزت واحترام کے ساتھ کی گئی۔ اور وہ دارالعلوم اسلامیہ اور دارالعلوم چارباغ میں مدرسی کے اہم فرائض پر مامور کئے گئے۔ میں نے کئی بار استعفیٰ دینے کی کوشش کی لیکن ہر بار بادشاہ صاحب نے اس ارادے سے باز رکھا۔ اور مجھے نہایت ادب سے تدریس کے لئے روکے رکھا۔ اور یہ کہتے کہ اگر تم والی صاحب کو استعفیٰ کی منظوری کے لئے مجبور بھی کردو تو وہ صرف مجبوری ہوگی۔ اور جس وقت وہ آپ کا استعفیٰ خوشی سے منظور کریں تو وہ ناراض بھی نہ ہوں گے اور آپ کو مراعات سے بھی نوازدیں گے۔

مسجد تورہ قل پشاور میں تدریس | دارالعلوم سیدو شریف کی تدریس سے کچھ عرصہ قبل کا واقعہ ہے کہ چونکہ میرے چچا نے شادی نہیں کی تھی بالآخر ہم سب نے مجبور کیا کہ کوئی نشانی رہ جائے گی تو ہم نے ان کے لئے رشتہ کا انتخاب کیا۔ اور مہر وغیرہ میں نے اپنے ذمہ لیا۔ جس کی وجہ سے مقروض ہونا پڑا۔ اس وقت میرے ساتھ بعض منتہی طلبہ زیر تعلیم تھے۔ جن میں ایک مولوی محمد سلیم بدخشانی تھے۔ جو انتہائی درجہ کے ذکی اور ذہین تھے۔ فنون میرانی اد

فنون حکمیہ ایک دفعہ پڑھ چکے تھے۔ لیکن دوبارہ مجھ سے حکمۃ وفلسفہ کی اونچی کتابیں پڑھنا چاہتے تھے۔ وہ اس امر کے باعث ہوئے کہ میں دارالعلوم تورہ قل بائی پشاور میں مدرسی اختیار کر لوں تاکہ قرض بھی ادا ہو سکے اور ہماری پڑھائی میں بھی حرج نہ ہو۔ بلکہ پشاور میں تعلیمی افادہ اور بھی بڑھ جائے گا۔ تو میں نے یہ بات مان لی اور انہوں نے تورہ قل بائی کو منظوری کی اطلاع دی۔ میں اپنے طالب علموں کے ساتھ پشاور گیا اور تدریس شروع کی۔ دو تین ماہ ہی گذرے تھے کہ طلبہ کثرت سے اکٹھے ہو گئے۔ ایک سو چالیس تک تعداد پہنچی۔ اور کچھ طلبہ ہندوستان سے بھی آئے۔ طلبہ کی بڑی بڑی جماعتیں ترتیب دے کر میں پڑھاتا اور ۱۵ ر شعبان کو گھر آیا۔ حاجی صاحب تورہ قل مرحوم نے کئی خطوط بھیجے کہ آپ پھر تشریف لائیں جتنی تنخواہ آپ لینا چاہیں۔ لیکن میری مجبوری قرض کی ادائیگی دور ہو چکی تھی اس لئے وہاں جانے سے معذرت کی۔

تلامذہ۔ تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ چند مشہور افراد جو معلوم ہو سکے ان کے نام یہ ہیں :-

۱۔ استاذ الکل مولانا عبدالشکور معروف کندیا مولوی صاحب۔ ۲۔ مولانا عبدالغفار صاحب۔ ۳۔ مرحوم مولوی کوہستانی۔ ۴۔ مولانا محمد ہاشم صاحب پنج شیر افغانستان۔ ۵۔ مولانا طالب محمد بدخشانی۔ ۶۔ مولانا محمد شریف کابلی۔ ۷۔ مولانا محمد سلیم بدخشانی۔ ۸۔ مولانا محمد شریف کاما مولوی صاحب۔ ۹۔ مولوی شمد طرہ صاحب۔ ۱۰۔ مولانا عبدالسلام چغرزوی۔ ۱۱۔ مولانا رحیم اللہ صاحب دارالعلوم سوات۔ ۱۲۔ مولانا زردار صاحب دارالعلوم سوات۔ ۱۳۔ مولانا فضل مولی صاحب مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک۔ ۱۴۔ مولانا عبدالرحمن صاحب شیخ الحدیث تعلیم القرآن راولپنڈی۔ ۱۵۔ مولانا عبدالمنان صاحب مینئی مدرس تعلیم القرآن راولپنڈی۔ ۱۶۔ مولانا نقیب احمد صاحب دیروی۔ ۱۷۔ مولانا عبدالحکیم کوہستانی سابق مدرس دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ۱۸۔ مولانا مغفور اللہ صاحب چغرزوی۔

مولانا لطف الرحمٰن سواتی

جامعہ اسلامیہ بہاولپور

برادرِ مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ‘

کافی عرصے سے مراسلت نہیں ہوئی، البتہ ”الحق“ (اقامہ اللہ وادامہ) میں سیرِ بلغ وغیرہ تمام چیزوں کی سیر ہوتی رہتی ہے۔ اس وقت باعثِ تحریر ماہ ستمبر کا اداریہ بعنوان ”ہماری دینی درسگاہیں“ ہے، جس سے ملتا جلتا البلاغ کا اداریہ بعنوان ”علماء کے لیے لمحۂ فکریہ“ بھی ہے۔ اس کے بارے میں چونکہ اکابر علماء اور چند بزرگ علمی ہستیاں اب بھی بحمداللہ ہم میں موجود ہیں، لہٰذا ہماری طرف سے کسی خامی اور خرابی کی نشاندہی یا تجویز و مشورہ تو چنداں مفید نہیں ہے۔ تاہم دردِ دل کا اظہار ہی کر رہا ہوں جس کا آپ نے موقع فراہم کیا ہے، یعنی آپ کے سوالات کے جوابات بالترتیب ذیل میں عرض کرتا ہوں۔

(۱) میرے نزدیک علمی زندگی کے میدان میں کتب اور مصنفین کے تاثر کے سلسلہ میں صرف ان حضرات کے نام لیے جا سکتے ہیں جن کی کتابوں سے درسِ نظامی کا حاوی اور ہمہ گیر خاکہ تیار کیا گیا تھا جن پر دستِ ستم دراز ہے یعنی ایک ایک کر کے سب کو نصابِ تعلیم سے یا تو خارج کیا گیا ہے یا خارج کرنے کے منصوبے اور تجاویز بن رہی ہیں۔ آگے اس مفید اور بنیادی نصابِ تعلیم میں کس کس کا نام لیا جائے۔!
مثلاً علمِ حدیث میں صحت و قوت اور عظیم تر مقبولیت کے لحاظ سے محدث جلیل امام الحدیث محمد بن اسمٰعیلؒ کی جامع صحیح سے لے کر درسِ نظامی کی ابتدائی کتابوں علم الصیغہ، فصولِ اکبری، نور الایضاح، تہذیب اور ایساغوجی وغیرہ تک کون سی کتاب ہے جس کے بغیر نصابِ تعلیم کو مفید کہا جا سکے۔

پھر اس بدایت، ونہایت کے درمیانی عرض و عریض میں قاضی نصر الدین بیضاوی کی تفسیر "انوار التنزیل فی اسرار التاویل" کا ذکر کیا جائے جو کشاف کے محتویات کو صاف اور سلیس کر کے مناسب اور ضروری حذف و ترمیم اور جرح و تعدیل کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ یا فنِ بلاغت اور تعبیر و عبارت کی سلاست و جودت میں علامہ سعد الدین تفتازانیؒ کا اور فنِ منطق میں جلال الدین دوانی اور حمد اللہ سندیلی کا۔ جن کا کلام نہایت صاف ستھرا، مطلب خیز اور جامع و مانع ہے ——— یا سید السند کا نام لیا جائے جن کے علم کا بحرِ ذخار تمام علوم و فنون پر حاوی ہے اور جن کی کتابیں شرحِ مواقف سے لے کر تحو میر تک تمام افید و انفع ہیں اور اس قدر سنجیدہ اور نقاد ذہن کے مالک ہیں کہ خطیب قزوینی کی شرح مفتاح دیکھ کر فرماتے ہیں: اِنَّہٗ کَلَحْمٍ بَقَرٍ عَلَیْہِ ذُبَابٌ[1]

---

[1] فوائد بھیہ مصری ص ۱۲۷

اسی طرح سید زاہد کی دقیقہ سنجی، نکتہ رسی اور علمی دقت وغموض قابلِ داد ہے جن کا ایک حاشیہ دفترِ علوم قرار دیا جا سکتا ہے۔

یا علامہ ابن حاجب کی اختصار پسندی اور وہ بچے تلے جملے جن میں بال برابر حک وفک کی گنجائش نہیں ہے اور متعلقہ قواعد و ضوابط پر مخالیب عقاب کی طرح منتشب اور متکرر ہیں۔

یا عبدالرحمن جامی کے قیود واحترازات یا صدرالشریعہ کا وہ بارعب اور باوقار طرزِ بیان تحریر کیا جائے جن میں کچھ شوشے نکالنے کے لیے علامہ تفتازانی جیسوں کی کوشش ناکام ہو۔

یا محب اللہ بہاری کی دونوں درسی کتابوں کو لے لیا جائے جن میں "سلم العلوم" تو منطق کی کلیات، مسلمات، خلافیات اور بلند و بالا تحقیقات کا ایک شاہکار ہے اور اصولِ فقہ میں "مسلم الثبوت" بھی مسلم الثبوت ہے جس میں محب اللہ نے مسائل خلافیہ، عقلیہ، نقلیہ، کلامیہ، اصولیہ کو تقلید واتباع سے بالا بالا ہو کر "نعاد لہم" اولاً وثانیاً وثالثاً ورابعاً فصاعداً کہہ کر طرزِ استدلال کا ایک عمدہ اور مختصر ڈھنگ نکالا ہے۔

بہر کیف ان مصنفین اور تصنیفات نے نہ صرف مجھ جیسوں کو متاثر کیا ہے بلکہ ان کتابوں ہی کے نصابِ تعلیم سے ماضی قریب کے مرحومین میں محمد قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، محمود الحسن دیوبندی، اشرف علی تھانوی، انور شاہ کشمیری، حسین احمد مدنی، محمد ابراہیم بلیاوی، اعزاز علی امروہی، مفتاح الدین سواتی جیسی ہستیاں بن گئی ہیں (رحمہم اللہ وایانا وجعل الجنۃ مثوانا ومثواہم) اور موجودین میں سے رسول خان ہزاروی، شمس الحق افغانی، محمد شفیع دیوبندی، محمد یوسف بنوری، محمد ادریس کاندھلوی، عبدالحق اکوڑہ خٹک، محمد موسیٰ خان ڈیروی وغیرہ تیار ہوئے ہیں جن کی سندوں میں

درج بالا علماء سابقین اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں اور موجودین تلامذہ کے بالواسطہ اساتذہ ہیں۔ خیر یہ تو ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانچہ حرفِ عصا گفت موسیٰ اندر طور

رہی یہ بات کہ ان محسن کتابوں نے مجھ پر کیا نقش چھوڑے؟ سو وہ یہ کہ ؎

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و نگاہِ ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبین نہ کند بہ کس نگاہے

مطلب یہ ہے کہ اب ہمارے سامنے فجر الاسلام سے لے کر مساء الاسلام تک جدید فکر کی تمام علمی، معلوماتی کتابیں موجود ہیں، لیکن مذکورہ بالا سلسلہ درسِ نظامی کی کتابوں کی قوت و پختگی، جودت و افادیت کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وقت اور معلومات کے لحاظ سے یہ سلسلہ بجائے خود مفید اور نافع ہے۔ اس بارے میں مجھے تو خاص طور پر اس بات سے بھی ایک گونہ کوفت ہوگئی ہے کہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نے کافیہ ابن حاجب کے بدلے نصابِ تعلیم میں اس جدید کتاب کی تجویز یا سفارش فرمادی ہے جس کے مرتبین میں آپ خود بھی شامل ہیں۔

(۲) ایسی کتابوں اور ان کے مصنفین کی خصوصیات کا ذکر تو ہو ہی گیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ کتابیں نصابِ تعلیم کا سنگِ بنیاد ہیں، اور ان مصنفین ہی کے پختہ طرز و طریق سے کسی طالبعلم کی علمی زندگی مضبوط اور وسیع بنیادوں پر استوار ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں علوم و فنون کے قدیم اسفار اور وقتِ حاضر کے جدید انظار و افکار کی حیثیت ثانوی ثالثی، رابعی و ہلم جرّا ہے، گویا علمی میدان کے پھیلاؤ سے صحیح طور پر مستفید اور مستفیض ہونا انہی بنیادی کتابوں کا مرہونِ منت ہے۔ اور یہی میری نظر میں ان کتابوں کی خصوصیت اور امتیاز ہے۔

(۳) مجلات اور جرائد میں سے شغف تو الحق، بینات، البلاغ، دارالعلوم دیوبند کا عربی جریدہ دعوۃ الحق وغیرہ اسی طرح کے دینی، علمی معلوماتی جرائد و رسائل سے ہے۔ خدام الدین اور بعض دیگر رسائل پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالتا ہوں۔ اردو ادب اور زورِ بیان کی سیر کی خاطر چٹان، فاران اور چیدہ دلچسپ معلومات کیلئے اردو ڈائجسٹ بھی (لا بالالتزام) دیکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قارئینِ جرائد میں سے جن کا ذہن دین و مذہب اور علومِ نبوّت سے وابستہ ہوگا تو اس کے معیار پر مذکورہ بالا جرائد ہی پورے اتریں گے ؎

خیال اپنا اپنا پسند اپنی اپنی

(۴) میں اپنی تعلیمی زندگی میں دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں سے حضرت مولانا اعزاز علیؒ نیز مدرسۂ عالیہ رامپور کے پرنسپل امام المعقولات مولانا فضل حق صاحبؒ اور اسی طرح شیخ العرب والعجم علامہ مدنیؒ سے بہت متاثر رہا ہوں۔ جن میں سے طلباء کی تعمیر و تربیت، ہر نقل و حرکت، گفتار و کردار پر سخت مصلحانہ، مربیانہ احتساب اور ساتھ ہی محنتی اور قابل طلباء سے بے پناہ محبت و شفقت کا پیکر تو اوّل الذکر ہی تھے۔ جہاں ثانی الذکر نہایت بلند دماغ، ظریف الطبع اور علمی بلند و بالا اور مختصر تعبیر و تشریح میں طلباء کے لیے ایک زبردست جذب و کشش اور شوق و وجد کے مالک تھے۔ امورِ عامہ، شمس بازغہ وغیرہ متعلقہ دروس میں جہاں کوئی خاص نکتہ بیان فرماتے تو ہر شریکِ درس سے پوچھ کر اس کا مبلغ ذہن معلوم فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا یہ معمول شرکاءِ درس میں علمی مسابقت و مبارزت اور ان کے علمی نشوونما کے سلسلہ میں ایک ارتقائی عمل ثابت ہوتا تھا۔ اور ثالث الذکر تو باوجود اس قدر ارفع و اعلیٰ مقام اور فیاض طبیعت کے مالک ہونے کے باوجود طلبہ کی اخلاقی اور تنظیمی خامیوں کے بالکل روادار نہ تھے۔ چنانچہ طلبہ کی بظاہر معمولی قسم کی غلطی اور فروگذاشت پر

سال دو سال یا ہمیشہ کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ سے محروم کرنا ان کے خصوصی مشہور فیصلہ جات ہیں۔

(۵) میرے خیال میں وقتِ حاضر کے جدید حوادث و نوازل کے مقابلہ یا استیصال کے لیے ماضی قریب اور حال کے علماء امت میں سے بالترتیب علامہ سید محمود آلوسیؒ کی روح المعانی، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصنیفات اور بعد ازاں ان کے خلفاء صالحین و صادقین اکابر علماء دیوبند میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی اور جناب قاری محمد طیب صاحب وغیرہم کی تصانیف کا مفید اور کارآمد ہونا ظاہر ہے، جن میں سے ہر ایک ؏

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کے مصداق اور مجموعی طور پر "لا یزال طائفۃٌ من اُمتی منصورین لا یضرّھم من خذلھم حتّٰی تقوم الساعۃ" کے سچے نمونے تھے۔

(۶) متذکرہ فتنوں میں سے بعض کا پس منظر خدا اور رسولؐ اور شرع و اسلام سے بیزاری اور بعض کا عداوت اور دشمنی ہے۔ پھر اس بیزاری یا عداوت کا ردِ عمل ہی یہ تحریفی، الحادی اور تجددی فتنے ہیں جن سے نمٹنے کے لیے بحمداللہ تعلیماتِ دین میں ہر طرح کا سامان اور کتابیں موجود ہیں۔

انکارِ حدیث، عقلیت، اباحیت کا تو کوئی قوی مستدل نہیں ہے۔ قادیانی دھرم بھی دلیل و حجت کے لحاظ سے کچھ واہی تباہی قسم کا زندیقانہ مالیخولیا ہے۔ بہرکیف بعض فتنوں کے بعض مواد کے لیے مقدمہ تفسیر حقانی معلومات افزا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی کتاب عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" اور "اکفار الملحدین" وغیرہ اپنے اپنے مقصد میں اقوی و اوقع ہیں۔ تجدد اور مغربیت کے لیے تو "اقبالیات" کا متعلقہ حصہ بھی نہایت کارآمد ہے۔ "لوہے کا

توڑ ہو ہی ہو سکتا ہے۔"

ماڈرن ازم تو امتِ مسلمہ کے جدید طبقہ کے لیے ایک ذہنی، تمدنی بلکہ اقتصادی اور معاشی ہر طرح سے ایک وبا بھی ہے، جس کے سدِّباب علمی احتساب کے لیے مذکورہ بالا دینی علمی پاکیزہ جرائد و رسائل نیز علماء حقانیین کا قیمتی لٹریچر کافی موجود ہے، اور اگر بعض بے جا تنقید و تنقیص اور غیر ضروری مشاجرت و منافرت سے قطع نظر کیا جائے تو مولانا مودودی صاحب کا قلم بھی بعض فتنوں کے لیے کاری ضرب کا کام دیتا ہے۔ مگر افسوس کہ موصوف کو مذہب سے زیادہ اپنی سیاست یا سیاسی موقف سے دلچسپی ہے، خاص کر علماء حقانیین یعنی علماء دیوبند سے تو اس تحریک کے اصاغر و اکابر کو نفرت اور بدظنی ہے۔

(۷) سائنسی اور معاشی مسائل میں صحیح ترجمانی کرنے والی کتابوں سے میرا کوئی خاص لگاؤ نہیں رہا ہے۔

(۸) نصابِ درس کے سلسلہ میں میرا مؤقف واضح ہو گیا ہے، وہ یہ کہ میں مدارسِ عربیہ کے نصاب کے لیے صرف اور صرف پرانے مجوزہ درسِ نظامی کا قائل ہوں، اسی کو مفید تر اور اتم و احکم سمجھتا ہوں اور اس میں فنی، کتابی، کلّی، جزوی کسی طرح کے ردوبدل اور حذف و ترمیم کا روادار نہیں ہوں، پھر میں اپنے اس مؤقف کے ہوتے ہوئے نصابِ تعلیم میں تبدیلیوں کا مشورہ کیونکر دے سکتا ہوں۔ بلکہ نصاب میں کی گئی تبدیلیوں کے خلاف بھی میرا سخت احتجاج ہے، مگر کون سنتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک روز جب حضرت الاستاذ جناب علامہ افغانی صاحب دامت برکاتہم محکمہ اوقاف کی طرف سے اس کمیٹی میں لاہور بلائے گئے جو ہر سال درسِ نظامی میں قطع و برید اور حذف و تخفیف کرتی ہے۔

تو میں نے حضرت کو ایک مسٹر صاحب کی پتلون کا قصہ سنایا، جبکہ وہ

مناسب مقدار سے کچھ لمبی بنی ہوئی تھی اور صبح کو جب مسٹر صاحب دفتر جانے لگے تو اہلیہ صاحبہ سے کہا کہ یہ میری نئی پتلون کچھ لمبی ہے میں اس کو آج چھوڑ رہا ہوں، گھر کی مشین سے اس کو چار انگل کم کر دیجئے گا۔ اہلیہ صاحبہ نے انکار کیا اور کہا کہ میرے پاس وقت نہیں ہے، گھر سے نکلتے وقت اپنی ایک لڑکی سے کہا، اس نے بھی انکار کیا۔ راستہ میں اپنا ایک نوکر ملا وہ بھی مشین پر کام کرنا جانتا تھا لیکن اس نے بھی بہانہ بنا کر ٹال دیا۔

خیر مسٹر صاحب مایوس ہو کر چلے گئے، واپسی پر شام کو کسی سے بات بھی نہ ہوئی۔ آئندہ صبح کو جب دفتر جانے لگا تو سوچا نئی پتلون ہے، کچھ لمبی ہی سہی، کم کرنے کی تو کسی نے زحمت نہ کی، چلو پہن کر دفتر چلتا ہوں۔ جب پہننے لگا تو وہ گھٹنوں تک چڑھ چکی تھی، کیونکہ جس جس سے کم کرنے کو کہا تھا ان میں سے ہر ایک نے انکار کے باوجود چار چار انگل کی کمی کر دی تھی اور ایک دوسرے سے بے خبر تھے۔

حضرت الاستاذ خود بھی فرما رہے تھے کہ یہ تو علم کو ختم کرنا ہے، بلکہ بعد میں فرمایا کہ میں نے نصابِ تعلیم سے علمی بنیادی کتابوں کے نکالنے کی سخت مخالفت کی تھی۔ بہرصورت قصہ یہی ہے کہ علم ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے کہ جن کا مقصدِ زیست علم کا حلیہ ہی بگاڑنا ہے۔ فالی اللہ المشتکی

میرا یہ احتجاج اس وجہ سے ہے کہ اگر مدارسِ عربیہ کے طلباء کو نصابِ تعلیم کے ذریعہ وقتِ حاضر کے تمام مذہبی اور مادی و معاشی علوم سے مکمل طور پر روشناس کرانا ہے تو یہ تو تقریباً ناممکن ہے۔ نیز ان علوم کے ہر ہر شعبہ کے لیے جداگانہ تعلیم گاہیں موجود ہیں، پھر یہ کہ بعض علوم کے کسب و تحصیل کی راہیں بعض دوسروں سے مختلف بلکہ کسی حد تک متضاد ہیں۔

چنانچہ اس لحاظ سے مدارسِ عربیہ کے طلبا کو اگر بیک وقت اچھا مدرس، مصنف، عالم اور ساتھ ہی مسائلِ حاضرہ اور فنونِ رائجہ کا پورا ماہر اور سٹیج کا بھی بادشاہ بنانا ہو جو زمین و آسمان کے قلابے ملا سکتا ہو تو یہ تو ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

اور اگر ان درسگاہوں کی روایات اور بنیادی مزاج کے تقاضوں میں علماً مدرسین، مصنفین، مبلغین، مقربین، متقین اور صالحین تیار کرنے ہیں تو پھر نصابِ تعلیم کے لیے وہی درسِ نظامی صرف مناسب نہیں بلکہ لازم اور ضروری ہے۔

دراصل درسِ نظامی کا مجوزہ قدیم خاکہ ہی تمام علوم و فنون کی ان بنیادی کتابوں سے تیار کیا گیا ہے جن کے بغیر عالم کامل بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میرے اس جمود و قدامت کی تائید و تقویت دار العلوم دیوبند کے اس نصابِ تعلیم سے بھی ہوتی ہے جو میرے سنِ فراغت (۱۳۵۷ھ) میں ۸۳ عدد کتابوں پر مشتمل تھا اور روزانہ ان کتابوں کا درس ہوا کرتا تھا۔ ان میں شفا، شرح اشارات، تحریرِ اقلیدس، خلاصۃ الحساب، سبع شداد، بست باب، شمسِ بازغہ، عروض المفتاح، رسم المفتی، میر قطبی، رشیدیہ مناظرہ وغیرہ ہر طرح کی چھوٹی موٹی کتابیں داخلِ نصاب تھیں۔ جبکہ اس وقت پاکستان کے بالائی مدارس کے نصاب میں روزمرہ پڑھائی جانے والی کتابوں کا شمار شاید تیس ۳۰ تک مشکل ہی پہنچتا ہو۔ ع

ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا

ھٰذا والسلام و بالسلام الاختتام

عبدالقیوم حقانی

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا جب ابتدائی مجوزہ نصابِ تعلیم ۱۴۰۲ھ میں شائع ہوا اور بعض مدارس میں جاری کر کے اس کا تجربہ بھی کر لیا گیا تو اُس وقت ایک طبقہ مُصر تھا کہ دینی مدارس آنکھیں بند کر کے اسے جوں کا توں قبول کریں، جبکہ دوسری جانب علمی حلقوں کے ردِ عمل کے نتیجے میں "وفاق" نے نصاب کی تشکیلِ جدید کے لیے ایک نئی ۲۱ رکنی کمیٹی منتخب کی ـــــ مادرِ علمی دار العلوم حقانیہ اور محدّثِ کبیر شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی جانب سے بطور نمائندہ کے احقر کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔ ایسے حالات میں ضروری تھا کہ مجوزہ نصاب اور مروج درسِ نظامی کا تقابلی جائزہ، دیانتدارانہ تجزیہ اور ایک علمی و تحقیقی تبصرہ کر دیا جائے تاکہ ذمہ دار علمی حلقے اور نمائندہ نصاب کمیٹی

ایک مثبت اور نتیجہ خیز قدم اٹھانے میں کامیاب ہو ——— احقر نے ذیل کا مقالہ اس مقصد کے لیے لکھا تھا جسے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق نوراللہ مرقدہٗ اور اکابر علماء نے پسند کیا۔ وفاق المدارس کے مجوزہ اجلاس سے قبل جامعہ خیر المدارس ملتان میں جب شیخ الحدیث حضرت العلامہ مولانا محمد شریف کشمیری سے ملاقات ہوئی تو وہ بیحد خوش ہوئے اور اوائل وہلہ میں یہی ارشاد فرمایا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ اس طرز کی تحریر لکھ کر ذمہ داران وفاق کی توجہ مبذول کرادی جائے، مگر آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ میرے تخیل اور طرز ادا سے کہیں بہتر ہے اور اپنے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے ——— وفاق المدارس کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا مفتی محمد انور شاہ صاحب مدظلہٗ نے مرکزی دفتر کی جانب سے اس کی کاپیاں ملک بھر کی وفاق سے منسلک تمام جامعات میں تقسیم کیں۔ بعض دینی جرائد نے بڑی اہمیت سے اسے شائع کیا۔ مرکز علم دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ماہنامہ "دارالعلوم" نے بھی "الحق" سے نقل کر کے جولائی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں خصوصیت سے جگہ دی۔ نصاب تعلیم، انتخاب کتب، ذوق مطالعہ، طرز تدریس اور مطالعہ و استفادہ سے متعلق ہونے کے پیش نظر شامل ھٰذا ہے ——— اسی مضمون کو ملحوظ رکھ کر اپنی ایک دوسری تحریر بعنوان "فضلائے مدارس عربیہ اور جامع منصوبہ بندی کی ضرورت" کو بھی شریک ھٰذا کیا جا رہا ہے جو اس سے قبل ماہنامہ "الحق" کی جولائی ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں شائع ہو چکی ہے۔ (عبدالقیوم حقانی)

درس نظامی ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایاں لفظ ہے۔
سہالی نامی ایک گاؤں جو لکھنؤ سے کوئی بتیس میل کے فاصلہ پر ہے اور جس نے آگے چل کر

فرنگی محلی کا لقب اختیار کیا) میں ملّا نظام الدین نے قیام اختیار فرمایا جو رفتہ رفتہ ایک عظیم مدرسہ اور زندہ کالج کی شکل اختیار کر گیا جہاں ملّا نظام الدین کے فیض کا بادل شب و روز برستا رہا چنانچہ آپ کے گرد استفادہ کرنے والوں کی ایک کثیر جماعت جمع ہو گئی۔

شب و روز میں جس وقت بھی جو کچھ بولتے تھے وہی اُن کا علمی لیکچر ہوتا تھا۔ ان کی حرکات و سکنات، وضع قطع اور طور طریقے سارے خاموش لیکچر تھے۔ تلامذہ اور افادہ کا حلقہ وسیع ہوتا چلا جا رہا تھا اور طلباء علوم و معارف کی دولت سے مالا مال ہو رہے تھے۔

دہلی اور لکھنؤ اگرچہ دارالسلطنت اور پایۂ تخت تھے مگر علمی فیض رسانی کی وجہ سے سہالی کو بجا طور پر دارالسلطنت سے ہمسری کرنے کا دعویٰ کرنے کا حق حاصل تھا جس کے پرتوِ فیض سے نہ صرف ایشیا بلکہ آج پوری دُنیا روشن اور مستنیر ہے۔

جب سہالی درسگاہ کے فیضیافتہ ملکوں ملکوں پھیلنے لگے تو دُنیا ثمر کو دیکھ دیکھ کر درخت کو بھی پہچاننے لگی اور ملّا نظام الدین کا شہرہ چار دانگِ عالم میں پھیل گیا ــــــ ابوالمعالی نامی ایک ایرانی فاضل ملّا نظام الدین کی علمی عظمتوں کا شہرہ سُنکر ملاقات کے لیے جب سہالی آیا تو دیکھا کہ ملّا صاحب اپنی درسگاہ میں چٹائی پر بیٹھے درس دے رہے ہیں۔ چونکہ ابوالمعالی نے ایرانی علماء کا جاہ و جلال دیکھا تھا اس لیے چٹائی پر بیٹھے ہوئے سبق پڑھانے والے ملّا نظام الدین کی طرف اس کا خیال بھی نہ جا سکا، پوچھا: "مولانا نظام الدین کہاں تشریف رکھتے ہیں"؟

آپ نے فرمایا: "مولانا کا حال تو میں نہیں جانتا البتہ نظام الدین میرا ہی نام ہے۔" پھر ایرانی فاضل نے آپ سے اوّلاً مذہب شیعہ کی روایات اور مسائل دریافت کیے اور پھر اہل سُنّت کے مسائل و روایات پوچھے، آپ نے تسلی بخش جواب دیئے تو ایرانی فاضل آپ کی تقریر اور علمی بحث سے بے حد متاثر ہوا اور عش عش کر اٹھا۔

ملّا نظام الدین نے کثیر تصنیفات بھی لکھی ہیں، مثلاً شرح مسلم الثبوت، صبح صادق، شرح

حاشیہ صدرا، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ برحاشیہ قدیمہ ۔ لیکن ملا صاحب کی شہرت ان تصنیفات سے کم اور اپنے مخصوص طریقۂ درس کی بدولت زیادہ ہوئی ہے۔ آپ کے حلقۂ درس سے بحر العلوم علامہ عبدالعلیٰ ملا کمال (جن کے دامنِ فیض میں حمداللہ جیسے یگانۂ روزگار نے تربیت حاصل کی ہے اور جن کی شرح مسلم نظامِ تعلیم میں باقاعدہ طور پر داخل ہے) جیسے عالم فاضل اور ماہر اساتذۂ فن پیدا ہوئے، ملا حسن کو بھی آپ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ غیر منقسم ہندوستان میں دو سو سال سے علوم و معارف کے گلشنوں میں جو بہاریں نظر آتی ہیں اور رنگ برنگے پھول کھلے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ملا نظام الدین اور آپ کے باکمال تلامذہ نے اپنا پسینہ اور خون نچوڑ کر اس کی آبیاری کی ہے۔ خدا کرے کہ اہلِ گلستان اس کی آبروؤں کی لاج رکھ سکیں ؎

گلوں کی آبرو لٹتی ہے لیکن کچھ نہیں کہتے
خدا جانے کہ غیرت کیا ہوئی اہلِ گلستاں کی

آج جہاں کہیں بھی علومِ عربیہ کا نشان باقی ہے یہ درحقیقت ملا نظام الدین اور آپ کے باکمال تلامذہ کا پرتوِ فیض ہے۔ ہندوستان کے جس شخص نے بھی تحصیلِ علم کا احرام باندھا اُس کا رُخ درسِ نظامی ہی کی طرف رہا، تب کامیاب ہوا جب درسِ نظامی کی تکمیل کی۔ افسوس کہ اب اس کعبہ کو بھی ویران کیا جا رہا ہے۔

درسِ نظامی سے پہلے ہندوستان کے علماء کی ایک تصنیف بھی داخلِ نصاب نہ تھی، ملا نظام الدین نے ہندوستان میں اپنے معاصر علماء کی اہم تصنیفات داخلِ درس کر دیں مثلاً سلم، نورالانوار، مسلم، رشیدیہ، شمس بازغہ وغیرہ۔ یہ کارنامہ آپ کی انصاف پرستی

لے علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ: "درحقیقت ہندوستان کی خاک سے کوئی شخص اس جامعیت کا شروع اسلام سے آج تک پیدا نہیں ہوا۔" (عبدالقیوم حقانی)

اور بلند حوصلگی کا بڑا ثبوت ہے، علماء میں یہ چیز بہت کم پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے معاصرین کی علمی برتری کا اعتراف کریں، مگر ملا صاحب نے اپنے وقت کے باکمال علماء کی عزت کی اور ان کی کتابیں داخل درس کر دیں جبکہ اپنی کسرِ نفسی کا یہ عالم تھا کہ اپنی کوئی تصنیف بھی نصاب میں داخل نہ کر سکے۔ اس حاوی اور ہمہ گیر نصابِ تعلیم میں سب سے زیادہ اہم اور مقدم خصوصیت جو ملا نظام الدین اور آپ کے باکمال تلامذہ کے پیشِ نظر رہی یہ تھی کہ "اس نصاب کے پڑھنے والوں میں قوتِ مطالعہ اس قدر قوی ہو جائے کہ نصاب کی تکمیل کے بعد طالب علم جس فن کی جونسی کتاب بھی چاہے بآسانی سمجھ سکے۔

علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ:۔

"اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ درسِ نظامی کی کتابیں اگر اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں تو عربی زبان کی کوئی کتاب لاینحل نہیں رہ سکتی، بخلاف درس قدیم (درسِ نظامی سے قبل) کے، اس سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی تھی"

درسِ نظامی کے روشن اور تاریخ ساز اور آدم گر نصابِ تعلیم اور دو سو سالہ تجربات کے آئینہ میں بغیر کسی ریب و تردد کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ درسِ نظامی کا فاضل اور فارغ التحصیل مشکل سے مشکل نظریہ اور جدید علوم کو سمجھنے کی پوری صلاحیت اور قابلیت رکھتا ہے۔ مثلاً بطلیموسی یا فیثاغورثی علمِ ہیئت سمجھنے والا آج بھی یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ محض مطالعہ سے جدید ہیئت و جدید فلسفہ اور سائنس کو سمجھ لے۔ کیا شرح چغمینی، صدرا، شمس بازغہ اور شرح اشارات سمجھنے والا یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ جدید طبیعات و ریاضیات کی کتابوں کو سمجھ سکے؟

درسِ نظامی کی دوسری خصوصیت علامہ شبلی نعمانی نے یہ بیان فرمائی ہے کہ:۔

"درسِ نظامی کو قدیم نصاب پر اس لیے ترجیح حاصل ہے کہ ایک متوسط الذہن طالبعلم سولہ سترہ برس کی عمر میں تمام کتبِ درسیہ سے فارغ ہو سکتا

ہے، چنانچہ علماء فرنگی محل میں اکثر اتنی ہی عمر میں فارغ ہو جاتے ہیں"۔
علامہ شبلی نعمانی تیسری خصوصیت یہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اس نصاب میں جس قدر فقہ کی کتابیں رکھی گئی ہیں ان میں معقولی استدلال سے کام لیا گیا ہے، اس لیے اس نصاب سے وہ تقشف، ظاہر پرستی اور مذہب کا بے جا تعصب پیدا نہیں ہوتا جو سطحی فقہاء کا ہوتا ہے"۔

درسِ نظامی جس پر آج دستِ ستم دراز ہے اور ایک ایک کر کے سب کتابوں کو یا تو نصابِ تعلیم سے خارج کر دیا گیا ہے یا خارج کرنے کے منصوبے اور تجاویز بن رہی ہیں۔ اس مفید اور بنیادی نظامِ تعلیم کی کس کس کتاب کا نام لیا جائے! علمِ حدیث میں صحت و قوت اور عظیم تر مقبولیت کے لحاظ سے محدثِ جلیل امام الحدیث محمد بن اسمٰعیلؒ کی جامع صحیح بخاری سے لے کر درسِ نظامی کی ابتدائی کتابوں علم الصیغہ، فصولِ اکبری، نور الایضاح، تہذیب اور ایساغوجی وغیرہ تک کونسی کتاب ہے جس کے بغیر نصابِ تعلیم کو مکمل کہا جا سکے۔

علامہ قاضی ناصر الدین بیضاویؒ کی تفسیر "انوار التنزیل فی اسرار التاویل" جو کشاف کے محتویات کو صاف اور سلیس کر کے مناسب اور ضروری حذف و ترمیم اور جرح و تعدیل کے بعد مرتب کی گئی ہے، کو خارج کر کے (وفاق کے مجوزہ نصاب میں اسے خارج کر دیا گیا ہے) یہ توقع عبث ہے کہ طلباء میں اعجاز قرآنی اور تفسیر کشاف کو سمجھنے کی صلاحیت و استعداد پیدا ہو جائے۔ فنِ بلاغت اور تعبیرِ عبارت کی سلاست و جودت میں علامہ سعد الدین تفتازانی اور فنِ منطق میں جلال الدین دوانی اور حمد اللہ سندیلی کے مقابلہ کی وہ کون سی چیز ہے جو مجوزہ نصاب میں رکھی گئی ہو اور یہ بتایا جا سکے کہ یہ ان کا متبادل ہے ____

درسِ نظامی میں سید السند کو لیں جن کے علم کا بحرِ ذخار تمام علوم و فنون پر حاوی ہے، شرح مواقف سے لیکر نحو میر تک ان تمام کی تمام کتابیں افید و انفع ہیں، آپ اس قدر نقاد ذہن کے مالک ہیں کہ خطیب قزوینی کی شرح مفتاح دیکھ کر فرمانے: انہ کلحم بقر علیہ ذباب۔

اب کس کس کتاب کا رونا رویا جائے۔ نحو میر اور اس کی جاندار مختصر مگر پُرشکوہ عبارت، میزان الصرف، صرف میر، علم الصیغہ، مراح الارواح اور فصولِ اکبری اور اس کی خاصیات اور درسی خصوصیات سے طلبہ کے اندر جو ملکہ، علمی رسوخ اور پختگی حاصل ہوتی ہے کیا مولانا مشتاق احمد کے اردو رسائل "علم النحو" اور "علم الصرف" سے یہ کمالات حاصل کیے جا سکتے ہیں؟ یا یہ کہ ان اردو کے رسائل کو مذکورہ کتابوں کا متبادل قرار دیا جا سکتا ہے؟ اور اگر ایک مدرسہ میں مذکورہ ساری کتابیں پڑھائی جا رہی ہوں اور دوسرے میں صرف اُردو کے دو رسائل، تو کیا دونوں کو ایک برابر سند دینا علمی صلاحیتوں کا خون کر دینے کے مترادف نہیں؟

مجوزہ نصاب میں اس بات کی اجازت دے دی گئی ہے کہ اگر مدارس چاہیں تو مولانا مشتاق احمد کے اردو علم الصرف کو درسِ نظامی کے تمام صرفی نصاب کے متبادل اختیار کر سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ اردو رسائل اس مختصر نصاب میں شامل ہونا چاہئیں جن کو درسِ نظامی کی تحصیل نہیں بلکہ عدیم الفرصتی کی بنا پر صرف عربی علوم سے مناسبت کے لیے دو تین سال صرف کر کے طلباء پڑھنا چاہیں، انسب بھی یہی ہے۔

تحقیق و تدقیق، سوال و جواب اور تشحیذ اذہان جو درسِ نظامی کے مزاجی خصوصیات سے ہے، ان ہی خصوصیات کے بقاء و تحفظ اور استحکام کے لیے علامہ عبدالحئی لکھنوی نے بھی ضرورت محسوس کی اور معلمین کو دورانِ درس، درسِ نظامی کا مخصوص اندازِ تدریس اپنانے کے لیے "التبیان" کے نام سے میزان الصرف تک کی شرح تحریر فرمائی۔

علامہ ابن حاجب کی اختصار پسندی اور جچے تُلے جملے جن میں بال برابر حک و اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن جامی کے قیود و احترازات یا صدر الشریعہ کا بارعب اور باوقار طرزِ بیان جس میں کچھ شوشے نکالنے کے لیے علامہ تفتازانی جیسوں کی کوششیں بھی ناکام رہیں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جس سے طلبہ کی ذہانت بڑھتی اور ملکہ منجھتا ہے۔ حیرت

ہوئی تو اس بات پر کہ مجوزہ نصاب سے شرح جامی (دینیات) بھی خارج کردی گئی ہے۔
فیا للعجب ــــ اور اس کا نعم البدل کچھ بھی نہیں، اور وہ کونسی چیز ہو سکتی ہے جسے
اس کا نعم البدل قرار دیا جاسکے۔

علامہ محب اللہ بہاری کی دونوں درسی کتابوں کو لے لیا جائے جن میں سلم العلوم تو منطق کی کلیات مسلمات خلافیات اور بلند و بالا تحقیقات کا ایک شاہکار ہے ــــ اور اصول فقہ میں مسلم الثبوت بھی مسلم الثبوت ہے جس میں علامہ محب اللہ بہاریؒ نے مسائل خلافیہ، عقلیہ، نقلیہ، کلامیہ اور اصولیہ کو تقلید و اتباع سے بالا بالا ہو کر "تعادلہم" اولی وثانیاً وثالثاً ورابعاً فصاعداً کہہ کر طرز استدلال کا ایک عمدہ اور مختصر ڈھنگ نکالا ہے۔

وفاق کے مجوزہ نصاب میں منطق و فلسفہ اور تمام معقولات کو چھٹی دے دی گئی ہے۔ قطبی تک جو منطق نظر آتی ہے کیا اسے پڑھ لینے کے بعد واقعۃً بھی طالب علم منطق کے مصطلحات سے آشنا ہو جاتا ہے؟ میرے نزدیک قطبی پڑھنے والا منطق کا مبتدی طالب علم ہے۔ ابھی اس نے منطق کے ابجد پڑھنا شروع کیے ہی تھے کہ مجوزین نے کامل سمجھ کر دروازہ ہی بند کر دیا۔ مجوزہ نصاب سے میبذی بھی خارج ہے البتہ شرح عقائد کو بدستور رہنے دیا گیا ہے مسلم الثبوت کا ایک حصہ بھی باقی رکھا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ جس نے صرف قطبی تک منطق پڑھی ہو، سلم العلوم اور ملا حسن اور صدرا اور شمس بازغہ وغیرہ سے محروم رہا ہو جیسا کہ مجوزہ نصاب نے محروم کر دیا ہے تو ایسے طالب علم کو مسلم الثبوت اور شرح عقائد اور ان کے منطقی استدلالات[1]، قضایا اور نتائج کیسے پڑھائے اور سمجھائے جائیں گے؟ بھلا وہ کیا سمجھے گا؟ چاہیے تو یہ تھا کہ نصاب تعلیم کو اس قدر جاندار

---

[1] مسلم الثبوت کو علامہ بہاری نے منطقی انداز میں تحریر فرمایا ہے، مقالہ اولیٰ میں لکھتے ہیں: ومنها المنطقیه لانهم جعلوه جزء من الکلام وقد فرغنا عنها فی السلم۔

بنایا جائے کہ اسلاف کے علوم و معارف سے وابستگی مضبوط اور علمی سلسلہ مربوط ہو، مگر مجوّزہ نصاب میں جو راستہ اختیار کیا گیا ہے اس سے امام رازیؒ اور امام غزالیؒ سے نوکٹ کر رہ گئے امام الہند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا نہ ہو سکے گی۔

درسِ نظامی کا ایک خاص مزاج یہ ہے کہ خالص علوم یعنی قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم میں ذہانت، جودت، ذکاوت اور تحقیق و گہرائی پیدا کرنے کے لیے طلباء کی دماغی صلاحیتوں کو خوب اُبھارا جاتا ہے اور دماغی ورزشوں والے علوم کے اکھاڑوں میں ان سے کُشتیاں اور مشقی کرتب کرائے جاتے ہیں اور ان کے ذہنوں سے تحقیق و تنقید، تجسس و تدقیق اور بحث و تمحیص اور دماغی بیداریوں کا کام لیا جاتا ہے جس سے غور و فکر کا اعلیٰ ملکہ پیدا ہوتا ہے، یہی وہ چیز ہے جسے درسِ نظامی کی رُوح قرار دیا جاسکتا ہے۔ بقول حضرت الاستاذ شیخنا الکرم شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ (رحمہ اللہ) کے "مجوّزہ نصاب" درسِ نظامی کی اس روح سے یکسر خالی ہے۔ یہ بھی غلط اور بے بنیاد سوال ہے کہ درسِ نظامی کے طالب علم کو عربی ادب پر عبور حاصل نہیں ہو سکتا۔ شیخ الہند علامہ نانوتویؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی عربی دانی کون سے نصابِ تعلیم کی مرہونِ منّت ہے؟ لامع الدراری کے مصنف، کوکب الدری کے مرتب و محشی، فتح الملہم کے مصنف، اوجز المسالک کے مصنف، بذل المجہود کے مصنف و محشی، اعلاء السنن کے مصنف، معارف السنن کے مصنف اور دیگر سینکڑوں عربی کتب و شروح کے مصنفین "درسِ نظامی" ہی کے فاضل اور فارغ التحصیل ہیں۔ بلکہ نزہۃ النظر کا مصنف بھی وہی ہے جس نے تاریخ اور عربی ادب کا ذوق و ملکہ درسِ نظامی ہی سے حاصل کیا ہے۔

آخر جس نصاب میں مفید الطالبین، روضۃ الادب، نفحۃ العرب، نفحۃ الیمن، مقامات، متنبی اور حماسہ کے علاوہ قصیدہ بردہ، قصیدہ بانت سعاد جیسی اہم ادبی و معیاری کتابوں

کو تحقیق و تدقیق سے پڑھایا جائے، ہر لفظ کی تحقیق، ہر صیغہ کی تحقیق، ہر جملہ کی ترکیب بلکہ پڑھاتے وقت الفاظ کے بالوں کی کھال تک اتار دی جائے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے عربی ادب سے محروم رہیں گے؟

البتہ ایک اعتراف ہمیں بھی ہے اور ہم سے پہلوں کو بھی کہ ہمارے ہاں عربی بطور عربی لینگویج کے نہیں پڑھائی جاتی، یہ ایک خامی ہے جس پر غور کیا جا سکتا ہے اور جس کے لیے ایک صحیح اقدام کی ضرورت ہے۔

خلاصہ یہ کہ درسِ نظامی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ طلباء کی استعداد اور صلاحیتوں کو مانجھ مانجھ کر ان کی کایا پلٹ کے رکھ دیتا ہے۔ مستقبل کی تعمیر میں ماضی کے تجربات کو یکسر فراموش کر دینا کوئی دانشمندانہ اقدام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ماضی میں درس نظامی کی اصلاح کے عنوان و تحریک سے جو مختلف مدارس قائم ہوئے تو کیا وہ کوئی انقلاب برپا کر سکے؟ ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ الٰہیہ کانپور، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن، جامعہ اسلامیہ دہلی، جامعہ عباسیہ بہاولپور، ان سب چوٹی کی درسگاہوں کو جو درس نظامی کی اصلاح کی تجربہ گاہ بنایا گیا، کیا اس کے مفید اور انقلاب انگیز نتائج کی نشاندہی کی جا سکتی ہے؟ کیا بتایا جا سکتا ہے کہ وہ زندگی میں کوئی مفید اور کامیاب انقلاب برپا کر سکے ہوں؟ خود سید سلیمان ندویؒ کی زندگی میں جو انقلاب آیا یا آج سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کو جو عظمتیں حاصل ہیں اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ان حضرات نے درسِ نظامی کے فضلاء میں سے اپنے ربط و تعلق کو اتنا مربوط اور مضبوط کیا کہ دوسرا پہلے کی علامت بن کر رہ گیا۔

ضرورت نصاب کے بدلنے کی نہیں بلکہ جزوی اصلاح کی ہے۔ یکسر نصاب کو پلٹ کر رکھ دینا اسلاف کی کاوشوں پر پانی پھیر دینے کے مترادف ہے۔ بڑا دکھ پہنچا کہ مجوزہ نصاب میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمود الحسنؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے دورۂ حدیث کو

بھی توڑ دیا گیا ہے ؏

جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

اگر اس طرح راستہ کھول دیا گیا تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آئندہ اخلاف اس کا حلیہ اور کیا بگاڑیں گے؟

حضرت العلامہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ جن کی ساری زندگی درس نظامی سے وابستہ رہی یہی پڑھتے اور پڑھاتے رہے۔ ہر فن اور ہر کتاب کے بارے میں اُن کی رائے کو بلا ریب قولِ فیصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ افسوس کہ سید ابوالحسن علی ندوی جیسے یگانۂ روزگار بھی نصابِ تعلیم سے متعلق حضرت شیخ الحدیثؒ کے نظریہ کو اپنی تالیف سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا" میں جگہ نہ دے سکے۔

حضرت شیخ الحدیثؒ آپ بیتی ص۲۱۱ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اسی طرح یہ ناکارہ تبدیلِ نصاب کا بھی سخت مخالف ہو گیا......
اپنی ابتدائے مدرسی میں تو تبدیلِ نصاب کا خبط مجھ پر بھی سوار تھا، شطرنج کے کھلاڑیوں کی طرح میرا دماغ دن رات ان ہی میں گھومتا رہتا تھا......
لیکن جوں جوں تدریس کا زمانہ یا تجربہ بڑھتا رہا تبدیلِ نصاب کا خبط میرے دماغ سے نکلتا رہا۔ ایک دو کتاب کا تغیر علومِ آلیہ میں ہو جائے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں لیکن فقہ، اصولِ حدیث و تفسیر اور علومِ آلیہ کی اہم کتب کافیہ، شرح جامی جیسی کتب میں تغیر کا بالکل قائل نہیں...... بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزی نصاب کے آئے دن کے تغیرات دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ اگر مدارسِ عربیہ میں بھی یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور ہر دس بارہ برس کے بعد نئی نسل اپنی جولانیاں دکھانی شروع کرے گی تو یہ نصاب رفتہ رفتہ وہ شیر بن جائے گا جس کی تصویر کسی نے اپنی کمر پر گُدوانی چاہی تھی لیکن دُم، ہاتھ پاؤں

ناک، کان اور ہر ایک کے بنانے میں جو تکلیف ہوئی تو وہ یہ کہہ کر انکار کرتا رہا کہ بقیہ دم کے بغیر بھی شیر ہوتا ہے اور بغیر ہاتھ کے بھی تو شیر ہوتا ہے۔(۲) ہر محقق اور با اثر یہ چاہے گا کہ اس کی تصنیف ضرور داخل نصاب ہو جس کی نظیریں اپنی ابتدائی مدرسی سے لے کر اب تک خوب دیکھیں لیکن درسِ نظامی کو اللہ نے وہ مقبولیت عطا فرمائی ہے کہ اس میں عمومی کھپت کی گنجائش نہیں رہی۔(۳) مروّج نصاب کے شروح و حواشی ضرورت سے زیادہ لکھے گئے متبدل نصاب کی اتنی خدمت کرنے والے میرے خیال میں اب پیدا نہیں ہوں گے!!

لیجیے حضرت العلامہ مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہٗ کی رائے گرامی بھی سنتے جائیے، فرماتے ہیں کہ :-

"ڈھاکہ میں علماء کرام کا اجلاس تھا، عصری علوم کا نصاب مروّجہ کے ساتھ جوڑ کا مسئلہ زیرِ بحث تھا........ میرے دل میں بھی اُس وقت یہ خیال آیا کہ علوم عصریہ کو داخلِ نصاب کرنے میں کیا حرج ہے ...... رات کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ ایک مسجد میں کھڑا ہوں اور سامنے چٹائی بچھی ہے اور اس میں یہ عبارت بُنی ہوئی ہے "النجاۃ فی علوم المصطفیٰ" ــــ اور فرمایا کہ اس خواب میں پھر میں دونوں کانوں میں انگلیاں ڈال کر پوری قوت کے ساتھ ان کلمات کے ساتھ اذان دیتا ہوں "النجاۃ فی علوم المصطفیٰ سید السادات" آخری دو کلمے "سید السادات" میں نے خود بڑھائے ہیں۔ فرمایا کہ صبح جاگنے کے بعد دل میں سے خیال نکل گیا اور یقین ہو گیا کہ اس دور میں بھی صرف علم نبوت سے کامیابی ممکن ہے، عصری علوم کا جوڑ بالکل بے معنی ہے!!"

مجوزہ نصاب میں مضامین کی کثرت، وقت کی قلت اور کتابوں کی بھرمار ہے۔
ایک ہی روز میں مسلسل گیارہ بارہ کتابیں پڑھانا جبکہ ہر کتاب تحقیق طلب اور بحث طلب ہو گیارہویں (جو درحقیقت درسِ نظامی کا تیسرا درجہ ہے) سے لے کر سولہویں (دورۂ حدیث) تک وہ کون سی کلاس ہے جس کا کوئی ایک پیریڈ مطالعہ و تکرار یا تفریح کے لیے فارغ ہو۔

کتابوں کا حجم، بحث و تحقیق، اوقات اور ان کی تقسیم، نئے مضامین، انٹر اور بی اے کی کتب (جیسا کہ مجوزہ نصاب میں ان کے مطالعہ و استفادہ کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے) سب کچھ کو مدِ نظر رکھ کر کافی غور و خوض کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:۔

(۱) مجوزہ نصاب کی رُو سے طالب علم کو تمام دن ذہنی آسودگی اور تفریح کا کوئی وقت نہیں ملے گا۔

(۲) اسباق کے تسلسل سے ذہن اور دماغ پر شدید بوجھ پڑے گا اور دماغی سکون حاصل نہ ہو سکے گا۔

(۳) تکرار اور مطالعہ کے لیے بھی وقت نکالنا مشکل ہو جائے گا اور اگر کچھ وقت مل بھی جائے تو سارے دن کا تھکا ہارا طالب علم مطالعہ کی ہمت کیسے کرے گا اور اگر مطالعہ کرے بھی تو کس کس چیز کا؟

(۴) مدرسین بھی تکمیلِ نصاب اور وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھانے وقت اختصار اور تیز رفتاری سے کام لیں گے جس سے درسِ نظامی کی اصل روح (بحث و تحقیق اور سوال و جواب) مجروح رہے گی۔

وفاق المدارس کے اربابِ حل و عقد کو بھی مجوزہ نصاب کے بارے میں "ردِ عمل" کے پیشِ نظر ۲۸ نومبر ۱۹۸۳ء کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں نصاب کمیٹی میں مزید پندرہ ارکان کا اضافہ کرنا پڑا۔ اب گویا اکیس ۲۱ ارکان پر مشتمل کمیٹی نصابِ تعلیم کی

تشکیلِ جدید کرے گی جس کا پہلا اجلاس مارچ کے وسط میں ملتان میں ہو گا۔

ہم بھی اس سلسلہ میں نصاب کمیٹی کے فاضل ارکان کو چار بنیادی اور اصولی نکات فراہم کرتے ہیں، اگر انہیں ملحوظ رکھا گیا تو یقین ہے کہ بعد کار تو عمل حوصلا افزا رہے گا:۔

(۱) درسِ نظامی کو جوں کا توں باقی رکھا جائے البتہ نظم و ضبط اور درجہ بندی کی ضرورت کے پیشِ نظر اس کی تشکیلِ جدید کی جائے۔

(۲) منطق کی ادنیٰ کتابوں سے لے کر اعلیٰ تک حسبِ معمول سب کو پڑھایا جائے، البتہ "ملا حسن" سے اوپر کی کتابوں کو اگر شدید ضرورت ہو تو درجۂ تخصص میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔

(۳) عربی ادب (تحریر و تقریر) پر خاص توجہ دی جائے اور اگر ضرورت ہو تو اس سلسلہ میں مفید کتابوں کا اضافہ کیا جائے۔

(۴) نصابِ تعلیم کا واحد مقصد "الدین" ہو، ماضی میں یہی مقصد رہا اور آئندہ بھی باقی رہے۔ "الدنیا" کا کسی قسم کا پیوند لگنے کی اجازت نہ دی جائے۔

مجوزہ نصاب کی تشکیل کا اصل سبب یہی بتایا جا رہا ہے اور اس کا اعتراف بھی سب کو ہے کہ حالات کے تقاضے، زمانہ کی رفتار، یونیورسٹی اور کالجز کے معیار کے ساتھ چلا جا سکے..... اور ایک ایسا نصاب بنایا جائے..... وہ بھی سمجھ سکیں کہ واقعۃً اس میں سولہ برس صرف ہوئے ہیں اور واقعۃً یہ نصاب ایم اے کے برابر ہے۔ اور غالباً یہی چیز غالب تھی کہ انٹر اور بی اے کی کتب کے علاوہ دسیوں مضامین کے غیر مربوط کتابوں کے پشتارہ سے بے چارے طلباء اور اساتذہ کی پیٹھ لا دی گئی ہے۔

مگر یاد رہے کہ ملتِ اسلامیہ کی علمی تاریخ میں یہ حقیقت مسلم ہے کہ علمی و روحانی کمالات کو دنیاوی جاہ و منصب کی خواہش سے کم تعلق رہا ہے۔ سلسلۂ انتظام، اصولِ ترقی، انضباطِ قواعد اور کثرتِ مصارف کے لحاظ سے جس قدر بھی بلند معیار تک پہنچ جائیں اور

ان کے فضلاء کو کثرت سے اہم ملکی عہدے ملتے رہیں مگر یاد رہے کہ جس قدر بھی تحصیل جاہ و منصب کا پلہ بھاری ہوتا جائے گا علمی کمالات کا وزن کم ہوتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ترکوں کے مدارس سے چھ سو برس کی مدت میں ایسے لوگ بہت کم اُٹھے جو حکیم یا محقق کا لقب حاصل کرسکے ہوں۔

۴۵۷ھ میں نظام الملک طوسی کے ہاتھوں "نظامیہ بغداد" (جو ایک بہت بڑی اسلامی یونیورسٹی تھی) کی بنیاد رکھی گئی، دس ذیقعدہ ۴۵۹ھ کو اسے بڑی شان و شوکت سے کھولا گیا، علماء اور عام طلباء کے لیے بھی شاہی دربار سے وظائف اور تنخواہیں مقرر ہوئیں، مگر جب "ماوراء النہر" کے علماء کو نظامیہ کے قائم ہونے کے حالات سے اطلاع ہوئی تو سب نے ایک مجلسِ ماتم منعقد کی اور اس بات پر روئے کہ:۔

"اب علم علم کیلئے نہیں بلکہ جاہ و ثروت حاصل کرنے کے لیے سیکھا جائیگا"

فضلائے مدارسِ عربیہ اور جامع منصوبہ بندی کی ضرورت

برصغیر پاک و ہند میں ماہ شوال سے دینی مدارس کے تعلیمی سال کا افتتاح ہوتا ہے، چنانچہ اس ماہ میں مدارسِ عربیہ کے اربابِ اہتمام و انتظام قدیم اور جدید طلبہ کے داخلوں، داخلہ کے قواعد و شرائط اور ترجیحات کا تعین، نظام کی درستگی، حسبِ گنجائش طلبہ کے لیے ضروریات کی فراہمی، اساتذہ کا تقرر، مختلف درجات میں ردّ و بدل اور اضافہ، معیارِ تعلیم کی بلندی اور اساتذہ و طلبہ کی ہر ممکن کفالت و رضامندی سے متعلق جملہ امور کی تکمیل کے سلسلہ میں ان کی محنت و مشقت، جد و جہد، شب بیداری، تعبِ مسلسل، فراہمی چندہ کی ذلت و خواری اور مصائب و تکالیف پر صبر و تحمل اور اس پر بے پناہ اجر و ثواب، رفعِ درجات کے ہر اعتراف کے باوجود کسی تنقیص و تعریض اور تنقید و اعتراض کی نیت سے نہیں بلکہ خالص جذبۂ ہمدردی اور دینی مدارس کی ترقی و بقا اور استحکام اور بہترین ثمرات و نتائج اور تربیت کے خیرخواہانہ جذبات کے ساتھ مدارسِ عربیہ کے اربابِ بست و کشاد اور اہلِ علم و فضل

کی خدمت میں ذیل کی گذارشات بطور تجویز و تحریک پیشِ خدمت ہیں۔ ع
شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات

دینی مدارس درحقیقت تجدید و احیاء اسلام کی ایک مؤثر اور انقلابی تحریک ہیں جس کا ہدف عالمِ انسانیت کو ایسے افراد اور رجال کار مہیا کرنا ہے جو اپنی اپنی جگہ ایک اُمت سے کسی طرح بھی کم نہ ہوں، جو نابغۂ روزگار علماء بن کر زندگی کے ہر میدان میں بھرپور کارگذاری کا مظاہرہ کریں اور اخلاص کے ساتھ مسلمانوں کی تمام دینی و ملّی اور سیاسی ضرورتوں کو پورا کریں۔ موجودہ دَور میں لادینیت، فلسفہ و الحاد، نیچریت و دہریت اور مغربی تہذیب اور مادّیت کے زبردست طوفان کے درمیان سے ملّتِ اسلامیہ کا سفینہ پورے حزم و احتیاط اور دانشمندی سے نکال کر ساحلِ مُراد سے لگائیں۔

دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم اور ندوۃ العلماء نے اپنے زمانۂ قیام سے لے کر اب تک جو رجالِ کار اُمت کو دیئے ہیں، گو مردم سازی اور آدم گری کا ایک تاریخی ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ یہ ان ہی مدارس کے تربیت یافتہ علماء و مشائخ اور اساتذۂ علم کی برکتیں ہیں کہ آج برِصغیر کے چپہ چپہ میں دینی مدارس کا ایک عظیم اور وسیع جال پھیلا دیا گیا ہے علوم اور معارف کے سمندر بہا دیئے گئے ہیں اور مدارسِ عربیہ کی شکل میں اشاعت اور حفاظتِ دین کی مستحکم چھاؤنیاں قائم کر دی گئی ہیں۔

دینی مدارس کی وُسعت اور کثرت سے ان کے قیام اور استحکام کا تقاضا تو یہ تھا کہ اب مردم سازی اور رجال کار کی فراہمی اور آدم گری کا کام پہلے کی نسبت صد چند ہونا چاہیئے تھا۔ مدارس کے دینی، علمی اور قومی و ملّی فوائد بھی ان کی وسعت اور کثرت کی نسبت سے زیادہ سے زیادہ ہونے چاہیئیں تھے مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ماضی میں وسائل کے فقدان اور مدارس کی قلت کے باوجود دینی اور ملّی اعتبار سے اُمت کو دینی مدارس سے جو منافع اور فوائد مہیا ہوتے رہے، اب وسائل کی بہتات اور

مدارس کی کثرت کے باوجود امت ان سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ مردم سازی اور آدم گری کی صورتحال تو اندوہناک حد تک پستی کو پہنچی ہوئی ہے۔

اس سانحہ کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ سانحہ واقعۂ اُمت کے لیے ایک عظیم المیہ ہے، اس کے پس منظر اور اسباب وعوامل میں بعض امور کی نشاندہی کی جاتی ہے، مثلاً:۔

(الف) نصاب تعلیم کی قدامت اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگی نہ ہونے کے نقصان۔

(ب) اساتذہ میں جوہر تعلیم کے منتقل کرنے کی صلاحیتوں کا فقدان، مقناطیسیت حُسنِ نیت اور اخلاص کی کمی۔

(ج) طلبہ کی کمزوریاں، طلبِ صادق اور ذوقِ تشنگی کی ضرورت۔

(د) مدارسِ عربیہ کے ماحول میں جمود وعصبیت اور غنچوں میں زندگی اور شادابی کی رُوح پھونکنے والے موسم کی خزاں آشنائی۔

لاریب ان اسباب اور عوامل کے وجود اور اثر انگیزی سے انکار کی گنجائش نہیں مگر اصل مرض کی یہ تشخیص بھی صحیح نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مردم سازی، آدم گری، علم پروری اور شخصیت کی تعمیر میں وہ سعی ومحنت اور توجہ وہمت باقی نہیں رہی جو ہمارے اسلاف اور اکابر اہلِ علم کا طرۂ امتیاز تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں اور پھر فراغت کے بعد نونہالانِ قوم اور معمارانِ اُمت کو ان کی صلاحیت اور حیثیت کے مطابق مشغلے مہیا نہیں کیے جا رہے، مادیت کے سیلاب اور ہوا کے رُخ میں انہیں آزاد چھوڑ دیا جارہا ہے۔ فارغ ہونے کے بعد دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے معمارانِ قوم کو اپنے کنٹرول میں لائے بغیر خلاء بسیط میں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے جہاں وہ گردش کرتے کرتے انگریزی مدارس، عرب جامعات، مادیت اور ہوسِ دنیا کی سمت نکل کر اپنی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں کھو دیتے ہیں۔

اس طرح گویا دینی مدارس کے ایک جوہرِ قابل کی بہترین صلاحیتیں دُنیوی مفادات، ہوس زر،

اور عیش وعشرت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں، کچھ طب وحکمت کی نذر ہو جاتے ہیں، کچھ اپنا سفینہ جدید تعلیم کے طوفان میں ڈال دیتے ہیں اور کچھ قطر، دوبئی، بحرین، سعودی عرب، مصر، لندن اور پیرس کی فضاؤں میں پرواز کر جاتے ہیں۔

اس سانحہ کے ازالہ اور ناگفتہ بہ صورتحال سے نبرد آزما ہونا دینی مدارس کے ارباب بست و کشاد، ارباب علم وفضل اور امت کی وحدت وترقی کا درد رکھنے والے بہی خواہان ملت کا اوّلین فریضۂ منصبی ہے مگر محض نصاب تعلیم، اساتذہ وطلبہ کی کمزوریوں اور مدارس کے ماحول کی صفائی اور بہتری اور اصلاح وانقلاب کا سارا زور اگر اسی جانب صرف کیا جاتا رہا جیسا کہ ہمیشہ کا معمول بن چکا ہے تو اس صورتحال سے معیاری اور انقلابی سطح پر مطلوبہ بہتری کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

بہرحال اس سلسلہ میں مؤثر پیش رفت اور امت کے اجڑے ہوئے گلستان میں بہاریں تو باہمی مشاورت، مشترکہ لائحہ عمل اور ایک وسیع اور مستحکم منصوبہ بندی کے ساتھ ممکن ہو سکتی ہیں۔ تاہم بطور تحریک وتجویز کے اس سلسلہ میں چند گذارشات پیش خدمت ہیں۔

۱) سال رواں ہی سے وفاق المدارس اور جامعات کے ارباب بست وکشاد ہر سال کے فضلاء پر گہری نظر رکھیں، ان کے ذوق ورجحان اور مستقبل کی کارگذاری کے میدان کی مناسبت سے اپنے ہاں اُن کی فہرستیں مرتب کریں اور حسب صلاحیت و استعداد ان کو تدریس، تصنیف وتالیف، ریسرچ وتحقیق اور قومی وملی خدمات کے بہترین مواقع مہیا کرنے کی کوشش کریں اور علمی وتحقیقی شعبوں سے انہیں وابستہ کر کے ان کے ذہنوں سے تحقیق وتنقید، تجسس وتدقیق، علم وادب، بحث وتمحیص، دماغی بیداریوں اور اعلیٰ علمی تحریروں کا کام لیں، اس سے صالح عناصر کی واقعی تربیت اور ترقی کا کام تدریج سے بطریقۂ احسن انجام پاتا رہے گا۔ باصلاحیت نوجوانوں کا انتخاب، پھر ان کی صلاحیتوں کے مطابق کاموں کی تفویض اور نگرانی ہی دراصل اس

قومی وملی سانحہ کا ازالہ اور موجودہ بدترین صورتحال کو ختم کر سکتی ہے۔

(۲) گذشتہ سالوں کے فضلاء کے متعلق جامعات اور وفاق کی سطح پر خصوصی کمیٹیاں تشکیل دے کر ایک جامع اور مفصل جائزہ رپورٹ تیار کی جائے کہ وہ کہاں کہاں اور کس کس میدان میں مصروفِ عمل ہیں۔ اگر واقعتہً ان کے مشاغل اور صلاحیتوں اور توانائیوں کے مصرف کا سمتِ قبلہ درست ہے اور ان کی صلاحیتوں میں نکھار اور علم وعمل کی دنیا میں بہار متوقع ہے تو ان کی تشجیع اور ہمت افزائی اور سرپرستی کی جائے اور اگر خدانخواستہ ان کی صلاحیتیں لُٹ گئی ہیں یا اس کا احتمال ہے تو اس کے ازالہ اور تدارک کا مشفقانہ اور حکیمانہ لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔

(۳) ہر سال کے فضلاء کو اپنی تربیت اور مشفقانہ گرفت میں لے کر علم وفضل کی ان کونپلوں کو تناور درخت ہونے تک ہر ممکن سہارا دیا جانا چاہیئے۔ نیز ان کی تربیت و انتخاب، گروہی جتھہ بندی، کسی کیمپ سے وابستگی اور قرابت کی بنیاد پر نہیں بلکہ استعداد اور صلاحیت کی بنیاد پر کیا جانا چاہیئے، اور پورے حزم واحتیاط اور حکمت و تدبیر سے یہ بھی ملحوظ رہے کہ مدارسِ عربیہ کی سرزمین پر اُگنے والا یہ نہالِ تازہ کہیں طبّ وحکمت کا قلم نہ بن جائے معاش اور اقتصادی ضرورت اسے انگریزی مدارس عرب جامعات اور ان کے مشن ومقاصد کی تکمیل کا پُرزہ نہ بنادیں اور اس طرح ہمارے ہاں کا یہ بہترین اور باصلاحیت جوہر قابل اپنی عمدہ اور بےنظیر صلاحیتوں کو کہیں زندگی کے دُوسرے مقاصد اور لایعنی میدان میں منتقل نہ کر دے۔ اس سلسلہ میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیرِ انتظام ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مختلف تحقیقی تصنیفی، تبلیغی اور علمی شعبے قائم کرکے ٹھوس منصوبہ بندی سے ایک جامع اور ممکن العمل لائحہ عمل تیار کیا جاسکتا ہے، اوّلین مرحلے میں تجرباتی طور پر چھوٹی سطح پر کام شروع کرکے روشن مستقبل اور خوش آئند انقلاب کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔

(۴) فضلاء کو کسی بھی مناسب شعبۂ اشاعت و خدمتِ دین میں کوئی ذمہ داری سپرد کر دینے کے بعد اس پر کڑی نظر رکھنی چاہیئے کہ جو خدمت ان کے سپرد کی ہے کیا واقعۃً بھی وہ ان کی صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہے اور وہ اس خدمت کو کماحقہٗ انجام دے سکتے ہیں۔

(۵) اور اگر خدانخواستہ کچھ ایسے فضلاء بھی معلوم ہو جائیں جو بدقسمتی سے زندگی کی علمی و دینی نہج کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو ان کی مجبوریوں کا جائزہ لیا جانا چاہیئے تاکہ ممکن اور بروقت مداوا کیا جا سکے اور دوسروں کو بھی ایسی بدترین صورتِ حال سے دوچار ہونے سے بچایا جا سکے۔

بہر حال اس سلسلہ میں جو قدم بھی اٹھایا جائے اور مستقبل کی جیسی بھی تعمیر کی جائے ماضی کے تجربات کو قطعاً فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ تعلیم و تربیت، ضبط و کنٹرول، تنظیم و تحریک اور فضلاء کی سرپرستی و راہنمائی کا واحد مقصد "الدین" ہونا چاہیئے، ماضی میں بھی یہی ہوتا رہا اور آئندہ بھی یہی ہونا چاہیئے۔ "الدنیا" کا کسی قسم کا پیوند لگانے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔ حقیقت بھی یہی ہے اور ملّت کی اسلامی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ علمی اور روحانی کمالات کو دنیوی جاہ و منصب کی خواہش سے کم تعلق رہا ہے۔ دینی مدارس سلسلۂ انتظام، اصولِ ترقی، انضباطِ قواعد اور کثرتِ مصارف کے لحاظ سے جس قدر بھی بلند معیار تک پہنچ جائیں، فضلاء کو اہم ملکی و سیاسی عہدے تو ملتے رہیں گے مگر یاد رہے کہ جس قدر بھی تحصیلِ جاہ و منصب کا پلہ بھاری ہوتا جائے گا علمی اور رُوحانی کمالات کا وزن کم ہوتا جائے گا، پھر علم، علم کے لیے نہیں بلکہ جاہ و ثروت حاصل کرنے کے لیے سیکھا جائے گا۔ ولا فعلہا اللہ

حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

رُکن مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند

> وفاق المدارس العربیہ کے نئے مجوزہ نصابِ تعلیم سے متعلق احقر نے وفاق المدارس کے اربابِ حل و عقد کی خدمت میں سابقہ مضمون ایک مراسلہ کی صورت میں بھیجا تھا جسے وفاق کے مرکزی دفتر ملتان نے تقسیم کیا۔ احقر کا یہ مراسلہ جلد ۱۹ ج ۲ صفر ۱۴۰۴ھ میں مضمون کی شکل میں الحق میں شائع ہوا تو ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند نے الحق سے نقل کرکے جولائی ۸۴ء میں شائع کیا اور اسکے ساتھ بزرگ عالم دین حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب رکن مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا چھ صفحات کا تبصرہ بھی شائع کیا ہے ذیل میں وہی تبصرہ بشکریہ "دارالعلوم" پیشِ خدمت ہے جس میں نصابِ تعلیم، اہم کتب کی نشاندہی، اور افادیت اور کئی ایک اہم تجاویز بیان کی گئی ہیں۔ (عبدالقیوم حقانی)

آجکل ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ مدارسِ عربیہ دینیہ کے نصابِ تعلیم کا مسئلہ زور شور سے زیرِ بحث ہے۔ کچھ وہ علماء کرام ہیں جو قدیم نصابِ تعلیم درسِ نظامی کو بدستور

جاری رکھنے کے حامی ہیں، اور کچھ وہ ہیں جو اس میں ترمیم و تغیر کے حق میں ہیں۔ پاکستان میں تو "وفاق المدارس العربیہ" کی تنظیم اس موضوع پر کئی اجتماعات منعقد کر چکی ہے ہندوستان میں ابھی حال میں پہلے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ایک سیمینار منعقد ہو چکا ہے۔ اس کے کچھ ہی روز بعد جمعیۃ علماء ہند کے زیرِ اہتمام دہلی میں ایک کانفرنس منعقد ہو چکی ہے۔ دونوں اجتماعات میں (جن میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا) فی الحال کسی فیصلہ پر نہیں پہنچا جا سکا بلکہ فیصلہ اور غور و فکر کے لیے کمیٹیاں بنا دی گئی ہیں۔ خدا کرے کوئی نتیجہ نکلے اور ہمارے اہلِ علم و فکر اس مسئلہ کو حل کر سکیں۔

اس سلسلہ میں مختلف اہلِ علم و اصحابِ قلم کے مضامین بھی دونوں ملکوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ کے "الحق" (اکوڑہ خٹک پاکستان) میں حضرت مولانا عبد القیوم صاحب مدرس دار العلوم حقانیہ اکوڑہ کا مضمون "نصابِ مدارسِ عربیہ کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ" کے زیرِ عنوان نظر سے گذرا۔ مضمون قدیم نصابِ تعلیم درسِ نظامی کی حمایت میں ہے اور مویدینِ درسِ نظامی کی طرف سے ایک مدلل و جامع بیان ہے۔ اس مضمون کے پڑھنے کے دوران بعض نکات میرے ذہن میں بھی آئے، میں انہیں درج کر رہا ہوں تاکہ ان پر بھی غور فرما لیا جائے۔

(۱) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرح (جس کا ذکر صاحبِ مضمون نے اپنے مضمون میں کیا ہے) یہ خاکسار بھی اب سے تقریباً چالیس سال پہلے درسِ نظامی کی تبدیلی کے حق میں تھا اور اس تبدیلی کو عمل میں لانے کے لیے بعض عملی اقدامات بھی کیے تھے مگر حضرت شیخؒ کی طرح عمر اور تجربہ کے اضافہ کے ساتھ ساتھ اس جنون میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔ اب میری رائے یہ ہے کہ اصل مسئلہ قابلِ توجہ نصابِ تعلیم کا نہیں بلکہ طرزِ تعلیم کا ہے، اگر اساتذہ کرام محنتی اور لائق ہوں اور طلبہ کو بنانے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو ہر نصاب اپنے اپنے دائرہ میں مفید اور کارگر ثابت ہو سکتا ہے درسِ نظامی

اگر کامل توجہ سے پڑھایا جائے اور پڑھنے والے بھی کتابوں کا اچھی طرح مطالعہ کرکے اسے پڑھیں تو بقول مولانا عبدالقیوم صاحب طالب علم جس فن کی کتاب چاہے آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور کوئی کتاب لاینحل نہیں رہ سکتی۔

مگر مشکل یہ ہے کہ بڑے مدارس (دارالعلوم دیوبند وغیرہ) میں ہر درجہ میں اتنے طلبہ ہوتے ہیں کہ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان کوئی ربط و تعلق نہیں ہوتا اور اساتذہ کا درس جلسہ عام کی تقریر ہو کر رہ جاتی ہے، اساتذہ طلبہ کی مشکلات سے واقف نہیں ہوتے اور یہ جان بھی نہیں پاتے کہ کچھ ان کے پلّے پڑا کہ نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ خصوصاً نیچے کے درجات میں کہ طلباء کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہ ہو اور استاد طلبہ کا محاسبہ کرتے رہا کریں کہ وہ مطالعہ کرکے آتے ہیں یا نہیں اور سبق سمجھ کر اٹھتے ہیں یا نہیں! میری رائے ہے کہ بڑے مدارس کے ممتاز فارغ التحصیل جنہوں نے علمی دنیا میں نام پایا زیادہ تر ان میں وہ ہیں جنہوں نے ابتدائی اور وسطانی تعلیم چھوٹے مدرسوں میں شفیق اساتذہ کی آغوش میں پائی اور بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دیوبند یا سہارنپور گئے۔

(۲) مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ "درس نظامی" کے نام سے ہمارے ہاں جو نصاب مروّج ہے وہ "منجمد" ہے، گذشتہ تین سو سال کے عرصہ میں اس میں بے شمار تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ صحاح ستہ تو درس نظامی کا جزو ہی نہ تھی، یہ تو خانوادۂ ولی اللّٰہی کی دین ہے۔ فلسفہ و منطق، صرف و نحو اور ادب کی بھی بہت سی کتابیں ملّا نظام الدین رح کے عہد کے بعد کی تصنیف ہیں جو وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتی رہیں۔ مثلاً مرقات، ملّا حسن، شرح ہدایۃ الحکمۃ (خیرآبادی) حمداللّٰہ، قاضی مبارک، ملّا مبین، علم الصیغہ، دستور المبتدی، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن، نفحۃ العرب وغیرہا۔ اب موجودہ حالات میں اس میں پھر تبدیلی کی ضرورت ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں موجودہ درس نظامی جسے میں نصاب ولی اللّٰہی کہنا زیادہ صحیح

سمجھتا ہوں کہ نصاب کے تغیرات کا اگر تاریخی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے دارالعلوم کے قیام کے بعد سنہ ۱۲۸۵ھ میں، پھر سنہ ۱۲۸۹ھ میں، پھر سنہ ۱۳۰۱ھ میں نصاب میں تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ اس کے بعد بھی اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مجلس شوریٰ اور مجلس تعلیمی اس پر وقتاً فوقتاً غور کرتی رہتی ہے۔

جہاں تک علوم عصریہ کا تعلق ہے اس میں بھی معتدل اور متوازن راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے مدارس میں ان پر زیادہ زور نہیں دیا جاسکتا نہ ہی طلبہ یہ دوہرا بوجھ اٹھا سکتے ہیں نہ ہمارے غریب مدارس ہی ان کی تعلیم کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں، مگر اس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تاریخ جغرافیہ اور معلوماتِ عامہ وغیرہ سے تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے۔ بعض اوقات تو ہمارے علماء ان علوم سے کورے ہونے کی وجہ سے مذاق بن جاتے ہیں اور ان کو پڑھے لکھے لوگوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ تاریخ اسلام کو تو علوم جدیدہ میں شمار کرنا ہی غلط ہے، آخر جس علم کو مسلمانوں نے قصہ و خرافات سے ممتاز کرکے بارہ سو سال پہلے مستقل علم کا درجہ دیا، اس کے اصول وضع کیے اور اسے علمی و عقلی بنیادوں پر مدوّن کیا، اُسے علومِ جدیدہ میں شمار کیا جاسکتا ہے؟ اور اس سے بے بہرہ رہ کر کیا کوئی اہل علم کی صف میں شمار ہوسکتا ہے؟ اپنے اکابر کے شاندار کارناموں سے ناواقف رہ کر کوئی قوم ترقی کی منزلیں طے نہیں کرسکتی۔ پھر یہ سیرت نبویہ اور خلفائے راشدینؓ سے واقف ہوئے بغیر تو اسلام کی عملی تصویر ہی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔

شاید کم لوگوں کو معلوم ہو (خصوصاً پاکستان میں) کہ غالباً سنہ ۱۳۹۰ھ سے دارالعلوم دیوبند میں علوم جدیدہ کا اضافہ کیا جاچکا ہے، چنانچہ اب سال پنجم و ششم میں مختصر المعانی و جلالین کے ساتھ تاریخ اسلام مکمل، تاریخ ہند (از عہد سلطان محمود غزنوی تا ۱۸۵۷ء)، جغرافیہ عالم، جغرافیہ جزیرۃ العرب و بلادِ اسلامیہ، جغرافیہ سائنس، فلسفۂ جدیدہ کے نظریات، حفظانِ صحت،

دستورِ ہند، بحیثیت مضامین داخلِ نصابِ تعلیم ہیں اور ان کی مختصر اور سہل کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ انگریزی بھی اختیاری طور پر داخلِ نصاب کی گئی تھی اور اس کے لیے ایک ڈگری کالج کے ریٹائرڈ پرنسپل صاحب کی خدمات حاصل کی گئی تھیں مگر یہ تجربہ مفید اور کامیاب ثابت نہ ہوا۔

(۳) صرف و نحو کی کتابوں کی تبدیلی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب فرماتے ہیں:۔ "نحو میر اور اس کی جاندار مختصر مگر پرشکوہ عبارت، میزان الصرف، صرف میر، علم الصیغہ، مراح الارواح اور فصول اکبری اور اس کی خاصیات اور درسی خصوصیات سے طلبہ کے اندر جو ملکہ علمی رسوخ اور پختگی حاصل ہوتی ہے، کیا مولانا مشتاق احمد کے اردو رسائل علم النحو اور علم الصرف سے یہ کمالات حاصل ہو سکتے ہیں؟"

یہ صحیح ہے مگر مولانا مشتاق احمد کے رسائل کے علاوہ اور بھی کئی اچھی کتابیں ہندوستان اور مصر میں تیار ہو چکی ہیں، ان میں سلجھے انداز میں قواعدِ عربی کو سمجھانے اور ان کے عملی اجرا پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً حافظ عبدالرحمٰن امرتسریؒ کی کتابیں کتاب الصرف و کتاب النحو وغیرہ اچھی کتابیں ہیں، ان میں کافیہ اور پنج گنج تک کے مسائل اچھی ترتیب اور سلجھے ہوئے انداز میں جمع کر دیئے گئے ہیں، پھر یہ کتابیں اردو زبان میں ہیں اس لیے طلبہ پر دوہرا بوجھ نہیں پڑتا۔ ابتدائی تعلیم کی مادری زبان میں ضرورت و اہمیت ماہرینِ تعلیم کے نزدیک مسلّم ہے۔

خاکسار نے بھی اب سے چالیس سال پہلے "کلامِ عربی" کے نام سے صرف و نحوِ عربی کے اہم مسائل پر دو حصوں میں ایک کتاب لکھی تھی جو ابتدائی صرف و نحو کی تعلیم کے مدارس میں پسند کی گئی، ان پر شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا تھا:۔

"ماشاء اللہ کتاب اپنے مقصد میں کامیاب ہے، ترتیب بہت
سہل الحصول ہے۔ جو لوگ عربی زبان کی دشواری کا عذر کر کے ادھر متوجہ
نہیں ہوتے تھے اُن کے لیے آپ نے کوئی عذر کا موقعہ نہیں چھوڑا۔"

دیگر اکابرِ ملت حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ وغیرہ نے بھی بلند پایہ الفاظ میں تحسین فرما کر ذرّہ نوازی فرمائی تھی اور حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ نے تو النظام العربي في التقريظ على الكلام العربي کے عنوان سے ایک رسالہ ہی اس کی تعریف میں ارقام فرما دیا تھا۔

عربی زبان میں مصر کی جدید مطبوعات النحو الواضح از علی الجازم و مصطفیٰ امین کے چھ حصے بھی بہت مفید اور سلجھے ہوئے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ قواعدِ عربی کا عملی اجراء بھی ساتھ ساتھ ہوتا جاتا ہے اور عربی زبان کے قواعد اس طرح پڑھائے جاتے ہیں جس طرح ایک زندہ زبان کے پڑھائے جانے چاہئیں۔

(۴) موجودہ درسِ نظامی نصاب کے ناقدین کا بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں سب سے زیادہ زور منطق و فلسفہ پر دیا گیا ہے جس کے متعلق حضرت مجدد الف ثانیؒ کی رائے ہے کہ:-

"اکثر آں مسائل لاطائل است و بے حاصل"

ان علوم کی تقریباً بیس کتابیں (صغری سے قاضی مبارک تک) داخلِ درس تھیں، حالانکہ تفسیر کی صرف دو کتابیں (جلالین اور بیضاوی) اور بیضاوی بھی صرف سورۂ بقرہ تک۔

حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب حقانی کا ارشاد ہے کہ:-

"وفاق کے مجوزہ نصاب میں قطبی تک منطق نظر آتی ہے، کیا اسے پڑھ
لینے کے بعد واقعۃً بھی طالب علم منطق کے مصطلحات سے آشنا ہو جاتا ہے؟"

وفاق کا مجوزہ نصاب تو سامنے نہیں، البتہ درسِ نظامی میں قطبی تک منطق کی چھ کتابیں داخلِ درس ہیں۔ اگر کسی فن کی چھ کتابیں پڑھ لینے کے بعد بھی طالب علم اس فن کی مصطلحات

سے واقف نہ ہوسکے تو اسے اس طالب علم کی دماغی صلاحیت کا قصور ہی کہا جائے گا۔

حضرت مولانا حقانی صاحب مدظلہ کو غالباً علم ہی نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے موجودہ نصاب میں منطق کی لازمی کتابوں میں قطبی کے بعد صرف دو کتابیں سلّم العلوم اور ملّا حسن ہی داخلِ درس ہیں اور یہاں انہیں اس فن کی ضروری واقفیت کے لیے کافی سمجھا گیا ہے، البتہ فضیلت کے بعد تکمیل معقولات کے درجہ میں منطق و فلسفہ کی کتابیں حمد اللہ، قاضی مبارک، صدرا اور شمس بازغہ داخل ہیں مگر یہ درجہ عملاً معطل ہو کر رہ گیا ہے۔

منطق کے حامیوں کو یہ حقیقت ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ ہمارے اکابر کبھی اس کی بھرمار کے حق میں نہ رہے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب "تذکرۃ الرشید" میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اسی طرح منطق و فلسفہ کے ساتھ آپ کا تنفر عداوت کے درجہ پر پہنچا ہوا تھا، ایک دفعہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرا جو مرید اور شاگرد فلسفہ کا شغل رکھے گا وہ میرا مرید اور شاگرد نہیں"

آپ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دُنیا کے نفع کی اُمید تو ہے"

(۵) ادب کی کتابوں کے سلسلہ میں بھی افراط و تفریط سے بچ کر ایک معتدل اور متوسط طریق اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا حقانی صاحب مدظلہ کی یہ رائے صحیح ہے کہ:۔

"اگر نفحۃ الیمن، مقامات، متنبی اور حماسہ وغیرہ کتابوں کو تحقیق و تدقیق سے پڑھا جائے تو اس کے پڑھنے والے عربی ادب سے محروم نہیں رہ سکتے"

بلاشبہ قرآن و حدیث کے معانی و مفاہیم سے واقف ہونے کے لیے عربی قدیم میں

مہارت ضروری ہے جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھی، جدید عربی پر قدرت اس کے لیے بالکل ضروری نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جدید عربی کے اسالیب بیان اور اس کی تعبیرات قدیم عربی سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان سے شغف اور ممارست کے بعد قرآن و حدیث کی زبان سے بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ عالم عرب سے ربط و تعلق پیدا کرنے کے لیے جدید زبان کی ضرورت ناقابلِ انکار ہے، اس لیے دونوں کو اپنی اپنی جگہ سیکھنا ضروری ہے لیکن ہمارے قدیم مدارس کا چونکہ مقصد اساسی تعلیم کتاب و سنت ہے اس لیے اولیت بہر حال قدیم کو حاصل رہے گی۔

تبدیلیٔ نصاب کے علمبردار ادب کی کتابوں میں "مقاماتِ حریری" پر بہت اعتراض کرتے ہیں، حالانکہ اس کی اپنی کچھ خصوصیات بھی ہیں، اس کے داخلِ نصاب کرنے کا ایک خاص مقصد لغاتِ عرب پر عبور ہے۔ میرے ایک استاذ (جو عربی کے بہت اچھے ادیب تھے) حضرت مولانا اختر شاہ امروہی فرمایا کرتے تھے کہ مقامات میں "صراح" (لغتِ عربی کی متداول کتاب) کے تمام لغات آگئے ہیں، اس کو یاد کرنے کے بعد طالب علم عربی ادب کے پورے ذخیرہ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہمارے طالب علمی کے زمانہ میں اسے حفظ کرایا جاتا تھا۔

دارالعلوم دیو بند میں حضرت مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ کا درس "مقامات" بہت مشہور تھا، وہ ایک ایک لفظ کو پوری تحقیق و تدقیق کے ساتھ اس طرح حل کرتے تھے کہ اختلافِ ابواب اور تغیر صلات سے معانی میں جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ اچھی طرح طلبہ کے ذہن نشین ہو جائے۔

البتہ یہ صحیح ہے کہ ہمارے قدیم نصاب میں نظم کا حصہ زیادہ ہے۔ کسی زبان کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لیے ادب منثور سے زیادہ مدد ملتی ہے ادب منظوم سے نہیں۔ میری رائے میں عالم اسلامی کے نامور ادیب و عالم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مدت مکار مہم کی کتاب "مختارات" عربی ادب کی ایک اچھی کتاب ہے اس کا اضافہ ضروری ہے۔ دار العلوم دیو بند میں بھی یہ کتاب عرصہ تک داخل نصاب رہ چکی ہے، میری رائے میں اسے پھر داخل ہونا چاہیئے۔ اس میں عہدِ قدیم سے زمانہ حاضر تک کے ادباء و بلغاء کے طرزِ تحریر کے عمدہ نمونہ تاریخی ترتیب سے جمع کر دیئے گئے ہیں۔

جدید عربی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، آجکل اسفار کی سہولتوں اور معاشی و سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے بلادِ عربیہ سے تعلقات وسیع تر ہو گئے ہیں اس لیے جدید عربی کے بولنے اور لکھنے پر قدرت بھی اہم ہے۔

دار العلوم دیو بند میں بھی عربی جدید کا مستقل شعبہ عرصہ سے قائم ہے۔ اس کے سربراہ مولانا وحید الزمان کیرانوی نے (جو ایک شامی عالم عبد اللہ المامون کے شاگردِ رشید ہیں) چند ہی سال میں دار العلوم کے اس خلا کو پُر کر دیا ہے اور کئی سو ایسے شاگرد پیدا کر دیئے ہیں جو بلا تکلف عربی تحریر و تقریر پر قادر ہیں، ان میں سے کئی جرائد و مجلات کے ادارتی فرائض انجام دے کر دیارِ عرب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

آخر میں ایک بات ادب سے اور عرض کر دوں، قدیم نصاب کے غالی حامی اکثر فرمایا کرتے ہیں اور ہمارے مولانا عبد القیوم حقانی صاحب نے بھی لکھا ہے کہ "ہمارے اکابر حضرت علامہ کشمیریؒ، حضرت مولانا مدنیؒ، حضرت مولانا عثمانیؒ وغیرہم نے یہی درسِ نظامی پڑھ کر علمی کمال اور شہرت و عزت کا مقام حاصل کیا بلکہ صاحب نزہۃ النظر نے بھی عربی ادب کا ذوق اسی درسِ نظامی سے حاصل کیا ہے"۔ اور اس سے اس امر پر استدلال کرتے ہیں کہ موجودہ نصاب میں تغیر و اصلاح کی ضرورت نہیں مگر یہ ایک مغالطہ ہے۔ ترمیمِ نصاب کے حامی اس کا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ درس نظامی ترتیب سے پہلے جو لاکھوں اجلۂ علم اور اساتذۂ فنون گذرے ہیں جن میں درس نظامی کے مرتب بھی شامل ہیں کیا انہوں نے یہ کمالات حاصل کیے، اس میں تغیر و تبدیلی کی ضرورت کیا پیش آئی حقیقت یہ ہے کہ

اعلیٰ دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے حاملین کے لیے کسی خاص نصاب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک قوی و تندرست جوان معمولی غذا سے بھی پوری طاقت حاصل کر لیتا ہے مگر ایک کمزور اور لاغر آدمی کے لیے ہلکی، زود ہضم اور مقوی غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسئلہ اوسط درجہ کے ذہن و دماغ کے لوگوں کا ہے، ان کے لیے ضرورت ہے کہ بہتر سے بہتر اور سہل سے سہل نصاب تعلیم تیار کیا جائے اور طریق تعلیم میں بھی سابقہ تجربوں سے فائدہ اٹھایا جائے اور وہ زیادہ سے زیادہ مؤثر ہو۔

یہ خیالات پراگندہ جو حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب حقانی کا مضمون پڑھ کر فوراً دماغ میں آئے بے تکلف اور برجستہ قلمبند کر دیئے گئے ہیں۔ اپنی ہیچمدانی کا اعتراف کرتے ہوئے اہل علم سے درخواست ہے کہ لغزشوں سے درگذر فرمایا جائے۔

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

مولانا اطہر علی صاحب

(سابقہ) مشرقی پاکستان، کشور گنج

(سقوطِ بنگال سے پہلے)

محبی و مشفقی مولانا سمیع الحق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کئی روز ہوئے عنایت نامہ پہنچا، از حد مصروفیت ہے صبح سے رات دس گیارہ بجے تک، وہ بھی مختلف الجہات امورِ مُہمہ کو انجام دینا، جیسے کہا جاتا ہے کہ سانس لینے کی فرصت نہیں، اور ضعف و پیری کے ساتھ ضعفِ حافظ کا اللازم ہے۔ نیز فرصت مطلق نہیں کہ سوچ کر سوالاتِ مُرسلہ کا تشفی بخش جواب دوں۔ مزید برآں جبکہ اہلِ فضل و کمال اکابر کے خاکِ پا ہونے کا بھی اہل نہیں ؎

زدست کوتاہ خود شرمسارم　　　　کہ از بالا بلنداں شرمسارم

مجھے اگر قابلِ خطاب ہی نہ سمجھا جاتا تو نقائص کا بھانڈا تو نہ پھوٹتا۔ اور جب اس عمر کا طبعی خاصہ ہی لکیلا یعلم بعد علم شیئاً ہے۔ لہٰذا مختصر جواب مجمل یہ ہے :-

اساتذہ میں سے برائے نام جو کچھ علمی فیض پہنچا وہ امام العصر علامہ دہر حضرۃ مولانا انور شاہ کشمیری قدس اللہ اسرارہم کی ذرّہ نوازی ہے ـــــ اور عملی میدان میں حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی اعلی اللہ درجاتہم دائماً ابداً کی چند روزہ صحبت اکسیر صفت کا خوشہ چینی ہے، جن کی شانِ عالی میں بس اتنا ہی لکھنے پر قلم کو روکتا ہوں ؎

ہمہ شہر پرز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم یک بیں نکند بہ کس نگاہے
آفاقہا گردیدم مہر بتاں ورزیدم
بسیار خوباں دیدم لیکن تو چیزے دیگری

باقی سوالات کے جواب لکھنے سے محض مجبور ہوں۔

مولانا محمد اسحاق سندیلوی ؒ

مکرم و محترم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ موصول ہُوا ، میں اب تک "الحق" کے لیے کچھ نہیں لکھ سکا۔ گرامی نامہ کا جواب میں تاخیر کے ساتھ دے رہا ہوں، دونوں صورتوں کے لیے معذرت خواہ ہوں اور شرمندہ۔ ان دونوں کا سبب ایک ہی ہے یعنی کثرتِ مشاغل ! پہلے قصور کی تلافی کرنے کی کوشش انشاء اللہ عنقریب کروں گا۔ سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں :۔

(الف) اس سوال کا جواب میرے لیے آسان نہیں ہے، تفصیل آپ کے لیے باعثِ زحمت ہوگی اور اجمال میرے لیے تنگی کا سبب ! تاہم تا بہ امکان دونوں چیزوں سے بچتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

محترما! علم کے دو معنی ہیں ۱۔ معلومات ۲۔ تنویر عقل ۔ جملہ علوم سے خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی، عقلِ انسانی کو ایک روشنی حاصل ہوتی ہے، لیکن اس روشنی کا رخ درست ہونا لازم ہے۔ اگر یہ صحیح زاویئے سے نہ ڈالی جائے گی تو غلطی ناگزیر ہے۔ مثلاً کسی ایسی زمین پر جس میں متعدد گڑھے ہیں نشیب کو ٹارچ زمین کے متوازی ڈالیں تو گڑھے آپ کی نظر سے مخفی ہو جائیں گے، اور جو شخص اس روشنی سے اعتماد کر کے اس زمین پہ چلے گا وہ ضرور کسی نہ کسی گڑھے میں گرے گا۔ بخلاف اس کے اگر آپ ذرا بلندی پر کھڑے ہو کر اسی زمین پر عمودی شکل میں روشنی ڈالیں تو گڑھوں کا اندرونی حصہ بھی روشن ہو جائے گا اور رہرو کے لیے گرنے کا خطرہ نہ رہے گا۔ احقر کے خیال میں انسان کی علمی زندگی کا اہم ترین اور جوہری حصہ یہی ہوتا ہے یعنی نورِ عقل کے انتشار کا رُخ اور زاویہ۔

اس تمہید کے بعد عرض کرتا ہوں کہ میری علمی زندگی کے اس جزوِ اعظم پر جن چیزوں نے سب سے زیادہ اثر کیا ہے وہ دو کتابیں ہیں، اوّل کتاب اللہ اور دوّم حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور احادیث کے مجموعوں میں سب سے زیادہ تاثیر بخاری شریف میں محسوس ہوئی۔

ان کے بعد جن کتابوں سے مَیں سب سے زیادہ متاثر ہُوا وہ سیّدی و مُرشدی حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی تصنیفات و تالیفات ہیں۔ اُن کی شخصیّت کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ــ عیاں راچہ بیان ــ اور متعارف کا تعارف کرانے کی کیا حاجت ہے؟ حضرت مولانا عبدالشکور رحمۃ اللہ کی ذات بھی محتاجِ تعارف نہیں ہے، ان کی شخصیت اور ان کی تصنیفات کا بھی میرے ذہن پر ایک خاص اثر ہُوا اور اسے ایک خاص رُخ ملا۔ مکتوباتِ امامِ ربانیؒ، اغاثۃ اللہفان، احیاء العلوم بھی اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہیں۔ ہاں گلستان بوستان

حضرت سعدیؒ کا تذکرہ ہی کرنا بھول گیا، بچپن میں دونوں کتابیں پڑھی تھیں لیکن ان کا لطف اب تک محسوس کرتا ہوں۔ امام شاطبیؒ اور ان کی تصنیفات دونوں مجھے پسند ہیں۔ الموافقات تفقہ پیدا کرنے میں بے نظیر نہیں تو قلیل النظیر ضرور ہے۔ ہدایہ میں بھی "فقیہ گری" کا وصف میں نے پایا اور اس معاملہ میں اس کی نظیر میری نظر سے نہیں گذری۔ تفسیر میں امام رازیؒ کی تفسیر کبیر مجھے بہت پسند ہے۔ ان کے ذہن کی روانی اور ان کی قوتِ اختراع و ایجاد سے جو مباحث شرفیہ میں بھی بہت نمایاں ہے میں بہت متاثر ہوں۔ امام شعرانیؒ کی سلاستِ فہم اور مزاج شریعت سے واقفیت اور اس کے ساتھ شریعت کے علوم متعلق ظاہر و باطن میں جامعیت نے میرے دل میں اُن کی وُقعت و عظمت کے ساتھ محبّت بھی پیدا کر دی ہے۔ قصّہ تو بہت طویل ہے، کہاں تک سمع خراشی کروں اتنے ہی پر اکتفاء کرتا ہوں۔

(۲) میرے اساتذہ کی تعداد زیادہ ہے اس لیے کسی استاد کا مخصوص اثر میرے اوپر نہیں ہوا، البتہ ان حضرات میں سے دو اُستادوں کو میں اب سب اساتذہ سے ممتاز پاتا ہوں اور ان کی عظمت قلب میں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ ایک تو حضرت مولانا مفتی حافظ قاری ظہور احمد صاحب رحمۃ اللہ ہیں، حدیث میں نے انہیں سے پڑھی ہے۔ حدیث اور فقہ دونوں میں ایسے وسیع النظر عالم دُنیائے اسلام میں گنے چُنے ہی ہوں گے، اس کے ساتھ علوم متداولہ میں بھی اعلیٰ استعداد حاصل تھی، اگرچہ حدیث و فقہ کی ایسی بات کسی دوسرے فن میں نہیں تھی۔ موصوف مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں مدت دراز تک صدر مدرس اور مفتی کے منصب پر فائز رہے، اسی زمانہ میں مجھے ان سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ ان کے تبحر علمی کے علاوہ بھی میں اُن کی دو صفتوں سے بہت متاثر ہوا، اوّل ان کی طالبعلمانہ زندگی اور علم سے اُن کا شغف۔ جب میں نے اُن سے پڑھا ہے تو اُنکی عمر تقریباً ۶۰ سال تھی

مگر مطالعہ اور کتب بینی کا شوق ہنوز پورے شباب پر تھا۔ شب کو شاید ہی کسی دن وہ ایک ڈیڑھ بجے رات سے پہلے بستر پر جاتے ہوں۔ مدرسہ میں جو اوقات درس سے خالی ہوتے تھے اُن میں بھی فتویٰ نویسی یا مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔ دُوسری چیز اُن کی سادی اور متقیانہ زندگی ہے۔ طرزِ تعلیم بھی بہت ہی مفید اور رواجِ عام کو دیکھتے ہوئے انوکھا تھا۔ خصوصیّت یہ تھی کہ کتابیں درجہ میں موجود رہتی تھیں اور دورانِ تقریر طلبہ کو ماخذ دکھلاتے جاتے تھے، برسوں کے مطالعہ کے بعد بھی جن ماخذ تک ذہن کی رسائی نہ ہوتی تو اُن کا تعارف وہ درس کے وقت ہی کرا دیتے تھے۔

دُوسرے استاذ مولانا عجب نور صاحبؒ ہیں ربانی مدرسہ معراج العلوم بنّوں) مدرسہ قاسم العلوم شاہی مسجد مراد آباد میں اُن کے تلامذہ کی صف میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہُوا۔ موصوف وسیع النظر تو نہ تھے مگر علوم میں پختگی اور ان کا استحضار غیر معمولی تھا، یہ دو صفتیں ایسی تھیں جو انہیں ممتاز علماء کی صف میں جگہ دیتی تھیں زندگی سادی طالبعلمانہ اور متّقیانہ تھی، مطالعہ کا تو اتنا شوق نہ تھا مگر پڑھانے کا شوق بیحد تھا۔ صبح سے عشاء تک بلکہ اس کے بعد بھی دیر تک یہی مشغلہ سب سے بڑا اور دلچسپ مشغلہ تھا۔ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے، قوی اور تندرست تھے اس لیے تھکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ برد اللہ مضجعہٗ وطاب ثراہ

(د) ہند میں بکثرت رسائل میرے پاس آتے تھے جن کے دیکھنے کا موقع بھی کم ہی ملتا تھا۔ یہاں دو رسالوں کو جانتا ہوں، بیّنات اور الحق۔ دونوں ماشاءاللہ بہت اچھے ہیں۔

(ہ) ــ "د" میں اس کا جواب بھی آگیا ہے۔

(ز، ح، ط) یہ خط ان سوالات کا متحمل نہیں ہوسکتا، اس کے لیے مستقل مضمون

کی حاجت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے لٹریچر کی کمی ہے، پھر انتخاب کے بارے میں نقطۂ نظر کا فرق بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم مندرجہ ذیل کتابیں موجودہ دور میں مفید ہیں، فتنوں کے اعتبار سے آپ خود تقسیم فرمالیں؛ سیرۃ النبیؐ (علامہ شبلی مرحوم) ازالۃ الخفاء (شاہ ولی اللہؒ) حجۃ اللہ البالغہ ـــــ حکیم الامت سیدی و مرشدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی تصنیفات و مواعظ ـــــ مذہب و عقلیات (مولانا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہٗ) قادیانی مذہب (مولانا الیاس صاحب برنی مرحوم) ہدایۃ الممتری عن غوایۃ المفتری (مولانا عبدالغنی خاں صاحب مرحوم) (ردِ قادیانیت میں) منہاج السنۃ (امام ابن تیمیہؒ)

یہ چند کتابیں اس وقت ذہن میں آئیں وہ میں نے لکھ دیں۔ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کی کتابیں بھی بہت مفید ہیں ـــــ تدوینِ حدیث (مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ) بھی قابلِ ذکر ہے۔

ان کے علاوہ بھی اس قسم کی مفید کتابیں ہیں مگر اس وقت سب مستحضر نہیں ہیں۔

حضرت مولانا عبدالقدوس ہاشمی

میرے ذاتی حالات کچھ زیادہ دلچسپ نہیں نہ میری زندگی بڑی بڑی مہمات سے بھری ہوئی ہے کہ لوگوں کو ان مہمات کے پڑھنے میں مزہ آئے، اس لیے اس قصّہ کو جانے دیجئے۔ البتہ تعلیم پر دو چار سطریں اس لیے لکھے دیتا ہوں کہ لوگوں کو آج سے ساٹھ سال پہلے کے تعلیمی انداز کا کسی قدر اندازہ ہو جائے۔

صوبہ بہار کے شہر گیا سے شمال کی طرف سادات کی ایک بستی مخدوم پور کے نام سے آباد ہے۔ میں نے اس بستی میں ۲۶ رجون ۱۹۱۱ء کو عالم آب و گل میں آنکھ کھولی۔ والد مرحوم مولانا سید اوسط حسین صاحب ایک بڑے عالم، مشہور عالم حدیث شیخ الکل میاں نذیر حسین صاحب محدثِ دہلویؒ کے شاگردِ رشید اور دور کے رشتہ دار تھے۔ تین چار سال کی عمر ہوئی تو ایک خاص معلم میری تعلیم کیلئے

ملازم رکھے گئے۔ بوڑھے آدمی نیکوکار اور نیک دل ملک منور حسین صاحبؒ، انہوں نے مجھے تعلیم و تربیت دی، کبھی کبھی خود والد مرحوم بھی پڑھاتے تھے۔ میں نے ملک صاحب مرحوم سے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کا اردو کا قاعدہ، پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی پڑھی۔ میری آج بھی یہ رائے ہے کہ انجمن کی ان درسیات سے بہتر کوئی سلسلۂ تعلیم اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ اس زمانہ میں چوتھی کتاب کے بعد میں نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور ہی کے شائع کردہ دینیات کے رسالے بھی پڑھے اور فارسی کی پہلی، دوسری کتابیں بھی پڑھیں۔ اور پھر فارسی کی اعلیٰ کتابیں بھی یہیں تمام ہوئیں۔

قرآن مجید (ناظرہ) مجھے میری خالہ مرحومہ بی بی قریشہ خاتون صاحبہ نے گھر میں پڑھایا، کلمے بھی یاد کرائے، نماز بھی سکھائی اور "بہشتی زیور" مصنفہ مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم میں سے کچھ انتخاب پڑھائے۔

میں ۹، ۱۰ سال کی درمیانی عمر میں تھا کہ والد مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد مجھے قریبی بستی ہتھیا نواں کے ہندو پاٹ شالہ میں داخل کر دیا گیا، یہاں میں نے ہندی زبان اور حساب کی تعلیم حاصل کی۔ ایک سال کے بعد شہر گیا کے مدرسہ انوار العلوم میں داخل ہوا۔ اس زمانہ میں مولانا سید محمد سجاد مرحوم جو بعد کو نائب امیر شریعت اور جمعیۃ العلمائے دہلی کے صدر بھی رہے، مدرسہ انوار العلوم میں صدر مدرس تھے، مدرسہ میں عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور خود مولانا سید محمد سجاد صاحبؒ نے قرآن مجید مع ترجمہ سبقاً سبقاً مکمل پڑھایا۔

والد مرحوم کا جب انتقال ہوا تھا اُس وقت میں اُردو اور فارسی میں لکھنے پڑھنے کے قابل ہو چکا تھا، البتہ قرآنِ مجید کے صرف تین پارے اُس وقت تک حفظ کیے تھے اور روزانہ اپنی خالہ کو سنایا کرتا تھا۔

مدرسہ انوار العلوم گیا کے بعد مجھے موضع اعظم گڑھ کے مدرسہ عالیہ میں داخل کیا گیا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے شاگرد مولانا عبدالرحمٰن ابوالنعمان مرحوم و مغفور صدر مدرس تھے، وہ میرے والد مرحوم کے ہم سبق رہ چکے تھے اس لیے بڑے مہربان تھے۔ یہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے انداز کا تھا اور بغیر کسی فرق کے وہی درسِ نظامیہ اس میں جاری تھا۔ میں نے بھی کئی سال میں درسِ نظامیہ کی تکمیل کی۔ اس کے بعد میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوا، وہاں مجھے مولانا حیدر حسن خان محدث ٹونکی اور شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ شاگرد مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ ندوہ کا کورس آخری درجہ فاضل تک مکمل کیا۔ مرحوم مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالواحد عثمانی اور پرنسپل محمد اکبر وغیرہ میرے ہم سبق تھے۔

میرے گھر میں والد مرحوم کا ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ اس پر مزید خوش قسمتی یہ کہ مجھے تعلیم کے بعد ہی سے کتب خانوں میں کام کرنے کا موقع مل گیا، اس لیے میں نے مختلف علوم و فنون پر ہزاروں ہی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ انگریزی، ہنسکرت، عبرانی اور ترکی زبانیں بھی سیکھ لیں، اس طرح ان زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ بھی آسان ہو گیا۔ میں نے کتابیں پڑھنے کے سوا زندگی میں کوئی کام قابلِ ذکر انجام نہیں دیا۔ تفسیر ابن کثیر اور سنن کبریٰ للبیہقی اور صبح الاعشیٰ للقلقشندی سے لے کر طلسم ہوشربا اور طلسم فتنہ نور افشاں کی جلدیں تک پڑھیں۔ شرر مرحوم کے ناولوں سے لے کر پوچ اور لچر کتابیں تک پڑھ ڈالیں۔ لیکن ؎

کیا کچھ نہ پڑھا، پر کچھ نہ پڑھا گو عمر بسر کی پڑھنے میں
جب سامنے آیا دفترِ گل تب جہل کا اپنے راز کھلا

اس سوال کا جواب دینا میرے لیے بڑا مشکل کام ہے کہ میں کن کتابوں سے متاثر ہوا، تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابوں سے کیا اثر لیا؟ یہ تو ظاہر ہے کہ دیندار گھرانے

میں آنکھ کھلی، دیندار علماء کی تربیت پائی، ہر کتاب سے اثر لیا اور اثر لینا ہی چاہیئے تھا بخاری شریف، تفسیر ابن کثیر، احیاء العلوم غزالی اور فقہ کی اعلیٰ کتابوں سے اثر نہ لینا کیا معنی؟ اسی طرح امام ابن تیمیہؒ کی کتابوں سے اثر پذیر نہ ہونے والے میں قبولِ حق کا فقدان تو ہو سکتا ہے کتاب کا نقص نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ ہر فن کی اچھی اور بہتر کتاب سے دل و دماغ نے اثر قبول کیا۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف کی کسی کتاب کا ذکر ضروری نہیں بلکہ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؎

تمتع زہر گوشہ یافتم
زہر خرمنے خوشہ یافتم

ان علوم کے علاوہ دوسرے علوم کی کتابوں سے بھی ہمیشہ فائدہ ہی حاصل کیا، کسی سے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی ملی اور کسی سے گمراہی کی نشاندہی کا فائدہ حاصل ہُوا۔ مطالعہ کا فائدہ بہرحال ہمیشہ حاصل ہوتا ہی رہا۔

مطالعہ کی دو قسمیں | میں نے مطالعہ کی دو قسمیں قرار دے رکھی ہیں، ایک کا نام میں نے "کماؤ مطالعہ" رکھا ہے، یعنی ایسا مطالعہ جس سے ہم کچھ کماتے اور حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً امام ابنِ تیمیہؒ کی کتاب منہاج السنۃ یا امام غزالیؒ کی کتاب احیاء العلوم ــــ ہم ان کتابوں کے مطالعہ سے وہ حاصل کرتے ہیں جو ان بزرگوں نے اپنی ساری عمر میں مطالعہ، فکر اور تدبر کے ذریعہ کمایا تھا اور ہمارے لیے اپنی کتابوں میں اسے محفوظ کر دیا تھا ــــ اسی طرح ایک شخص جو امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا مطالعہ کرتا ہے وہ گویا اپنی عمر کے ایک چھوٹے سے حصہ کے عوض حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی مقدس زندگی کے تجربات حاصل کر لیتا ہے۔

مطالعہ کی دوسری قسم "گنواؤ مطالعہ" ہے۔ یہ وہ مطالعہ ہے جس میں آدمی اپنی

عمر کو بھی گنوا دینا ہے اور حقیقتہً کچھ بھی حاصل نہیں کرنا۔ مثلاً کوئی شخص گھٹیا درجہ کے افسانے اور ڈرامے پڑھنے میں یا سینما دیکھنے میں اپنا وقت ضائع کرتا ہے تو حقیقتہً اپنی عمر کا ایک حصّہ گنوا دیتا ہے اور اس کے عوض کچھ بھی اسے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ ہیرو کی جگہ وہ خود ہوتا، لیکن یہ تمنا بے حاصل رہتی ہے۔ شاید ہی کسی نے ڈراموں کو حقیقت سمجھ کر اپنے اندر کوئی فکری یا عملی انقلاب پیدا کیا ہو۔ ان گھٹیا درجہ کے افسانوں اور ڈراموں کی زبان بھی اتنی اچھی نہیں ہوتی کہ ان کے ذریعہ زبان سیکھنے کا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ مَیں نے مختلف زبانوں میں ایسے سینکڑوں نہیں ہزاروں ہی افسانے اور ڈرامے پڑھے، لیکن زبان دانی کا فائدہ بھی ان سے حاصل نہ ہو سکا۔ ممکن ہے کہ ہزاروں میں سے دو چار نے کوئی فائدہ ان سے حاصل کیا ہو۔ لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ زبان دانی کا فائدہ دوسری علمی کتابوں سے کم وقت میں زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اس قسم کے مطالعہ کو میں "گنواؤ مطالعہ" کہتا ہوں۔

اب میں اردو زبان کی دس کتابوں کا ذکر کرتا ہوں جن سے مجھے بڑا فائدہ حاصل ہُوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ساری کتابوں کا ذکر جن سے میں متاثر ہُوا، چند صفحات کے ایک مضمون میں تو کیا شاید ایک ضخیم تصنیف میں بھی ممکن نہیں، اس لیے صرف دس[۱] کتابوں ہی کا ذکر کروں گا۔

(۱) خطباتِ مدراس، علامہ سید سلیمان ندوی رحؒ کے آٹھ مشہور خطبات جو انہوں نے سیرت طیبہ کے موضوع پر لالی ہال مدراس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے سامنے دیئے تھے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے ترجمے مختلف یورپی اور ایشیائی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ جو شخص ان خطبات کو غور سے پڑھے گا میری اس رائے سے اتفاق کرے گا کہ یہ مختصر سی کتاب اپنے موضوع پر بے مثال کتاب ہے، اور اگر آدمی میں

ذرا بھی قبولِ حق کی صلاحیت موجود ہے تو یہ چند اوراق انسان میں فکری اور عملی انقلاب پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

(۲) سیرت النبی کی جلد ۳، ۴، ۵، ۶، مصنفہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، اعلیٰ تعلیمیافتہ حضرات کے لیے بہترین کتابیں ہیں۔ میں نے کسی زبان میں اس سے بہتر اور مفید کتاب نہیں دیکھی، اور یہی رائے مولانا محمد علی جوہر مرحوم اور علامہ اقبال مرحوم نے اس کے مطالعہ کے بعد ظاہر فرمائی تھی۔

(۳) بہشتی زیور، مصنفہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کو بھی میں نے بڑی مفید اور لاجواب کتاب پایا۔ جزوی طور پر اختلاف ممکن ہے لیکن مجموعی طور پر یہ کتاب اتنی کارآمد اور مفید ہے کہ اردو ہی میں نہیں بلکہ اور زبانوں میں بھی اس کے مقابل کوئی کتاب نہیں ٹھہرے گی۔

(۴) تاریخ ارضِ مقدس، مصنفہ مولانا عبد الحلیم شررؔ لکھنوی۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں، تاریخ یہود اور تاریخ عیسائیت، ضخامت بہت زیادہ نہیں لیکن اس موضوع پر یہودیوں اور عیسائیوں کی لکھی ہوئی بہت سی ضخیم کتابوں کے مطالعہ کے بعد اس چھوٹی سی کتاب کی قدر معلوم ہو سکی۔ اتنی معلومات اور اس قدر اختصار کے ساتھ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں پیش کی گئی ہیں کہ کسی اور جگہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

(۵) دین و دانش، مصنفہ پروفیسر محمود علی کپورتھلہ۔ میں نے اس کتاب کو اردو کی بہترین کتابوں میں سے ایک لاجواب کتاب پایا، اسے کئی بار پڑھا، یہ اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے، میں نے اس کتاب کو پڑھ کر بہت فائدہ اٹھایا، اور میری رائے میں یہ کتاب اس قابل ہے کہ مدرسوں اور کالجوں میں طلبہ کو پڑھائی جائے۔

(۶) الجہاد فی الاسلام، مصنفہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ۔ اسلام میں جہاد کے

مقاصد و احکام کیا ہیں؟ اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب میں نے نہیں دیکھی، میں نے اسے ایک بار اپنی طالب علمی کے زمانہ میں پڑھا تھا اور دوسری بار اب بڑھاپے میں پڑھا، بڑی مفید اور صحیح معلومات بڑے ادیبانہ انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

(۷) اسلام کا اقتصادی نظام: مصنفہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم، اگرچہ یہ کتاب اصطلاحی معنوں میں فن معاشیات پر نہیں لکھی گئی ہے، لیکن مفید معلومات اور ترتیب و تنسیق کے اعتبار سے معاشیات کی ایک بہترین کتاب ہے میں نے ایک بار نہیں دو بار اس کتاب کو پڑھا اور اس وقت پڑھا جبکہ میں یونیورسٹیوں کے مقررہ نصاب ایم اے (معاشیات) کی ساری کتابیں پڑھ چکا تھا۔ اگر مروجہ فن معاشیات کی دو ایک ابتدائی کتابوں کے بعد اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو زیادہ مفید ہوگا۔

(۸) الفاروق: مصنفہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم، ہر اعتبار سے ایک ایسی کتاب ہے جس پر کوئی زبان فخر کر سکتی ہے۔ اس کا ترکی ترجمہ عمر رضا نے اور انگریزی ترجمہ شبلیؒ کے لائق شاگرد مولانا ظفر علی خان مرحوم نے کیا ہے معلومات، قوتِ تحریر اور ادیبانہ اندازِ بیان کے لیے شبلیؒ کا نام کافی ہے۔ میں نے اسے کئی بار شروع سے آخر تک پڑھا اور ہر بار اس سے متاثر ہوا۔

(۹) الدین القیم: مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم، چھوٹی سی کتاب ہے لیکن بہت ہی کار آمد۔ عام طور سے مدارس اور کلیات میں پڑھائی جاتی ہے میں نے اس کتاب سے اور اس کے فاضل مصنف سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ مولانا مرحوم کے ساتھ کئی سال بسر کیے ہیں اور ان کے کمالاتِ علمی سے استفادہ کیا ہے۔

(۱۰) رحمۃ للعالمین: مصنفہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، مشہور کتاب ہے یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ میں نے اس کتاب کو پڑھ کر اس سے اچھا اثر لیا۔

تحقیق وتلاش سے اس کی بعض روایات پر گفتگو کی جاسکتی ہے لیکن جو شخص اسے غور سے پڑھے گا اپنے لیے مفید پائے گا۔

مندرجہ بالا دس کتابوں کے بعد شاید یہ سوال پیدا ہو کہ میں نے شعر العجم (مولانا شبلیؒ) موازنہ انیس و دبیر (مولانا شبلیؒ) اردو کی بہترین کتاب خیام (مولانا سید سلیمان ندویؒ) حیاتِ شبلی (مولانا سید سلیمان ندویؒ) اسی طرح حضرت شیخ الہندؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تصانیف کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان بزرگوں کی تحریروں سے بہت کچھ استفادہ کیا اور بہت کچھ سیکھا ہے۔

اس کی ایک عام وجہ تو وہی ہے جو میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ ان تمام کتابوں کا ذکر ممکن نہیں جن سے میں نے کوئی اثر لیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا دس کتابیں اردو زبان کی وہ کتابیں ہیں جو مطالعہ کرنے والے کے یقین و عمل پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور اپنے تجربہ کی بناء پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھ پر ان کتابوں کا اثر پڑا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر شخص پر ایسا ہی اثر پڑ سکتا ہے، یہ بالکل شخصی و انفرادی معاملہ ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی شخص پر اثر پڑے اور کسی پر کوئی اثر نہ ہو۔ لیکن پھر بھی میں یہ مشورہ دوں گا کہ پڑھنے والے ان کتابوں کو پڑھیں اور غور سے پڑھیں، ہر پڑھنے والے کو ان سے کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل ہوگا۔

کتابوں اور رسالوں کی قسمیں

اب دوسرے سوال کو لیجئے، اس وقت جو کتابیں لکھی جارہی ہیں اور جو رسالے شائع ہو رہے ہیں میں اُن میں سے کس قسم کی کتابوں اور رسالوں کو پسند کرتا ہوں؟ اس کا جواب ضمناً آچکا، وہ یہ کہ جس کتاب یا رسالہ کے پڑھنے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوتا وہ "گنواڈ مطالعہ" کے ذیل میں آتے ہیں اور میرے لیے ممکن نہیں کہ انہیں پسندیدہ نظروں

تیسرا درجہ: مندرجہ بالا دونوں درجوں سے باہر کی ساری کتابیں اور مقالات اس درجہ میں داخل ہیں، مثلاً سیاسی پروپیگنڈے کی کتابیں، خاص خاص مقاصد کے ماتحت لکھی ہوئی تاریخیں اور گھٹیا درجہ کے شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لیے تحقیقاتی کارناموں کے نام سے لکھی ہوئی کتابیں اور مقالات جن میں سے اکثر کا مقصد دوسری قوموں میں بے یقینی اور احساس کمتری پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مثال کے لیے نولکدیکے، ولیم میور اور پادری زویمر کے مقالات اور ان کی کتابیں دیکھئے۔

قدیم اور جدید فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے فلسفہ کی کتابوں کو بھی اسی تیسرے درجہ میں داخل کر دیا ہے۔ افلاطون و ارسطو کی حماقتوں سے لے کر ہیگل اور رینان تک کی تحریروں کا حاصل بے یقینی، بے حضوری اور بے عملی کے سوا کچھ نہیں۔

حکیم الاسلام علامہ اقبالؒ نے بالکل سچ کہا ہے کہ ؎

حاصل ہے خرد کا بے حضوری
ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

انسانی زندگی کی تکمیل اور حیاتِ ارضی میں کامیابی کے لیے نہ فلسفیوں کے افکار راہنما ہو سکتے ہیں اور نہ ان کے اعمال۔ غیر مسلم فلسفیوں کو کیا کہیئے خود اپنے مسلمان فلسفیوں کی کتابیں پڑھیئے تو افکار میں تضاد، شک بالائے شک، ہر بات غیر یقینی، بے ضرورت طولِ کلام اور بے فائدہ موشگافیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، رہا عمل کا معاملہ تو اس کے لیے معلم ثانی ابونصر فارابی اور معلم ثالث بوعلی سینا کے

سے دیکھوں۔ عام ادبی و تفریحی تحریروں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اگرچہ میں انہیں پڑھ لیتا ہوں لیکن اس کی وجہ پسندیدگی نہیں بلکہ پڑھنے کا وہ مرض ہے جو اب میری ذات میں مزمن ہو چکا ہے۔

میں کتابوں اور رسالوں کو ابتدائی تقسیم کے طور تین درجوں میں تقسیم کرتا ہوں:۔

پہلا درجہ: وہ کتابیں اور رسائل جن کے مطالعہ سے قاری کا یقین متاثر ہوتا ہے اور اسی کے مطابق عمل میں انقلاب پیدا ہوتا ہے، ان میں دینی کتابیں، بزرگوں کے احوال، تاریخ انسانی کے عبرتناک واقعات، دورِ حاضر کے حالات اور علمی انکشافات، اصولِ قانون وغیرہ داخل ہیں۔

اس درجہ میں ذیلی تقسیم در تقسیم بھی ہو سکتی ہے بلکہ ہونی چاہیئے، لیکن اصل مقصود بہر حال وہی رہنا چاہیئے کہ کسی کتاب یا مقالہ کے پڑھنے سے ہمارا یقین کس حد تک متاثر ہوتا ہے، اور اس یقین کا جو مطالعہ کے بعد قاری میں پیدا ہوتا ہے اس کی عملی زندگی پر کیا اثر نمایاں ہوتا ہے۔

دوسرا درجہ: فنی کتابیں اور رسالے، ان میں کارآمد فنون پر لکھی ہوئی تمام کتابیں اور مقالات داخل ہیں، مثلاً طب، طبعیات، کیمیا، ریاضی، معاشیات، سیاسیات، باغبانی، مرغبانی، مشینیات، صنائع اور ہنر مندی وغیرہ پر لکھے ہوئے مقالات اور کتابیں، زبان دانی و زبان آموزی پر لکھی ہوئی کتابیں اور مقالات بھی اس درجہ میں داخل ہیں۔

اس درجہ میں بھی ذیلی تقسیم در تقسیم ہونی چاہیئے اور ایسی تقسیم حقیقتہً موجود ہے لیکن اصل مقصود بہر حال برقرار رہنا چاہیئے کہ مطالعہ کے ذریعہ قاری کو ایسی معلومات مہیا ہو جاتی ہیں جو اس کی زندگی میں کسی نہ کسی موقع پر کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔

حالاتِ زندگی کو دیکھئے، قول سے فعل اور فعل سے قول نہیں ملتا، ساری زندگی دل ودماغ کی جنگ نظر آتی ہے۔

اس کے برخلاف انبیاء کرام (علیہم السلام) کی زندگیوں کو دیکھئے! کتنا محکم یقین اور کس قدر پختہ عمل دکھائی دیتا ہے۔ دوسروں کو جو یقین رکھنے کے لیے کہتے ہیں خود اس پر یقین رکھتے ہیں اور سب سے زیادہ خود محکم یقین رکھتے ہیں جو عمل کرنے کی ہدایت دیتے ہیں خود اس پر سب سے زیادہ سختی کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ اور یہ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ ؎

یقینِ محکم، عملِ پیہم محبّت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

مولانا قاضی عبدالحلیم صاحب کلاچی

برادراعز و اغر حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب حقانی استاذِ تفسیر دار العلوم حقانیہ و نائب مدیر ماہنامہ "الحق" کا حکم ہے کہ یہ بے مایہ اور کم دستگاہ طالبعلم "میری علمی اور مطالعاتی زندگی" کے عنوان پر کچھ لکھے، ان کی یہ فرمائش میرے لیے باعثِ صد اعزاز ہے۔ اعزّہ اللہ تعالیٰ فی الدارین معنا۔ آمین

ظاہر ہے اس ناکارہ کا نہ کوئی علم ہے اور نہ کوئی مطالعۂ علم، اس لیے میرے کچھ لکھنے پر "چھوٹا منہ بڑی بات" اور "کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ" کا محاورہ اور مثالیں منطبق ہوں گی، لیکن سعداء کی مجلس میں شرکت کے خیال اور قافیۂ گل ہونے کے حسین تصور سے کچھ سیاہی پھیلا رہا ہوں ع

جذبۂ شوق کی قسم اور کوئی لگن نہیں

اور ع بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

کتب اور مصنفین کتب کے حوالہ سے میں اس خیال کے اظہار میں بخل سے کام نہیں لوں گا کہ مولانا نظام الدین سیالوی مرحوم (المتوفی ۱۱۶۱ھ) کے نصاب اور اس کے مصنفین نے مجھے مجموعی طور پر بے حد متاثر کیا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ شیخ الہندؒ، حضرت مدنیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت تھانویؒ، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت افغانیؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحبؒ، مولانا مفتی محمود صاحبؒ، مولانا محمد موسیٰ خان صاحب ڈیروی مدظلہ، مولانا قاضی عبدالکریم صاحب کلاچوی مدظلہ اور اس قسم کے بلا مبالغہ ہزاروں اعاظم رجال کو اس نصاب ہی نے توجنم دیا ہے۔ اللہ کی کروڑوں رحمتیں ہوں مولانا سیالوی مرحوم کے مرقدِ اطہر پر کہ کس غضب کے اخلاص اور کس قدر محنت سے نصاب مرتب کیا کہ اس نصاب کا سندیافتہ ایک ایک فرد پورا ادارہ، پوری انجمن اور بعض اوقات پوری دنیا کہلانے کا مستحق بن جاتا ہے۔ جن بزرگوں کے اسماء گرامی میں نے صرف بطور نمونہ کے ذکر کیے ہیں اگر ان کے ساتھ وہ سوابقات اور لواحقات لگائے جائیں جن کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں تو اس کے لیے بھی دسیوں صفحات درکار ہوں گے۔ بیس بڑے مسلمان، البلاغ مفتیِ اعظم نمبر، البلاغ عارفی نمبر، الرشید دیوبند نمبر، تاریخ دارالعلوم دیوبند، خدام الدین بنوری نمبر، بینات بنوری نمبر، خدام الدین شیخ التفسیر نمبر، لولاک بنوری نمبر، ترجمانِ اسلام مفتی محمود نمبر، صحبتے با اہلِ حق، حیاتِ امداد، ارواحِ ثلاثہ اور اس قسم کے تذکروں میں درسِ نظامی کے علماء، طلباء اور اس نصاب کا مطالعہ کرنے والوں کی علمی جامعیت، عملی تفوّق، سیاست و ریاست، محبت زندگی کے ہر شعبہ پر ان کی مضبوط گرفت اور سنجیدہ تاریخ پر ان کی فاضلانہ نگاہ کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ افسوس کہ یہ نصاب جو بہت عرصہ تک دارالعلوم دیوبند اور پاک و ہند کے مدارس میں تقریباً ۸۳ عدد کتابوں پر مشتمل تھا، اب گھٹتے گھٹتے یہ نصاب

تیس بتیس کتابوں تک بمشکل رہ گیا ہے۔ جتنا گڑ اتنا میٹھا کے اصول کے ماتحت جب کتب کی تعداد میں کمی آگئی تو اس کے ثمرات میں بھی کمی قدرتی اور فطرتی بات ہے۔ تو یہ قصور نصاب کا نہیں ان میں کتر بیونت کرنے والوں کا ہے۔ نصاب کی اگر زبان ہوتی تو وہ ہمارے قحط الرجال کے شکوہ و شکایت پر یہ کہتا کہ ع

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردہ تُست

درسِ نظامی کی ہمہ گیر جامعیت اور نافعیت کے مجموعی اور عمومی تاثر کے بعد درسِ نظامی کی بعض محسن کتابیں مجبور کر رہی ہیں کہ ان کا خاص طور پر ذکر کیا جائے تعلیم کے بالکل ابتدائی دور کے رسائل میں مجھے "گلدستۂ تعلیم الاسلام" مصنفہ علامہ شیر کوٹیؒ اور "حیات المسلمین" نے بیحد متاثر کیا۔ پھر قدوری، شرح وقایہ، شرح تہذیب اور کافیہ کو جامع اور نافع پایا اور ان کتب کے طرز سے دل تعلیم کی طرف راغب ہوا فراغت کے بعد تدریس کے لیے شرح جامی، مقامات، مختصر المعانی، ہدایہ، نور الانوار، جلالین شریف اور مشکوٰۃ شریف میری مرغوب کتابیں ہیں۔ شرح جامی کے قیودات و احترازات جان چھڑکنے کی چیز ہے۔ ہدایہ کا باوقار اور شاہی طرز اپنی مثال آپ ہے۔ نور الانوار کا رواں اور سہل طرز سبق جاری رکھنے کی خود اپیل کرتا ہے۔ جلالین شریف کا اختصار دریا در کوزہ کا مصداق ہے۔ مختصر المعانی اپنی سلاست اور جامعیتِ فن کے لحاظ سے مسلم ہے۔ اور مشکوٰۃ شریف تو حدیث یار کما قیل واما ابن مسعودؓ فابن مسعودؓ، اس پر رائے زنی؟ میری کیا مجال، اس پر کچھ عرض کرنا مادر زاد نابینا چوں وصف ضیا دگوید کے مترادف ہوگا۔ ایک مسلمان بجز درود و سلام کے کیا لکھ سکتا ہے؟ ؎

علیک سلام اللہ مازار بیتہ　　کبیرا ناس فی بجاد مزمل
وما انشد المشتاق عند ضریحکم　　قفا نبک من ذکری حبیب ومنزل

البتہ اس کے حواشی میں سرحد و پنجاب کے شیخ الہند مولانا نصیر الدین غورغشتوی کا حاشیہ ایک دُرِّ بے بہا اور نہایت سہل ہے۔ اس کی شروح میں مرقاۃ میں جامعیت اور ہم جیسے کمزوروں کے لیے مظاہر حق اردو میں نافعیت۔

غیر درسی کتابوں میں تفسیر روح المعانی علوم عربیت و ادبیت کے لحاظ سے معرکے کی چیز ہے۔ تفسیری خدمت کے علاوہ قدم بقدم عربی ادب اور اشعار کا ایک عجیب و غریب ذخیرہ کا نمونہ پیشِ خدمت ہے ؎

تامل فی نبات الارض وانظر
الیٰ اثار ما صنع الملیك
علیٰ قصب الزبرجد شاھدات
بان الله لیس لهٗ شریك

تفسیر کبیر تحقیق و تدقیق میں اپنی مثال آپ ہے۔ پھر ہر بحث اتنی شرح و بسط سے ملے گی کہ ممکن ہے کہنا پڑے فیه کل شی الا التفسیر۔ خازن میں احادیث کا ذخیرہ اور سرمایہ، معارف السنن از حضرت بنوریؒ اور تکملۂ فتح الملہم از علامہ عثمانی مدظلہ کی عربی عبارت اتنی آسان اور اتنی شستہ ہے کہ میرے جیسا طالب العلم بھی اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔

اُردو میں حضرت تھانویؒ، حضرت لاہوریؒ، حضرت افغانیؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کراچی، حضرت قبلہ والد محترم قاضی عبد الکریم کلاچوی کے پُر از معلومات اور معنی خیز نگارشات کے علاوہ مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اور مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کے بہار افزاء اور کرامت آفرین تحریرات نے اس قدر متاثر کیا ہے کہ حضرت والد صاحب کی تحریر کے علاوہ ان دونوں بزرگوں کی تحریرات ان کے نام کے بغیر بھی میں معلوم کر لیتا ہوں، حد یہ ہے کہ نام نہ ہو تو مولانا محمد رفیع عثمانی اور مولانا محمد تقی عثمانی کی تحریروں

میں بھی فرق کر لیتا ہوں حالانکہ ان دونوں بھائیوں کی تحریروں میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔
یہاں اگر میں یہ بات چھوڑ دوں تو علمی خیانت کے زمرہ میں آئے گی کہ اپنے رفیقِ علمی مولانا عبدالقیوم صاحب حقانی مدظلہ کی کتابوں میں "اربابِ علم وکمال اور پیشۂ رزقِ حلال" کو یادگارِ زمانہ کتابوں میں قرار دیتا ہوں۔ "صحبتے با اہلِ حق" بھی واقعۃً نوادرات کا خزانہ ہے۔ حال ہی میں مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کے قلم سے "جہانِ دیدہ" کے نام سے اُن کا ایک سفرنامہ شائع ہوا ہے، سفرنامہ کیا ہے! دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بلاشبہ مستقبل کا مؤرخ اس سفرنامہ کو وہ مقام دے گا جو بہت کم سفرناموں کی قسمت میں آیا ہے۔
اور بھی بہت سی کتابیں ہیں جنہوں نے جزوی طور پر علمی سفر میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے سب کے ذکر کا موقع کہاں؟ سب کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ؎

علی اللہ ربّ النّاس حسن جزائہم
بما لا یوافی عدّہٗ ذھن حاسب

علمی زندگی میں مجھے اپنے اساتذۂ کرام میں سب سے زیادہ اپنے والدِ مکرم کے درسِ تفسیر و درسِ حدیث کے طرز نے متاثر کیا ہے، ان کے دروس میں علمی اور فقہی تحقیق نمایاں ہوتی، صحابۂ کرامؓ کا مقام رفیع بات بات میں اُجاگر ہوتا، لطائف و ظرائف اسلاف کے واقعات و حکایاتِ اساتذۂ کرام اور بزرگانِ دین کے برمحل حالات سے چار چاند لگ جاتے۔ حضرت والد صاحب مدظلہ کے دروس کا یہ احسان ہے کہ ان کے اسباق میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ اور حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ کا ذکرِ خیر اور ان کے حوالہ جات اس کثرت سے سُنے کہ ان حضرات کی زیارت نہ ہو سکنے کے باوجود یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ان حضرات کی ہم نے زیارت کی ہے۔ ترمذی شریف کے درس میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کی نظیر نہیں دیکھی۔ دورۂ حدیث کے سال بہت سے شیوخِ حدیث کے اسباق موقعہ بموقعہ سننے میں آئے، لیکن معاملہ

بس یہی تھا کہ ؎

افانہا گرویدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزِ دیگری

حنفی مسلک کی اتنی صاف شستہ، مدلل اور واضح ترجمانی میں نے کسی اور جگہ نہیں دیکھی۔

حضرت الاستاذ مولانا محمد موسیٰ خانصاحب مدظلہ کے درس جیسا محققانہ، تفصیلی، باحوالہ صفحات درس کہیں نہیں دیکھا۔ استاذِ گرامی قدر مولانا محمد اکبر صاحب قاسم العلوم ملتان کا کتاب دانی میں وسیع ملکہ محسوس کیا، حضرت الاستاذ مفتی ولی حسن صاحب کراچی کی تدریس پر جو گرفت دیکھی وہ بہت کم دیکھنے میں آئی۔

مولانا محمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سوات) جیسی شفقت اور سادگی کسی اور اُستاذ میں نہیں دیکھی۔ اپنے اساتذہ میں اپنے عمِ محترم مولانا قاضی عبداللطیف صاحب کی جامع شخصیت کے جس پہلو سے میں نمایاں طور پر متاثر ہوا وہ آپ کی سیاسی بصیرت، تدبر، معاملہ فہمی، سنجیدگی اور مرنجان و مرنج طبیعت کا مالک ہونا ہے۔

والدہ ماجدہ مدظلہا کا شمار اگر میں اپنے اساتذہ میں نہ کروں تو یہ انتہائی حماقت ہوگی، کیونکہ بہت سی مسنون دعائیں مثلاً آدابِ خلاء، آدابِ طعام، آدابِ سفر اور بہت سی دینی معلومات ان کی توجہ اور فیضِ اثر کا نتیجہ ہے۔ دوسرے بچوں اور بچیوں کو ان کے قرآن مجید اور دینی ابتدائی رسائل پڑھانے کا طرزِ تفہیم بڑا مؤثر اور پیارا ہے۔

معروف سکالر

جناب طالب ہاشمی صاحب

جناب مکرم و معظم زاد شرفکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گرامی نامہ کے لیے صمیم قلب سے سپاس گزار ہوں لیکن ساتھ ہی حیران ہوں کہ اس معاملہ میں آپ نے مجھ جیسے غیر معروف گوشہ نشیں آدمی کو تخاطب کے قابل کیسے سمجھا کسر نفسی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ میرا علم قلیل اور میری عقل بہت محدود ہے، میں تو آپ جیسے علماء کے خوانِ علم کا ایک ادنیٰ ریزہ چین ہوں۔ جن اکابر کے اسمائے گرامی آپ نے تحریر فرمائے ہیں انہیں تو حقیقی معنوں میں ارباب علم وفضل کہا جا سکتا ہے مجھ جیسے نالائقوں کی ان سے کیا نسبت؟ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

عرصہ سے بہت کم لکھ رہا ہوں، مطالعہ بھی بہت کم رہ گیا ہے کیونکہ آنکھوں میں موتیا اتر رہا ہے۔ بینائی کی کمزوری، بڑھاپے کی آمد آمد اور مصائب و آلام نے اس قابل

نہیں چھوڑا کہ آپ کے سوالات کا مفصل جواب لکھ سکوں۔ امتثال امر کے طور پر چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان کی یہ حیثیت نہیں کہ یہ الحق جیسے وقیع ماہنامہ یا کسی کتاب میں جگہ پا سکیں۔

(۱) میں نے اپنی علمی زندگی میں بے شمار اربابِ علم و فضل کی تصنیفات سے استفادہ کیا ع

تمتّع زہر گوشۂ یافتم

قرآن، حدیث اور تاریخ (از ابن سعد، طبری، ابن خلدون، ابن اثیر وغیرہم) کے بعد ماضی قریب اور دورِ حاضر کے جن اربابِ علم کی کتابوں کا مطالعہ کیا اُن میں سے کچھ اسمائے گرامی یہ ہیں:۔۔۔۔ حالیؒ، شبلیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، ڈپٹی نذیر احمدؒ، عبدالحلیم شررؒ، قاضی سراج الدین احمد مرحوم، سید سلیمان ندویؒ، محمد حسین آزادؒ، علامہ اقبالؒ، مولانا محمد ابراہیم میرؒ سیالکوٹی، مولانا عبدالسلام ندویؒ، ریاست علی ندویؒ، حاجی معین الدین احمد ندویؒ، شاہ معین الدین احمد ندوی، سعید انصاری، مولانا ظفر علی خانؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا عبدالحیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا قاضی سلمان منصور پوریؒ، مولوی عبدالحق مرحوم، سید قطب شہید مصریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانیؒ (نواب صدر یار جنگؒ) عنایت اللہ خان مشرقی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا صباح الدین صاحب، ملک نصر اللہ خان عزیزؒ، مولانا ماہر القادریؒ، مولانا عامر عثمانیؒ، آغا شورش کاشمیریؒ، الیاس برنی وغیرہم۔

ان مشاہیر کے علاوہ بہت سے غیر معروف مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جن میں غیر مسلم اہلِ قلم اور مستشرقین بھی شامل ہیں۔ فارسی میں رومیؒ، سعدیؒ، جامیؒ اور اقبالؒ کی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔۔۔۔ اسلام سے والہانہ محبت تو خاندان کے دینی

ماحول نے پیدا کی۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے علم وادب کا ذوق پیدا ہوا اور تحقیق و تفحص کا جذبہ بیدار ہوا۔

(۲) ان مصنفین اور ان کی کتابوں کی خصوصیات بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ ان کتابوں میں علم وادب کی چاشنی بھی ہے اور دین حق کے بارے میں گراں قدر معلومات بھی، تاہم ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

(۳) معارف اعظم گڑھ، برہان دہلی، الفرقان لکھنؤ، منادی دلی، عصمت دلی (پھر کراچی) مولوی دلی، پیشوا دلی، نظام المشائخ دلی (پھر کراچی) ساقی دلی (پھر کراچی) ترجمان القرآن لاہور، نیرنگ خیال لاہور، ہمایوں لاہور، عالمگیر لاہور، ادب لطیف لاہور، خدام الدین لاہور، چٹان لاہور، رحیق لاہور، فاران کراچی، المعارف لاہور، صحیفہ لاہور، جامعہ دلی، البلاغ کراچی، بینات کراچی، اردو کراچی، اردو نامہ کراچی، نقوش لاہور، اوراق لاہور، فنون لاہور، مدینہ بجنور، الحق اکوڑہ خٹک، الخیر ملتان، الاعتصام لاہور، اردو ڈائجسٹ لاہور، سیارہ ڈائجسٹ لاہور، زندگی لاہور، ایشیا لاہور وغیرہ

موجودہ صحافت میں کوئی روزنامہ میرے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ ہفت روزہ پرچوں میں الاعتصام لاہور، ایشیا لاہور اور تکبیر کراچی اچھے پرچے ہیں۔ ماہانہ پرچوں میں معارف اعظم گڑھ، برہان دہلی، الفرقان لکھنؤ، الحق اکوڑہ خٹک، ترجمان القرآن لاہور، البلاغ کراچی، بینات کراچی، تدبر لاہور اور الخیر ملتان بھی ان میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔

(۴) میں نے غیر معروف درسگاہوں میں، جو مسجدوں میں قائم تھیں، دینی تعلیم حاصل کی۔ میرے اساتذہ علماء کے گلیم پوش بوریا نشین گروہ سے تعلق رکھتے تھے، بالکل غیر معروف لیکن علم و فضل اور سیرت و کردار کے اعتبار سے کوہ ہمالیہ سے بھی بلند وہ شاگردوں کو اپنے بچوں سے بھی بڑھ کر سمجھتے تھے، درس و تدریس کا کوئی معاوضہ لینا

ان کے نزدیک حرام تھا ــــــ مسجد، درسگاہ اور اس کی چٹائیاں، اساتذہ اور شاگردوں کی نشستیں ــــ لیکن اب وہ دور ہی بدل گیا۔

(۵) اس ناچیز کی رائے میں دورِ حاضر کے اہلِ علم میں سے (بعض بنیادی عقائد اور آراء میں اختلاف کے باوصف) سید قطب شہید مصریؒ، علامہ طنطاویؒ، سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا محمد حنیف ندویؒ، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا محمد تقی عثمانی، ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا حامد الانصاریؒ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ ڈاکٹر نور محمد غفاری اور ڈاکٹر اسرار احمد کی کتابیں بہت مفید ہیں۔

(۶) پیرا ۴ میں جن اہلِ علم کا ذکر کیا گیا ہے ان میں الیاس برنیؒ مولانا ثناء اللہ امرتسری، علامہ اقبالؒ، اکبر الہ آبادی مرحوم، علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم، شورش کاشمیریؒ، مولانا ظفر علی خانؒ اور پیر محمد کرم شاہ الازہری کا اضافہ کر لیجئے ــــــ مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ مرحوم کا قلم اباحیت، تجدّد، مغربیت، ماڈرنزم وغیرہ کے بارے میں شمشیرِ قاطع کی حیثیت رکھتا تھا لیکن افسوس کہ مولانا تھانوی کے مرید ہونے کے باوجود قادیانیت کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔

(۷) مذکورہ بالا اصحاب کی تحریریں ان مسائل کے بارے میں بہت کارآمد ہیں۔

(۸) مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب میں اگر جدید علوم (سائنسی اور فنی) نیز عربی کے علاوہ دوسری زبانوں (فارسی، انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمن وغیرہ) کی تعلیم بھی شامل کر دی جائے تو بہت مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ طلبہ کو جدید عربی سے روشناس کرانا بھی ضروری ہے۔

سب سے اہم چیز سیرت و کردار کی تعمیر ہے۔ ان مدارس کا مقصد محض 'مولوی' تیار کرنا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ یہ کہ طلبہ اسلام کے جانباز سپاہی اور نہایت حق گو اور مخلص عالمانِ باعمل بنیں۔

جناب ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی صاحب

ڈائریکٹر ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد

محترمی ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم

یکم نومبر کو آپ کا دوسرا نوازش نامہ ملا جس میں سوالنامے کے جواب کا تقاضا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے بعض سوالوں کا جواب نہایت مشکل ہے۔ اشغال اور موانع کی کثرت اجازت نہیں دیتی کہ گذری ہوئی زندگی کا تحقق کے ساتھ جائزہ لیا جا سکے۔ پھر مطالعہ کی حدود بھی متعین نہیں ہیں۔ بہر کیف بر وقت بار خاطر سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ نمبروار جواب لکھتا ہوں، سوالوں کے اعادہ کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

(۱) ابتدائی کتابوں سے لے کر صحاح ستہ اور تفسیر بیضاوی تک ساری کتابیں اپنے والد محترم مولانا مفتی محمد امیر حسن بہاریؒ سے پڑھیں۔ ۱۹۲۱ء سے آپ صدر مدرس حمادیہ ڈھاکہ رہے، پھر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء تک ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و اسلامیات

میں بنگال کے مشہور محدث مولانا اسحٰق بردوانی کے بعد حدیث، تفسیر اور فقہ کے لیکچرار کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ قبل ازیں اپنی تعلیم کے اختتام کے بعد مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں دارالافتاء میں سات سال تک مفتی رہ چکے تھے۔ نحو وصرف اور فقہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ مولانا محمد سجاد سیکرٹری جمعیۃ علماء ہند اور آپ دونوں تا اختتام تعلیم ساتھ ساتھ رہے۔ ڈھاکہ کے قیام میں ادب، عربی اور کتابت کی مشق کے لیے کچھ عرصہ تک میں مولانا احمد حسین اعظمیؒ مبارک پوری کے زیرِ تربیت رہا، اُن کی تعلیم سے ادبی ذوق میں نمایاں ترقی ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں چند ماہ دیوبند میں مقیم رہا، اس عرصے میں دارالعلوم کی لائبریری اور مولانا اعزاز علیؒ کے ہدایہ اور دیوانِ متنبی کے اسباق میں بالالتزام حاضر رہا۔

(۲) اُردو زبان میں مولانا ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عبدالحلیم شرر کے اخلاقی اور تاریخی ناولوں سے بیحد متاثر ہوا۔ علامہ شبلیؒ کی سیرت النبیؐ، الفاروق، الکلام، النعمان، الغزالی، المامون، سے (عربی میں رفاعی کی عصر المامون، تین ضخیم جلدوں سے) نیز شعرالعجم و موازنہ انیس و دبیر سے اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کی کتابوں اور مقالات سے بھی شغف رہا۔ غالب کے خطوط اور حالی کی مسدس اور دوسری نظموں کا گہرا اثر رہا۔

عربی کتابوں کے متعلق کچھ کہنا اس کم وقت میں دشوار ہے۔

(۳) روزنامہ زمیندار اور مولانا ظفر علی خان کی نظمیں، اودھ پنچ کے مقالات نیز ساقی درویش دہلی اور دلگداز لکھنؤ، کلکتہ کے البلاغ و الہلال کے شمارے ہر دلعزیز رہے۔ معارف اعظم گڑھ اور نقاد آگرہ، نیز مولانا منظور نعمانی کے الفرقان سے خاص شغف رہا۔

آجکل اُردو میں فکر ونظر، بینات، البلاغ، الحق، المعارف، ترجمان القرآن،

میثاق وغیرہ علمی، ادبی، دینی ماہوار رسالے ہیں جو معیاری کہے جانے کے مستحق ہیں۔ البتہ پاکستان بننے کے بعد اردو زبان ایک انقلابی دور سے گذر رہی ہے اور دوسری زبانوں کے اثرات اس پر زیادہ غلبہ پا رہے ہیں کہ لکھنے والے اپنی اپنی زبانوں کی خصوصیات کے تحفظ کی خاطر کبھی دانستہ طور پر اور کبھی نادانستگی سے اردو زبان کو قربان کر دیتے ہیں۔

(۴) بچپن میں اپنی والدہ ماجدہ مرحومہ سے نیز محلّے کے ایک بزرگ صوفی منش مولوی محمد امیر مرحوم سے (اللہ تعالیٰ دونوں کو غریقِ رحمت کرے) حروفِ ابجد سے لے کر قرآنِ پاک کے چند پارے تک کی تعلیم حاصل کر کے فارسی آمدنامہ بھی پڑھنا شروع کیا تھا کہ والد بزرگوار مولانا محمد امیر حسنؒ نے اپنے ساتھ رکھنا مناسب سمجھا۔ ڈھاکہ کے ابتدائی دور میں علاوہ فارسی اور قرآنِ پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے مدرسہ کے ساتھ ملحق مکتب میں بنگلہ زبان، بنگلہ درسیات، ساتھ ہی کچھ انگریزی کی تعلیم پائی۔ بعد میں عربی کی درسیات باقاعدہ پڑھتا رہا۔ فاضل کے امتحان کے بعد دیوبند میں چھ ماہ رہا۔ بعد ازاں جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ پھر انگریزی کی تعلیم اور تاریخ، ادب، عربی و انگریزی مقالہ نویسی میں ڈاکٹر سراج الحق، ڈاکٹر سید معظم حسین اور سید عبد السبحان سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں دیگر اساتذہ کے علاوہ زیادہ مستفید ہوا۔ اوّل الذکر دونوں حضرات صدر شعبۂ عربی واسلامیات رہ چکے ہیں اور ثانی الذکر عرصہ تک ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ فی الحال دونوں حضرات حکومت پاکستان کی اسلامی مشاورتی کونسل کے ممبر ہیں۔

آکسفورڈ کے قیام کے زمانہ میں پروفیسر ایچ۔ آر۔ گب اور ڈاکٹر رچرڈ والسر کے طریقۂ تحقیق اور علمی بحث وتمحیص سے بیحد متاثر ہوا۔

(۵) ڈاکٹر مصطفٰے زرقا، شیخ شلتوت، شیخ ابو زہرہ، مصطفٰی عبد الرزاق، محمد الغزالی مرحوم

سید قطب وغیرہ کی مؤلفات جدید مسائل کو علمی طریقے پر حل کرنے میں نہایت مفید ہیں۔

پاکستان میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حکیم الامۃ مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نیز مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا محمد امین اصلاحی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی وغیرہ دیگر علماء کی تالیفات بھی کار آمد و مفید ہیں۔

(۶) قرآنِ حکیم اور احادیثِ صحیحہ کو سیرتِ نبویؐ اور اجلہ صحابہؓ کے حالاتِ زندگی کی روشنی میں سمجھنا بہت سے فتنوں سے بچائے گا، پھر مستند علماء کی کتابیں بھی کار آمد ہیں بشرطیکہ اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دے۔

(۷) سرسری طور پر کتابوں کا نام لینا دشوار ہے، تفصیل کے لیے وقت نہیں۔

(۸) مدارسِ عربیہ میں طرزِ تعلیم کے بدلنے کی ضرورت ہے۔ نظامِ تعلیم کے متعلق اجمالاً عرض ہے کہ احقر کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ یہ نظام دین و دُنیا دونوں کے لیے مفید ہو اور موجودہ سارے رائج نظام دونوں کے لیے ناکافی ہیں۔ البتہ یہ کہنے میں باک نہیں کہ مدارسِ عربیہ کے نصاب پر نظرِ ثانی کی ضرورت اس لحاظ سے ہے کہ اس کو آجکل کے تقاضوں کو پورا کرنے میں زیادہ سے زیادہ ممد و معاون بنایا جائے۔ تحریر و تقریر پر زور دینے کے علاوہ انفرادی توجہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ایسے مضامین کا انتخاب بھی لازم ہے جن کی ضرورت ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہر کام پر ہوتی ہے۔

یہ کام تو حکومت کا تھا کہ ایک نظامِ تعلیم ملک میں رائج کر کے مختلف دفاتر اور شعبوں کی ملازمتوں نیز تجارتی و کاروباری اداروں کو صرف ایک نظامِ تعلیم کے محصلین کے لیے مخصوص نہ کرتی اور سرکاری ملازمتوں کے مقابلہ کے امتحانوں میں عربی مدارس کے طلباء کو بھی شریک ہونے کی اجازت دیتی۔ دینی علوم کی ضرورت کے ساتھ سائنس اور دنیوی علوم کو بھی اسلامی علوم میں داخل سمجھنا بیحد ضروری ہے۔ علمی زندگی

میں اسلام نظامِ تعلیم کی تنویت کو کبھی برداشت نہیں کرتا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عبرانی سیکھنے کا حکم دیا تو آج علوم جدیدہ اور یورپین زبانوں کے سیکھنے کو ہم برا نہیں سمجھ سکتے بلکہ بین الاقوامی تقاضوں کے ماتحت انکے واجب علی الکفایہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آخر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ علومِ دینیہ کی تحصیل کسی خاص فکر و خیال کے ساتھ چپکنے کی تلقین نہیں کرتی، اسلام تو رواداری کی تعلیم دیتا ہے اور عصبیۃ الجاہلیۃ کو سختی سے رَدّ کرتا ہے۔ پھر بجائے اللہ اور رسولؐ کے فرمان پر عمل کرنے کے تعجب ہے کہ طلباء اپنے اپنے خاص اساتذہ کی شدید متابعت کو اپنا دین و ایمان سمجھیں اور اپنی آراء کے آگے دوسروں کی آراء کو ہیچ سمجھیں، ظاہر ہے کہ ایسا تقشف اور ایسی تنگ خیالی صحیح علمی بصیرت نہیں سمجھی جا سکتی، اور دوسروں کی اُن آراء کا احترام نہ کرنا جو دین سے مختلف نہ ہوں کسی طرح اسلام کی تعلیم کے موافق نہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب

پیرس یونیورسٹی فرانس

آپ نے کچھ سوال فرمائے ہیں، مجھے اس قسم کے سوالوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ع

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

یا، وللناس فیما یعشقون مذاھب

کتابوں کے سلسلے میں میرا اصول خذ ما صفا دع ما کدر کلیہ ہے۔ قرآن وحدیث کے باہر کوئی کتاب سو فیصد صحیح ہو نہیں سکتی۔ میں نے دوستوں اور دشمنوں دونوں کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

میں اردو میں معارف اعظم گڈھ کو پسند کرتا ہوں، اوروں میں کم ہی کوئی کام کی چیز ملتی ہے۔

حیدر آباد، جرمنی اور فرانس کی درسگاہوں میں اساتذہ سے تو کم، اپنی ذاتی تلاش اور مطالعے سے ہی وہ سیکھا جو اب جانتا ہوں (اور جو بہت ہی حقیر علم ہے) تاثر یہی ہے کہ آدمی اپنی ذاتی محنت اور کاوش سے کچھ سیکھتا ہے' اور بس! ایک ہی استاد کے ایک ہی لیکچر سے دو طلبہ دو سو مختلف سبق سیکھتے ہیں۔

مجھے عصر حاضر کے مسائل سے دلچسپی نہیں، میرا موضوع اس سے مختلف ہے اس سے آپ کے سوال ز، ح، ط پر اپنی لاعلمی کا اعتراف کرتا ہوں۔

چونکہ "مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب" سے میں واقف نہیں ہوں اس لیے کسی رائے زنی کا امکان بھی نہیں ـــــ آدمی قرآن وحدیث جیسی بنیادی چیزوں کے پڑھنے بلکہ سمجھنے سے بھی آدمی نہیں بنتا بلکہ ان پر عمل کرنے سے۔ بقول سعدیؒ کے "بداخلاق آدمیوں سے آدمی خوش اخلاق بنتا ہے، اگر ان کو نمونہ بنائے کہ خود ویسا نہ کرے۔

(محمد حمید اللہ۔ پیرس)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب

مخدوم و مکرم، السلام علیکم۔ مزاج شریف! تلطف نامہ موصول ہوا، آپ کے جذباتِ مخلصانہ کا شکر گذار ہوں۔ میں نہایت ہی بے مایہ اور کم دستگاہ آدمی ہوں۔ مسجد سے زندگی شروع کی، حالات و واقعات مدرسہ میں لے گئے، اور میں متعلقہ علم میں خاصی دور تک گیا مگر ذہنًا مسجد ہی کا رہا۔ بس بندۂ ناچیز پُرتقصیر، کوچہ گردِ شہر رسوائی ہوں۔ فقط آجکل ایک آزمائش کی وجہ سے دلجمعی میسر نہ تھی اور شاید میں فی الحال معذرت کر دیتا مگر آپ کے والد بزرگوار قبلہ مولانا عبدالحق مدظلہ، کا اسم گرامی خط میں موجود پا کر میں نے انکار کو سوءِ ادب خیال کرتا ہوں، مختصر جواب نامے کا ارادہ کر لیا ہے۔ آپ قبلہ سے عرض کریں کہ میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھے یکسوئی اور اطمینان نصیب ہو اور مقدس عقیدوں کی مزید خدمت کی توفیق عطا ہو۔ اب جوابات پیش ہیں:۔

(بحوالہ سوالنامہ ۱۵)

(۱) ظاہر ہے کہ یہاں کتابوں سے مراد کتاب اللہ کے سوا دوسری کتابیں، ایسی کتابیں تین طرح کی ہیں۔ (۱) کتبِ دین و تصوف (۲) حکمت و فکریات، (۳) ادب و شعر۔

(الف) کتبِ دین میں اوّل اوّل اپنے والدِ محترم (کہ وہ بھی عالم دین تھے) کے زیرِ اثر امام غزالیؒ کی کیمیائے سعادت سے متاثر ہوا۔ میری عربی کی استعداد کم تھی اس لیے مَیں اُن کی عربی کتابوں سے زیادہ مستفید نہ ہو سکا۔ مگر فارسی کی اس مختصر کتاب نے مجھے اخلاقیاتِ زندگی سے رُوشناس کیا۔۔۔ اس کے بعد شوق نیموی کی "آثار السنن" سے روشناس ہوا۔۔۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب میں بی۔ اے کا طالب علم تھا اور مجھے معارف و اسرارِ دین کا چسکا نہیں پڑا تھا۔ اسی زمانے میں مَیں نے "مواعظِ اشرفیہ" کا مطالعہ کیا، اندازِ بیان نہایت دلکش تھا۔ اشعار و لطائف کی آمیزش نے بڑا مزا دیا۔ اسی زمانے میں ایک اردو کتاب "الدین القیّم" نظر سے گذری۔ اس کے بعد دینی کتابوں کے مطالعہ کا شوق بڑھتا گیا۔ اسی اثناء میں ایک طرف مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں اور شبلی کی تاریخیں نظر سے گذریں، اور دوسری طرف مَیں حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں شامل ہو گیا، مَیں نے "بلوغ المرام" اور "مشکوٰۃ شریف" مسجد چینیاں لاہور میں پہلے پڑھ رکھی تھی، اب مسجد شیرانوالہ میں "صحیح مسلم" اور "حجۃ اللہ البالغہ" کی تحصیل کے علاوہ حضرت مولانا کے "خاص" درسِ قرآن میں شرکت کی۔ اس ماحول نے گہرا نقش چھوڑا۔ چنانچہ اب تک فکریاتِ جدید کے وسیع الاطراف مطالعہ کے باوجود میرا ذہن دینی ہی ہے۔

جب ذہن پختہ ہو گیا تو "صحیح بخاری" کے علاوہ "فتح العزیز" (تفسیر شاہ عبدالعزیزؒ) اور "جلالین" اور بعد میں "بیضاوی" کا مطالعہ کیا۔ جامعہ ملیہ علی گڑھ میں زیرِ تعلیم ہونے

کے زمانے میں ان سے تفسیر سورۂ یوسف بھی پڑھی۔ بعد میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی "بیان القرآن" کو دیکھا۔ امام ابوالحسن الاشعریؒ کی "مقالات الاسلامیین" کا بہت بعد میں مطالعہ کیا اور "احیاء العلوم" بھی نظر سے گذری۔

تصوف کی کتابوں میں "کشف المحجوب"۔ کلاباذی کی "کتاب التعرف لمذہب اہل التصوف" ابونصر سراج کی "کتاب اللمع" کو بھی دیکھا۔ محی الدین ابن عربیؒ کی "فصوص الحکم" اور "فتوحات" سے بھی دلچسپی رہی، لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بعد میں امام ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ کی تصانیف بھی جستہ جستہ نظر سے گذریں۔

سو یہی مختصر سی کہانی ہے دینی و عربی کتابوں سے تحصیل و اکتساب کی۔ اگرچہ گاہ گاہ اور جستہ جستہ عربی کی دیگر کتب بھی دیکھتا رہا اور اب بھی دیکھتا ہوں۔ مگر اب میری توجہ تصورات اسلام کی تعبیر و تشریح کی طرف زیادہ ہے۔ اور میری رائے ہے کہ نئے دور کو نئے علم کلام کی ضرورت ہے، کیونکہ دین پر اعتراضات کی نوعیت بدل گئی ہے۔ اب حملے عقلی نہیں سائنسی فکر کی طرف سے ہیں۔ لہٰذا آج کا مسئلہ دین کو نئے اجتماعی افکار کی زد سے بچانا ہے۔

(ب) حکمت و فکریات میں میری دلچسپی فلسفے کے طالب علم کی حیثیت سے ہے میں نے افلاطون، ارسطو، پھر طامس، کوئناس اور آگے کانٹ روسو، والٹیر، شوپن ہاؤر، سپنوزا، نٹشے، برگسان، ولیم جیمز، ڈیوی اور برٹرینڈ رسل کا خاص مطالعہ کیا ہے۔ اور آج کے "وجودیت" کے داعی حکماء کو بھی دیکھا ہے، اس سلسلے میں اور بھی بہت کچھ دیکھا ہے۔ ان سب کے زہر کا تریاق علامہ اقبالؒ کی کتابوں میں ملتا ہے، اور مولانا ابوالکلام آزاد کی "ترجمان القرآن" اور مولانا مودودیؒ کی "تفہیم القرآن" سے ازالۂ اوہام ہوتا ہے۔

(ج) ادب و شعر میں حافظ و رومی کے علاوہ نظیری و غالب اور بعد میں اقبالؒ

اردو میں میر تقی میر اور جدید دور میں غزل کے شعراء حسرت موہانی اور فانی سے بہت متاثر ہوں۔ اکبر الہ آبادی اور امیر مینائی کا ذائقہ بھی میسر ہے۔ اور یوں محسوس کرتا ہوں کہ زندگی میں یادِ خدا کے بعد شعر سے بڑا روحانی سکون ملتا رہا۔

(۲) مجھ پر خاص کتابوں سے زیادہ عام مطالعے کا اثر ہوا، اس لیے مخصوص نقوش کا ذکر مشکل ہے۔ اب میں ادب کا اور دین کا بیک وقت طالب علم ہوں، اور اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتا رہتا ہوں اور بالآخر ایک مجموعی تاثر قائم ہو جاتا ہے۔

(۳) الہلال اور معارف (اعظم گڑھ) کا مسلسل مطالعہ رہا اور ادبی رسائل میں ہمایوں (لاہور) اردو (دہلی و کراچی) نیا دور اور ماہِ نو (کراچی) وغیرہ وغیرہ اکثر اردو رسالے زیرِ نظر رہتے ہیں۔ اب نئے دینی رسالوں میں البلاغ (کراچی) الحق (اکوڑہ خٹک) اور ترجمان الحدیث (لاہور) نظر سے گذرتے ہیں، اور گاہ گاہ ترجمان القرآن (لاہور) بھی۔

(۴) میں نے تعلیمی زندگی میں دینی علوم حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا غلام مرشد لاہوریؒ اور مولانا عبدالحی فاروقی وغیرہ سے ــــــ اور دنیوی علوم میں ابتدائی زمانے کے متعدد اساتذہ کے علاوہ پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع (لاہوری) پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (لاہور) اور پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی سے اکتساب کیا۔ میرے ایک پرائیویٹ استاد خواجہ محمد سلیم (جو کہ میرے عظیم محسن بھی تھے) میرے انگریزی کے استاد تھے ــــــ اور یوں زندگی بھر ہر کسی سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔ عالم ایک مکتب ہے اس میں شجر حجر تک سے کسبِ دانش ممکن ہے۔

(۵) یہ سوال تفصیل طلب ہے، اس پر پھر کسی موقع پر اظہارِ خیال ہو سکے گا۔

(۶) ــــــــــــــــ ایضاً ــــــــــــــــ

(۷) اس وقت عالمِ اسلام کو جو مسائل درپیش ہیں وہ تین قسم کے ہیں۔ (الف) سیاسی (ب) فکری (ج) داخلی انحطاط ــــ ان میں سے ہر ایک کے لیے

الگ الگ کتابیں درکار ہیں جن کی تفصیل اس شذرے میں ممکن نہیں۔

مجملاً عرض ہے کہ سیاسی مسائل سے قطع نظر کہ اس وقت میرے مدِّنظر نہیں، جدید نظریات کا مقابلہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ جدید معاشرتی علوم کا مطالعہ کیا جائے بلکہ انہیں تمام دینی مدارس کے نصاب میں شریک کیا جائے۔ معاشرتی علوم سے مراد علمِ سیاسیات، علمِ معاشیات، علمِ اجتماعیات اور تاریخ و شہریت ہے۔ اس کے ساتھ ہی علومِ عکمیہ میں سے شماریات، تاریخ ارتقائے سائنس اور تاریخ فلسفۂ جدید اور علمِ نفسیات اور تاریخِ ادبِ مغرب بھی مفید ہے۔ ان سب علوم پر انگریزی میں تو بہت کچھ ہے مگر اُردو میں بھی ہر قسم کی کتابیں مل جاتی ہیں۔

میرے خیال میں دینی مدارس میں انگریزی کے متوسط علم کے علاوہ مذکورۂ بالا علوم کی آمیزش سے ان مدارس کی افادیت میں بیحد اضافہ ہوگا، اور وہ نئے زمانے کے فتنوں کی صحیح نوعیت سمجھ کر ان کا علاج کرسکیں گے مرض کی تشخیص کے بغیر علاج ناممکن ہے۔ ہمارے علماء کے پیشِ نظر قدیم زمانے کے ملحدانہ خیالات ہیں مگر وہ جدید الحاد کے سامنے کچھ بھی نہیں، علماء آج کے بگاڑ کا تصوّر بھی نہیں کرسکتے۔ زمانہ تقابلِ ادیان سے زیادہ تقابلِ افکار کا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ داخلی انحطاط کا علاج اور بھی ضروری ہے اور میں غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کا ایک بڑا سبب تربیتِ نفوس کا فقدان ہے۔ ہمارے پرانے معاشرہ میں تصوّف و طریقت کا ایک نظام تھا جو نفس کی بیماریوں کے علاج پر توجہ صرف کرتا تھا، نفس کی اصلاح و تزکیہ پر زور دیتا تھا۔ مگر اب خود دینی حلقوں میں اس کی اہمیّت نہیں سمجھی جاتی۔ جو طبقے دینداری پر زور دیتے ہیں وہ تو اس تربیت کے اب قائل ہی نہیں معلوم ہوتے اور جو طریقت پر

قائم ہیں وہ صرف تکیئے اور زاویئے کی رونق ہی کو مقصودِ نظر جانتے ہیں، اصلاحِ نفوس کا کام انہوں نے بھی چھوڑ دیا ہے۔

انسانی زندگی میں جذبات تمام افعال و اعمال پر بڑا اثر ڈالتے ہیں، ان کی تعدیل کے لیے مناسب قسم کے ذوقی وسائل کی ضرورت ہے کچھ ادبی ذوق، کچھ جمالیاتی مشغلہ، کچھ علمِ جذبات، کچھ تطہیرِ جذبات کی صورتیں ــــ آپ جانتے ہیں کہ ہر چند پولیس جرائم کا سدِّ باب کرتی ہے مگر ان کی تعزیر سے جرائم رک نہیں جاتے، جرائم دور کتے ہیں تعدیلِ جذبات سے، تطہیرِ نفوس سے، شرافتوں کے عمل سے، دردمندی سے، ہمدردی سے، شفقت سے، محبت سے ــــ اب اگر اس داخلی انحطاط کو روکنا ہے تو اس کے لیے دین پر مبنی اخلاقیات کے علمِ رسمی کے ساتھ ساتھ تطہیرِ نفوس اور تعدیلِ جذبات کا سامان بھی مہیا کرنا چاہیئے، شفقتوں کا ایک نظام قائم کرنا لازمی ہے تاکہ قلوب میں نیکی اور اچھی زندگی کیلئے کشش پیدا ہو ــــ ذکر و فکر اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر ظاہری طور سے شفقتوں کا عمل اور محبتِ لوام کا نظام، توازن اور تعدیل پیدا کرے گا۔ دینی ارکان کا عمل بالجوارح ہو اور خارجی زندگی میں طہارتِ نفس اور محبت و شفقت اور حُسنِ معاملہ اور عدل و احسان نظر نہ آئے تو لوگوں پر دین کا اثر نہیں ہوتا خصوصاً آج کے دور میں لوگ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

(۸) اس سوال کا جواب سوال ۷ میں آگیا ہے۔

(۹) یہ سوال بھی تفصیل طلب ہے، انشاءاللہ پھر کسی موقعہ پر کچھ عرض کرسکوں گا۔

ممکن ہے بعض جگہ ربط قائم نہ ہو سکا ہو، سو اس کا خیال نہ کیجئے ؎

گر بہم بر زدہ بینی خط من عیب مکن

کہ مرا محنتِ ایام بہم بر زدہ است



القاسم اکیڈمی کی ایک اور عظیم تاریخی پیشکش

جمالِ انورؒ

تذکرہ وسوانح علامہ انور شاہ کشمیریؒ

مولانا عبدالقیوم حقانی

سلسلۂ نسب' ولادت' والدین' تحصیل علم' تعلیم وتربیت' تذکرۃ الاساتذہ' دارالعلوم دیوبند میں ... فیض اور تدریس کا آغاز' کارعلمی تبحر' بے مثال حافظہ' ذوق مطالعہ اور حیرت انگیز ... علوم نبوت پر شفقت' تشجیع وتربیت' تسامح وعنایت' بے تکلفی وظرافت' ... تدریسی خصوصیات' تجدیدی کارنامے' محققانہ مباحث' مجتہدانہ افاضات' درسی معارف وافادات' تصنیف وتالیف اور تحقیق کے نادر نمونے وشہ پارے' ذوقِ شعروادب' افادات' ملفوظات' رخ انور کی تابانیاں' حسن صورت وسیرت کا مرقع' دلبرانہ ادائیں ومعصومیت' اتباع سنت کا اہتمام' خودداری' استغناء اور مخلوق خدا پر شفقت' سلوک وتصوف اور صفائے باطن کا اہتمام' احترام واطاعت اساتذہ' ... عشق ... انابت' معاصی سے اجتناب اور نفرت' عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ... حضرت امام کشمیری کا سفر آخرت' دو تاریخی دستاویزات ... مقدمہ بہاولپور کی تفصیل ... علماء دیوبند کے عقائد' مسلک ... پر مفصل خطاب۔

صفحات : 298 .... قیمت 120 روپے

300 روپے بھیجنے پر "جمال انور" کے ساتھ ... سال کے لئے جاری کردیا جائے گا۔

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ برانچ پوسٹ آفس ...
فون نمبر 0923-630237 بیت فیکس 0923-630094

امامِ اعظم ابوحنیفہؒ

کے حیرت انگیز واقعات

از ! مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب

اردو کی سب سے پہلی اور کامیاب کاوش ،فکر ونظر ،علم وعمل ،تاریخ وتذکرہ ، اخلاص وللّٰہیت ،طہارت وتقویٰ ، سیاست واجتماعیت ،تبلیغ واشاعت دین ،تعلیم وتدریس ،غرض ہمہ جہت جامع ،نفع بخش ،کمپیوٹرائزڈ ٹائٹل ، مضبوط جلد بندی اور شاندار طباعت ۔

صفحات : 272 .... قیمت : =/120 روپے

القاسم اکیڈمی ،جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ سرحد پاکستان

اربابِ علم و کمال

اور

پیشۂ رزقِ حلال

مشاہیر زُعماء اور اکابر عُلماءِ اُمت کی نظر میں

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق رح
اس کتاب سے علم اور اہل علم کی عزت بڑھے گی، نسلی امتیازات اور قومی عصبیتوں کا خاتمہ ہو گا۔

شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد فرید مدظلہ
ہماری معلومات کی حد تک اس موضوع پر مستقل تصنیف، جدید طرزِ تحریر اور دلچسپ اندازِ تعارف میں مولانا عبدالقیوم حقانی کو سبقت اور اولیت کا شرف حاصل ہے۔

مولانا سمیع الحق "مدیر الحق"
اس کی اہم خوبی زبان کی دلکشی، انداز و اسلوب کی رعنائی، طرزِ تحریر کی سلاست، روانگی اور شگفتگی ہے۔

مولانا افتخار فریدی (بھارت)
علامہ سمعانی رح سے ملاقات کا تریاق ملت کے احیاء و بقاء کا سبب بن سکتا ہے۔

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی مدظلہ
کسبِ حلال، صدقِ مقال، حُسنِ اعمال اور خیر المال کا حسین امتزاج اور گرانقدر علمی تحفہ۔

حکیم محمد سعید چیئرمین ہمدرد فاؤنڈیشن
کتاب اتنی دلچسپ، مطالعہ مکمل کیے بغیر دوسرا کام نہ کر سکا۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی
مولانا عبدالقیوم حقانی نوجوان علماء میں بحمداللہ موفق من اللہ ہیں! اندازِ تحریر سلیس، دلکش اور سلجھا ہوا ہے! اس کتاب میں جدید طرز اور اچھوتے انداز میں اپنے موضوع کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد حسن جان
"الانساب" کے نادر موضوعات کا خلاصہ اور نچوڑ۔

شیخ الحدیث مولانا [illegible] مدظلہ	پاکستان میں دو شخصیتوں کیلئے خصوصیت سے دعا کیا کرتا ہوں جن میں ایک سرحد کے "ارباب علم و کمال" کے مصنف مولانا عبدالقیوم حقانی ہیں۔
مولانا قاضی عبدالکریم کلاچوی	یہ کتاب بلاشبہ بہترین معلومات کا ذخیرہ اور عجائب و غرائب کا مجموعہ ہے جبکہ اس پر حقانی صاحب کی تحریر سونے پر سہاگہ۔
مولانا حافظ انوار الحق صاحب	ایک بہترین انمول اور شاہکار تصنیف۔
مولانا مدار اللہ مدرار	اس کتاب کے مطالعے سے اہل علم کی قدر و منزلت میں اضافہ اور خرافات و اوہام کا ازالہ ہوگا۔
مولانا مفتی غلام الرحمن صاحب	"ارباب علم و کمال" کا وجود مصنف کے ساتھ خدا تعالیٰ کے فضل و احسان اور اس کی اجتبائی شان کا مظہر ہے۔
مولانا محمد ازہر مدیر الخیر ملتان	فن اور موضوع کے اعتبار سے تاریخ کی سب سے پہلی منفرد اور شاہکار تصنیف۔
مولانا قاضی عبدالحلیم کلاچوی	"ارباب علم و کمال" نے اپنے مبتکر اسلوب نگارش کی وجہ سے ادبی حلقوں میں ایک تاریخی مقام پایا ہے۔
معروف سکالر ڈاکٹر شیر بہادر پنی مرحوم	"ارباب علم و کمال" صد درجہ فکر انگیز اور سبق آموز ہے۔
مولانا نعیم اللہ فاروقی	بستر علالت پر لیٹے ہوئے بھی اس کا مطالعہ کیے بغیر چین نہ رہا۔ اس نے دل میں عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دی۔
مولانا عبدالرشید الہندی مکۃ المکرمہ	"ارباب علم و کمال" دیکھ کر مسرت کی حد نہ رہی مصنف نے اس ناکارہ کی دیرینہ آرزو کی ترجمانی کر دی اور اس دور کے علماء پر بہت بڑا احسان فرمایا۔
جناب نعیم صدیقی مدیر "ترجمان القرآن"	مجھے اس مبحث نے ایسا کھینچا کہ میں نے کئی ابواب پڑھ ڈالے اور ابھی اطمینان سے پھر پڑھنا چاہتا ہوں۔
جناب احمد حسین زید مدیر "ترجمان اسلام"	ایک قیمتی اور لازوال علمی اور تحقیقی تحفہ۔
جناب محمد صلاح الدین مدیر "تکبیر"	علمی، دینی اور تاریخی اہمیت کی حامل تالیف، جس میں سلاست، روانی اور اسلوب کی دلکشی بدرجہ اتم موجود ہے۔
نیشنل بک کونسل پاکستان	توصیفی سند CERTIFICATE OF COMMENDATION

صفحات ۲۳۲ — قیمت مجلد -/۵۴ روپے

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ، برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ سرحد

مولانا عبد القیوم حقانی کی تصنیفات



القاسم اکیڈمی جامعہ ابوھریرہ

خالق آباد ● ضلع نوشہرہ ● سرحد۔پاکستان